چوگانِ ہستی

حصہ اوّل

از

منشی پریم چند

مصنف پریم پچیسی - پریم بتیسی - بازارِ حسن وغیرہ

سنہ ۱۹۲۷ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل ۱۰۰۰

چوگانِ ہستی

(۱)

شہر امیروں کے رہنے اور خرید و فروخت کرنے کی جگہ ہے۔ اور دامن شہر ان کے سیر و تفریح کا مقام۔ وسط شہر میں ان کے لڑکوں کے مدرسے اور ان کے مقدمہ بازیوں کے وہ اکھاڑے ہوتے ہیں جہاں انصاف کے بہانے غریبوں کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ شہر کے آس پاس غریبوں کی بستیاں ہوتی ہیں۔ بنارس میں پانڈے پور اسی قسم کی آبادی ہے۔ وہاں نہ شہر کے لیمپوں کی شعاعیں پہنچتی ہیں۔ نہ شہری چھڑکاؤ کی چھینٹیں اور نہ آبرسانی کے نلوں کی روانیاں۔ لب سڑک چند چھوٹے چھوٹے بنیوں اور حلوائیوں کی دوکانیں ہیں جن کے عقب میں کئی یکہ بان، گاڑی والے، گوالے اور مزدور رہتے ہیں۔ دو چار گھر بگڑے ہوئے سفید پوشوں کے بھی ہیں جن کی خستہ حالی نے انہیں شہر سے خارج کر دیا ہے۔ یہیں ایک غریب اندھا چمار بھی رہتا ہے۔ جسے لوگ سورداس کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اندھے آدمیوں کے لئے نہ

نام کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کام کی۔ سورداس ان کا بنا بنایا نام ہے اور بھیک مانگنا ان کا بنا بنایا کام۔ ان کے اوصاف وعادات بھی مشہور زمانہ ہیں۔ گانے بجانے سے ایک خاص دلچسپی، دل میں ایک خاص محبت۔ روحانیت اور بھگتی سے ایک خاص رغبت۔ ان کے فطرتی اطوار ہیں۔ نگاہ ظاہر بند اور نگاہ باطن کھلی ہوئی ؂

سورداس ایک نہایت نحیف و ناتواں اور سادہ مزاج شخص تھا۔ جسے شاید قدرت نے بھیک مانگنے ہی کے لئے بنایا تھا۔ وہ ہر روز لاٹھی ٹیکتا ہوا پکی سڑک پر آبیٹھتا اور راہ گیروں کے جان کی خیر مناتا۔ "داتا بھگوان تمہارا کلیان کریں!" یہی اُس کی صدا تھی اور اسی کو وہ بار بار دُہراتا تھا۔ شاید وہ اِسے مسافروں کے تالیف قلوب کا منتر سمجھتا تھا۔ پیادہ مسافروں کو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دعائیں دیتا تھا۔ لیکن جب کوئی یکہ گزرتا تو وہ اُس کے پیچھے دوڑنے لگتا اور بگھیوں کے ساتھ تو گویا اُس کے پیروں میں پَر لگ جاتے تھے۔ لیکن موٹروں کو وہ اپنے نیک ارادوں کے پرے سمجھتا تھا۔ تجربہ نے اُس کو بتلادیا تھا کہ ہوا گاڑیاں کسی کی باتیں نہیں سنتیں۔ صبح سے شام تک اُس کا تمام وقت دعائے خیر ہی میں گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ ماگھ پوس کے ابرو باد اور بیساکھ جیٹھ کی سوز و تپش میں بھی ناغہ نہ ہوتا تھا ؂

کاتک کا مہینہ تھا۔ ہوا میں خوشگوار خنکی آگئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورداس اپنی جگہ پر بُت کی طرح بیٹھا ہوا کسی یکے یا بگھی کی صدائے خوش آیند پر کان لگائے ہوئے تھا۔ سڑک پر دو رویہ

درختوں کی قطاریں تھیں۔ اُن کے نیچے گاڑی بانوں نے گاڑیاں ٹھہرا دیں اور بیل کھول دیئے۔ پچھائیں بیل ٹاٹ کے ٹکڑوں پر کھلی اور بھوسہ کھانے لگے۔ گاڑی بانوں نے بھی اُپلے جلادیے۔ کوئی چادر پر آٹا گوندھتا تھا۔ کوئی گول باٹیاں بناکر اپلوں پر سینکتا تھا۔ کسی کو برتنوں کی ضرورت نہ تھی۔ سالن کے لئے گھوئیوں کا بھرتہ کافی تھا۔ اور اس بے سروسامانی پر بھی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ بیٹھے ہوئے باٹیاں سینکتے اور گاتے جاتے تھے۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں ساز کا کام دے رہی تھیں۔ گنیش گاڑی بان نے سُورداس سے پوچھا۔ "کیوں بھگت! بیاہ کروگے؟"

سُورداس نے گردن ہلاکر کہا "کہیں ہے ڈول؟"

گنیش۔ ہاں ہے کیوں نہیں؟ ایک گاؤں میں ایک سُوریلا ہے۔ تمہاری ہی جات برادری کی ہے۔ کہو تو بات چیت پکی کردوں۔ تمہاری بارات میں مزہ سے دو دن باٹیاں لگیں۔

سُورداس۔ کوئی ایسی جگہ بتائیے جہاں دَھن ملے۔ اور اس بھیکا منگائی سے پیچھا چھوٹے۔ ابھی اپنے ہی پیٹ کی فکر ہے۔ تب ایک اندھی کی اور فکر ہو جائے گی۔ ایسی بیڑی پیر میں نہیں ڈالتا۔ بیڑی ہی ہے تو سونے کی تو ہو!

گنیش۔ لاکھ روپے کی مہریا نہ پاجاؤ گے۔ رات کو تمہارے پاؤں دبائے گی۔ سر میں تیل ڈالے گی تو ایک بار پھر جوان ہو جاؤ گے۔ یہ ہڈیاں نہ دکھائی دیں گی۔

سُورداس۔ تو روٹیوں کا سہارا بھی جاتا رہے گا۔ یہ ہڈیاں دیکھ کر

ہی تو لوگوں کو دیا آتی ہے۔ موٹے آدمیوں کو بھیک کون دیتا ہے
اُلٹا اور طعنے ملتے ہیں ۔

گنیش۔ ابھی نہیں۔ وہ تمہاری سیوا بھی کرے گی اور تمہیں بھوجن
بھی دے گی۔ بیجن ساہ کے یہاں تلہن جھاڑے گی تو چار آنے روز
پائے گی ۔

شوورداس۔ تب تو اور بھی دُرگت ہوگی۔ گھروالی کی کمائی کھاکر
کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہوں گا ۔

دفعتاً ایک فٹن آتی ہوئی سُنائی دی۔ شوورداس لاٹھی ٹیک
کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہی اُس کی کمائی کا وقت تھا۔ اسی وقت شہر
کے رئیس اور مہاجن ہوا خوری کو آتے تھے۔ فٹن جوں ہی سامنے
آئی۔ شوورداس اُس کے پیچھے "داتا بھگوان تمہارا کلیان کرے"
کہتا ہوا دوڑا ۔

فٹن میں چار صدر پر مسٹر جان سیوک اور اُن کی اہلیہ مسز
جان سیوک بیٹھی ہوئی تھیں۔ مقابل میں اُن کا جوان لڑکا پربھو سیوک
اور اُس کی چھوٹی بہن مس صوفیہ سیوک تھی۔ جان سیوک دوہرے
بدن کے گورے چٹے آدمی تھے۔ بڑھاپے میں بھی چہرہ سرخ تھا۔
سر اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہوگئے تھے۔ وضع انگریزی تھی جو
اُن پر خوب موزوں تھی۔ چہرہ پر غرور اور خودداری کا رنگ جھلکتا
تھا۔ مسز سیوک کو وقت کے ہاتھوں نے زیادہ ستایا تھا۔ چہرہ پر
جھریاں پڑ گئی تھیں۔ اور اس سے اُن کی تنگ دلی کا اظہار ہوتا
تھا۔ جسے سُنہری عینک بھی نہ چھپا سکتی تھی۔ پربھو سیوک کی

مسیں بھیگ رہی تھیں۔ چھریرا اور اکہرا بدن۔ زرد رُو۔ آنکھوں پہ عینک اور چہرہ پر متانت اور غور و خوض کا گہرا رنگ نظر آتا تھا آنکھوں سے ایک نورِ ترحم نمودار تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حسنِ قدرت سے لطف اٹھا رہا ہے۔ مس صوفیہ بڑی بڑی آنکھوں والی شرمیلی نازنین تھی۔ نازک اندام اس قدر گویا عناصر کے بجائے پھولوں سے وجود پذیر ہوئی تھی۔ چہرہ ایسا موزوں گویا شرم و انکسار کا مجسمہ تھا۔ وہ سراپا روح تھی۔ مادیت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سُورداس لفٹن کے پیچھے دوڑتا چلا آتا تھا۔ اتنی دور تک اور تیزی سے کوئی مشاق کھلاڑی بھی نہ دوڑ سکتا تھا۔ مسز سیوک نے ناک سکوڑ کر کہا "اس کم بخت کی چیخ نے تو کانوں کے پردے پھاڑ ڈالے کیا یہ دوڑتا ہی چلا جائے گا؟"

مسٹر جان سیوک بولے "اس ملک کے سر سے یہ بلا نہ جانے کب جائے گی؟ جس ملک میں بھیک مانگنا ہیشر میں داخل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اونچی سے اونچی ذاتیں بھی اسے کسبِ معاش کا ذریعہ بنائیں۔ جہاں مہاتماؤں کے گزر بسر کا بھی صرف یہی ایک سہارا ہو۔ اُس ملک کی نجات کے لئے ابھی صدیوں کی مدت درکار ہے"۔

پربھو سیوک۔ یہاں یہ رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ زمانۂ سلف میں راجاؤں کے لڑکے بھی درس گاہوں میں پڑھتے وقت بھیک مانگ کر اپنی نیز اپنے اُستادوں کی پرورش کرتے تھے۔ علماء و فقرا کے لئے بھی یہ کوئی بےعزتی کی بات نہ تھی۔ مگر وہ لوگ مکروہات

دُنیا سے الگ ہو کر تلاشِ حق میں معروف رہتے تھے۔ اُس رولج کو اب بیجا طریقہ پر برتا جا رہا ہے۔ میں نے یہاں تک سُنا ہے کہ کتنے ہی برہمن جو زمیندار ہیں گھر سے خالی ہاتھ مقدمہ بازی کرنے چلتے ہیں۔ دن بھر کبھی لڑکی کے بیاہ کے حیلہ سے کبھی کسی عزیز کی موت کے بہانے سے بھیک مانگتے ہیں۔ شام کو اناج بیچ کر پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔ پیسے جلد روپے بن جاتے ہیں اور بالآخر وہ وکیلوں اور کچہری کے عملوں کی جیبوں میں چلے جاتے ہیں ؛

مسٹر سیوک۔ سائیس! اس اندھے سے کہہ دے۔ بھاگ جائے۔ پیسے نہیں ہیں ؛

مس صوفیہ۔ نہیں ماما! پیسے ہوں تو دے دیجئے۔ بیچارہ نصف میل سے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ مایوس ہو جائے گا۔ اُس کی آتما کو کتنا دُکھ ہوگا ؛

مسٹر سیوک۔ تو یہاں اُس سے کس نے دوڑنے کے لئے کہا تھا؟ اُس کے پیروں میں درد ہوتا ہوگا!

صوفیہ۔ نہیں۔ اچھی ماما! کچھ دے دیجئے۔ بیچارہ کتنا ہانپ رہا ہے ؛

پربھو سیوک نے جیب سے کیس نکالا۔ مگر تانبے یا نکل کا کوئی ٹکڑا نہ نکلا۔ اور چاندی کا کوئی سکہ دینے میں ماں کی ناراضگی کا اندیشہ تھا۔ بہن سے بولے "صوفی! افسوس ہے پیسے نہیں نکلے۔ سائیس! اندھے سے کہہ دو۔ آہستہ آہستہ آگے والے گودام تک چلا آئے۔ وہاں شاید پیسے مل جائیں ؛

مگر سُورداس کو اتنا صبر کہاں؟ جانتا تھا۔ گودام پر کوئی میرے لئے کھڑا نہ رہے گا۔ کہیں گاڑی آگے بڑھ گئی تو اتنی محنت بیکار ہو جائے گی۔ اُس نے گاڑی کا پیچھا نہ چھوڑا اور پورے ایک میل تک دوڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گودام آگیا اور فٹن رُکی۔ سب لوگ اُتر پڑے۔ سُورداس بھی ایک طرف کھڑا ہو گیا جیسے درختوں کے بیچ میں ٹھُنڈ۔ ہانپتے ہانپتے بیدم ہو رہا تھا۔

مسٹر جان سیوک نے یہاں چمڑے کی آڑہت کھول رکھی تھی۔ طاہر علی نامی ایک شخص اُن کا ایجنٹ تھا۔ وہ برآمدہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ صاحب کو دیکھتے ہی اُس نے اُٹھ کر سلام کیا۔

جان سیوک نے پوچھا۔ کہئے خاں صاحب! چمڑے کی آمدنی کیسی ہے؟

طاہر علی۔ حضور! ابھی جیسی ہونی چاہئے ویسی تو نہیں ہے مگر امید ہے کہ آیندہ اچھی ہو۔

جان سیوک۔ کچھ دوڑ دھوپ کیجئے۔ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے کام نہ چلے گا۔ قرب وجوار کے دیہاتوں میں چکر لگایا کیجئے۔ میرا ارادہ ہے۔ کہ میونسپلٹی کے چیرمین صاحب سے مل کر یہاں ایک شراب اور تاڑی کی دوکان کھلوادوں۔ اُس وقت آس پاس کے چمار یہاں روز آئیں گے۔ اور آپ کو اُن سے ربط ضبط پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔ آج کل ان چالوں کے بغیر کسی کاروبار کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ مجھی کو دیکھئے۔ ایسا شاید ہی کوئی دن جاتا ہوگا۔ کہ میں شہر کے دو چار بڑے آدمیوں سے ملاقات نہ کرتا ہوں۔ دس ہزار کی بھی

ایک پالیسی بل گئی تو ہفتوں کی دوا دوش کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔
طاہر علی۔ حضور! مجھے خود فکر ہے۔ سوچتا ہوں کہ کاروبار میں مالک کو چار پیسے کا نفع نہ ہوگا تو وہ اُس کام کو کرے گا کیوں؟ مگر حضور نے میری جو تنخواہ مقرر کی ہے۔ اُس میں گزر نہیں ہوتا۔ گھر کے لئے تو بیس روپے کا اناج بھی کافی نہیں ہوتا اور سب ضروریات اُس کے علاوہ۔ ابھی کہنے کی تو ہمت نہیں پڑتی مگر حضور سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟
جان سیوک۔ کچھ دن کام کیجئے۔ ترقی ہوگی نا۔ کہاں ہے آپ کا حساب کتاب؟ لائیے! دیکھوں۔
یہ کہتے ہوئے مسٹر جان سیوک گودام کے برآمدے میں ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ مسز سیوک ایک کرسی پر تمکن ہوئیں۔ طاہر علی نے بہی لا کر سامنے رکھ دی۔ صاحب اُس کا معائنہ کرنے لگے۔ دو چار ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ذرا بگڑ کر بولے۔
"ابھی آپ کو حساب کتاب رکھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اُس پر آپ فرماتے ہیں کہ ترقی کر دیجئے۔ حساب بالکل آئینہ ہونا چاہئے۔ یہاں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے کتنا مال خریدا اور کتنا روانہ کیا۔ خریدار کو فی کھال ایک آنہ دستوری ملتی ہے۔ وہ کہیں درج نہیں ہے"
طاہر علی۔ کیا اسے بھی درج کروں؟
جان سیوک۔ کیوں نہیں؟ کیا وہ بھی میری ہی آمدنی نہیں ہے؟
طاہر علی۔ میں نے تو سمجھا تھا یہ مجھ خادم کا حق ہے۔
جان سیوک۔ ہرگز نہیں! میں آپ پر غبن کا مقدمہ دائر کر

سکتا ہوں (تیور بدل کر) ملازموں کا حق ہے! خوب۔ آپ کا حق ہے تنخواہ۔ اس کے سوا آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔

طاہر علی۔ حضور! اب آیندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔

جان سیوک۔ اب تک اس مد میں آپ نے جو رقم وصول کی ہے وہ آمدنی میں دکھایئے۔ حساب کتاب کے معاملے میں میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔

طاہر علی۔ حضور! بہت قلیل رقم ہوگی۔

جان سیوک۔ کچھ مضایقہ نہیں۔ ایک ہی پائی سہی۔ یہ سب آپ کو بھرنی پڑے گی۔ ابھی وہ رقم قلیل ہے۔ کچھ دنوں میں اُس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ اس رقم سے میں یہاں ایک سنڈے اسکول کھول سکتا ہوں۔ سمجھ گئے۔ میم صاحب کی یہ بڑی زبردست خواہش ہے۔ اچھا چلئے۔ وہ زمین کہاں ہے جس کا آپ نے ذکر کیا تھا؟

گودام کے عقب میں ایک وسیع میدان تھا۔ یہاں قرب و جوار کے مواشی چرنے جایا کرتے تھے۔ جان سیوک اس زمین کو خرید کر وہاں ایک سگریٹ بنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے پربھو سیوک کو یہی ہنر سیکھنے کے لئے امریکہ بھیجا تھا۔ جان سیوک کے ساتھ پربھو سیوک اور اُن کی ماں بھی زمین کو دیکھنے چلے۔ باپ بیٹے نے مل کر اراضی کی پیمایش کی۔ کہاں کارخانہ ہوگا کہاں گودام۔ کہاں دفتر، کہاں مینیجر کا بنگلہ۔ کہاں مزدوروں کی بارکیں۔ کہاں کوئلہ رکھنے کی جگہ اور کہاں سے پانی آئے گا۔ وغیرہ کے متعلق باپ بیٹے

میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر مسٹر سیلوک نے طاہر علی سے پوچھا "یہ کس کی زمین ہے؟"

طاہر علی۔ حضور۔ یہ تو ٹھیک نہیں معلوم۔ ابھی چل کر یہاں کسی سے دریافت کر لوں گا۔ شاید نائک رام پنڈا کی ہو۔

جان سیوک۔ آپ اُس سے یہ زمین کتنے میں دلا سکتے ہیں؟

طاہر علی۔ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ کیا وہ اُسے بیچے گا بھی۔

جان سیوک۔ اجی! بیچے گا اس کا باپ! اُس کی کیا ہستی ہے؟ روپے کے سترہ آنے دیجئے۔ اور آسمان کے تارے منگوا لیجئے۔ آپ اُسے میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں خود باتیں کر لوں گا۔

پربھو سیوک۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ یہاں خام جنس مشکل مل سکے گی۔ اِس طرف تمباکو کی کاشت کم کرتے ہیں۔

جان سیوک۔ کچا مال پیدا کرنا تمہارا کام ہوگا۔ کاشتکار کو کچھ جَو یا گیہوں سے عشق نہیں ہوتا۔ وہ جس چیز میں اپنا فائدہ دیکھے وہی پیدا کرے گا۔ اس کا کچھ اندیشہ نہیں ہے۔ (طاہر علی سے) خاں صاحب! آپ اُس پنڈے کو میرے پاس کل ضرور بھجوائیے گا۔

طاہر علی۔ بہت خوب! اس سے کہوں گا۔

جان سیوک۔ کہوں گا نہیں اُس کو بھیج دیجئے گا۔ اگر آپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا تو میں سمجھوں گا کہ آپ کو معاملہ بندی کا مطلق شعور نہیں۔

مسز سیوک (انگریزی میں) تمہیں اس جگہ پر کوئی تجربہ کار آدمی رکھنا چاہئے تھا۔

جان سیوک (انگریزی میں) نہیں۔ میں تجربہ کار آدمی سے ڈرتا

ہوں۔ وہ اپنے تجربے سے اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ تمہیں فائدہ نہیں پہنچاتا۔ میں تجربہ کاروں سے کوسوں دور رہتا ہوں۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے چاروں آدمی فٹن کے پاس آئے یہاں صوفیہ کھڑی ہوئی سورداس سے باتیں کر رہی تھی۔ مسز سیوک کو دیکھتے ہی انگریزی میں بولی: "ممی! یہ اندھا تو کوئی گیانی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پورا فلاسفر ہے۔"

مسز سیوک۔ تو جہاں جاتی ہے وہیں تجھے کوئی نہ کوئی گیانی آدمی مل جاتا ہے۔ کیوں بے اندھے! تو بھیک کیوں مانگتا ہے؟ کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟

صوفیہ (انگریزی میں) ماما! یہ اندھا بالکل گنوار نہیں ہے۔

سورداس کو صوفیہ سے عزت پانے کے بعد یہ توہین آمیز الفاظ بہت برے معلوم ہوئے۔ اپنی عزت کرنے والوں کے سامنے اپنی ہتک کئی گنا ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ وہ سر اٹھا کر بولا: "بھگوان نے جنم دیا ہے۔ بھگوان کی چاکری کرتا ہوں۔ کسی دوسرے کی تابعداری اب نہیں ہو سکتی۔"

مسز سیوک۔ تیرے بھگوان نے تجھے اندھا کیوں بنا دیا؟ اس لئے کہ تو بھیک مانگتا پھرے؟ تیرا بھگوان بڑا بے انصاف ہے۔

صوفیہ (انگریزی میں) ماما! آپ اس کی اتنی بے عزتی کر رہی ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔

سورداس۔ بھگوان بے انصاف نہیں۔ میرے پچھلے جنم کی کمائی ہی ایسی تھی۔ جیسے کرم کئے ہیں ویسا پھل بھوگ رہا ہوں۔ یہ سب

بھگوان کی لیلا ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔ گھروندے بنا تا بگاڑتا رہتا ہے۔ اُس کو کسی سے عداوت نہیں ہے۔ وہ کیوں بے انصافی کرنے لگا؟

صوفیہ۔ میں اگر اندھی ہوتی تو خدا کو کبھی معاف نہ کرتی ÷

سُورداس۔ میم صاحب! اپنے پاپ سب کو آپ بھوگنے پڑتے ہیں۔ بھگوان کا اس میں کوئی دوش نہیں ÷

صوفیہ۔ ماما! یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر خداوند یسوع نے ہمارے گناہوں کا کفارہ اپنے خون سے کر دیا تو پھر سارے عیسائی ایک ہی حالت میں کیوں نہیں ہیں؟ دیگر مذاہب والوں کی طرح ہماری قوم میں بھی امیر، غریب، اچھے۔ بُرے۔ لنگڑے۔ لُولے سبھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟

مسز سیوک نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ کہ سُورداس بول اُٹھا "میم صاحب! اپنے گناہوں کا کفارہ ہمیں آپ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آج معلوم ہو جائے کہ کسی نے ہمارے گناہوں کے بار کو اپنے سر لے لیا تو دنیا میں اندھیر ہو جائے" ÷

مسز سیوک۔ صوفی! مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی موٹی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ ریورنڈ پِم نے خود کئی بار تیرے شکوک کا دفعیہ کیا ہے ÷

پربھو سیوک۔ (سُورداس سے) تمہارے خیال میں ہم لوگوں کو ویراگی ہو جانا چاہئے؟ کیوں؟

سُورداس۔ ہاں۔ جب تک ہم ویراگی نہ ہوں گے۔ ہم دُکھوں سے

نہیں ہو سکتے!

جان سیلوک۔ بدن پر راکھ مل کر بھیک مانگنا خود ہی سب سے بڑا دُکھ ہے۔ یہ ہم کو دکھوں سے کیونکر نجات دلا سکتا ہے؟

سورداس۔ صاحب! بیراگی ہونے کے لئے راکھ ملنے اور بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مہاتماؤں نے راکھ ملنے اور جٹا بڑھانے کو تو محض ڈھکوسلا بتا دیا ہے۔ بیراگ تو من سے ہوتا ہے۔ سنسار میں رہے مگر سنسار کا ہو کر نہ رہے۔ اسی کو بیراگ کہتے ہیں۔

مسز سیلوک۔ ہندوؤں نے یہ باتیں یونان کے "اسٹوئک" نامی فرقہ سے سیکھی ہے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان پر کاربند ہونا کتنا مشکل ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان پر رنج و مسرت کا اثر نہ پڑے اسی اندھے کو اگر اس وقت پیسے نہ ملیں تو اپنے دل میں ہمیں ہزاروں صلواتیں سُنائے گا۔

جان سیلوک۔ ہاں۔ اسے کچھ مت دو۔ دیکھو کیا کہتا ہے۔ اگر ذرا بھی بھنبھنایا تو میں ہنٹر سے باتیں کروں گا۔ سارا ویراگ بھول جائے گا۔ مانگتا ہے بھیک۔ ایک ایک دھیلے کے لئے میلوں کتے کی طرح دوڑتا ہے۔ اُس پر طرہ یہ ہے کہ میں بیراگی ہوں۔ (کوچوان سے) گاڑی پھیرو۔ کلب ہوتے ہوئے بنگلے چلو۔

صوفیہ۔ ماما! کچھ تو ضرور دے دو! بے چارہ امیدیں باندھ کر اتنی دُور دوڑا آیا ہے۔

پربھو سیوک۔ اوہو! مجھے تو پیسے بُھنانے کی یاد ہی نہ رہی!

جان سیلوک۔ ہرگز نہیں۔ کچھ مت دو۔ میں اسے بیراگ کا سبق دینا چاہتا ہوں ؂

گاڑی روانہ ہوئی۔ سُورداس مایوسی کا مجسمہ بنا ہوا اپنی اندھی آنکھوں سے گاڑی کی طرف تاکتا رہا۔ گویا اس کو اب بھی یقین نہ ہوتا تھا۔ کہ کوئی انسان اتنا بیرحم ہوسکتا ہے۔ وہ اسی نیم یقینی کی حالت میں گاڑی کے پیچھے پیچھے کئی قدم چلا بھی۔ دفعتاً صوفیہ نے کہا "سُورداس! افسوس کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر کبھی ادھر آؤں گی تو تم کو اس قدر مایوس نہ ہونا پڑے گا"۔

اندھوں میں فراست کا مادہ کافی ہوتا ہے۔ سُورداس موجودہ کیفیت کو بخوبی سمجھ گیا۔ دل کو تکلیف تو ہوئی مگر بے پروائی سے بولا "میم صاحب! اس کی کیا فکر؟ بھگوان تمہاری کلیان کریں۔ تمہاری دیا چاہئے۔ میرے لئے یہی بہت ہے" ؂

صوفیہ نے ماں سے کہا "ماما! دیکھا آپ نے؟ اس کی طبیعت ذرا بھی مکدر نہیں ہوئی" ؂

پربھو سیلوک۔ ہاں۔ رنجیدہ تو نہیں معلوم ہوتا ؂

جان سیلوک۔ اس کے دل سے پوچھو ؂

مسز سیلوک۔ گالیاں دے رہا ہوگا ؂

گاڑی ابھی آہستہ چل رہی تھی کہ طاہر علی نے پکارا۔ "حضور۔ یہ زمین پنڈا کی نہیں بلکہ سُورداس کی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں" ؂

صاحب نے گاڑی روک دی۔ شرمندہ نظری سے مسز سیلوک

کو دیکھا۔ گاڑی سے اُتر کر سُورداس کے پاس آئے۔ اور منکسرانہ انداز سے بولے "کیوں سُورداس؟ یہ زمین تمہاری ہے؟"

سُورداس۔ ہاں۔ حضور! میری ہی ہے۔

جان سیوک۔ تو میرا کام بن گیا۔ میں اندیشہ میں تھا کہ نہ جانے اس کا مالک کون ہے۔ اور اُس سے معاملہ طے بھی ہوگا یا نہیں۔ جب تمہاری ہے تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔ تم جیسے تارک الدنیا اور نیک شخص سے زیادہ جھنجھٹ نہ کرنا پڑے گا۔ جب تمہارے پاس اتنی زمین ہے تو تم نے یہ بھیس کیوں بنا رکھا ہے؟

سُورداس۔ کیا کروں حضور۔ بھگوان کی جو مرضی ہے وہ کر رہا ہوں۔

جان سیوک۔ تو اب تمہاری مصیبت دور ہو جائے گی۔ بس یہ زمین مجھے دے دو۔ بھلائی کی بھلائی اور فائدہ کا فائدہ۔ میں تم کو منہ مانگی قیمت دوں گا۔

سُورداس۔ سرکار! بزرگوں کی یہی نشانی ہے۔ اِسے بیچ کر اُن کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

جان سیوک۔ یہیں سڑک پر ایک کنواں بنا دوں گا تمہارے پرکھوں کا نام اُس سے چلتا رہے گا۔

سُورداس۔ صاحب! اِس زمین سے محلہ والوں کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کہیں ایک اُنگل بھر چرائی نہیں ہے۔ قرب وجوار کے کُل مویشی یہیں چرنے آتے ہیں۔ فروخت کر ڈالوں گا تو مویشیوں کے لئے کوئی ٹھکانا نہ رہ جائے گا۔

جان سیوک۔ کتنے روپے سالانہ چرائی کے پاتے ہو؟

شُور داس۔ کچھ نہیں۔ مجھے بھگوان کھانے بھر کو یوں ہی دے دیتے ہیں تو کسی سے چرائی کیا لوں؟ کسی کی اور کچھ بھلائی نہیں کر سکتا تو اتنی ہی سہی۔

جان سیوک (تعجب سے) تم نے اتنی زمین یوں ہی چرائی کے لئے چھوڑ رکھی ہے۔ صوفیہ سچ کہتی تھی کہ تم تیاگ کی مورت ہو۔ میں نے بڑوں بڑوں میں اتنا تیاگ نہیں دیکھا۔ تم کو آفرین ہے۔ لیکن جب مویشیوں پر اتنی دیا کرتے ہو تو انسان کو کس طرح مایوس کرو گے۔ میں یہ زمین لئے بغیر تمہارا گلا نہ چھوڑوں گا۔

شُور داس۔ سرکار! یہ زمین میری ہے ضرور۔ لیکن جب تک محلہ والوں سے پوچھ نہ لوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ اس کو لے کر کیا کریں گے؟

جان سیوک۔ یہاں ایک کارخانہ کھولوں گا جس سے ملک و قوم کی ترقی ہوگی۔ غریبوں کا فائدہ ہوگا۔ ہزاروں آدمیوں کی روٹیاں چلیں گی۔ اس کا ثواب بھی تمہیں کو ہوگا۔

شُور داس۔ حضور! محلہ کے لوگوں سے دریافت کئے بغیر میں کچھ نہیں عرض کر سکتا۔

جان سیوک۔ اچھی بات ہے۔ پوچھ لو۔ میں پھر تم سے ملوں گا۔ اتنا سمجھ رکھو کہ میرے ساتھ سودا کرنے میں تم کو گھاٹا نہ رہے گا۔ تم جس طرح خوش ہوگے اسی طرح خوش کروں گا۔ یہ لو (جیب سے پانچ روپے نکال کر) میں نے تم کو معمولی بھکاری سمجھ کر تمہاری توہین

کی تھی۔ پس مجھے معاف کرو۔

سورداس۔ حضور! میں روپے لے کر کیا کروں گا؟ دھرم کے ناتے دو چار پیسے دے دیجئے تو آپ کا کلیان مناؤں گا۔ اور کسی ناتے سے میں روپے نہ لوں گا۔

جان سیوک۔ تمہیں دو چار پیسے کیا دوں؟ اسے لے لو۔ دھرم کے ناتے ہی سمجھو۔

سورداس۔ نہیں صاحب! دھرم میں آپ کی غرض شامل ہو گئی ہے۔ اب یہ دھرم نہیں رہا۔

جان سیوک نے بہت اصرار کیا۔ لیکن سورداس نے روپے نہ لئے۔ صاحب مجبور ہو کر گاڑی پر جا بیٹھے۔ مسز سیوک نے پوچھا "کیا باتیں ہوئیں؟"

جان سیوک۔ ہے تو فقیر لیکن بہت مغرور ہے۔ پانچ روپے دیتا تھا۔ نہ لئے۔

مسز سیوک۔ ہے کچھ اُمید؟

جان سیوک۔ جتنا آسان سمجھ رکھا تھا۔ اتنا آسان نہیں ہے۔ گاڑی تیز ہو گئی ——

(۲)

سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ راستے میں چلتے چلتے سوچنے لگا۔ "یہ ہے بڑے آدمیوں کی خود غرضی۔ پہلے کیسی شان دکھاتے تھے۔ مجھے کُتّے سے بھی بدتر سمجھا۔ لیکن جوں ہی اُن کو معلوم ہوا کہ زمین میری ہے تو کیسی خوشامد آمیز گفتگو کرنے

لگے۔ نہیں میں اپنی زمین ہونے دیتا ہوں! پانچ روپے دکھاتے تھے۔ گویا میں نے روپے دیکھے ہی نہیں! پانچ کیا، پانچ سو بھی دیں تو میں زمین نہ دوں گا۔ محلہ والوں کو کونسا مُنہ دکھاؤں گا۔ ان کے کارخانہ کے لئے بیچاری گائیں ماری ماری پھریں! عیسائیوں کو دیا دھرم کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ بس سب کو عیسائی ہی بناتے پھرتے ہیں۔ کچھ نہ دینا تھا تو پہلے ہی جواب دے دیتے۔ میل بھر دوڑا کر کہہ دیا تھا "چل ہٹ"! معلوم ہوتا ہے کہ اُن سب میں لڑکی ہی کا سوبھاؤ اچھا ہے۔ اُسی میں دیا دھرم ہے۔ بڑھیا تو پوری کرکسا ہے۔ سیدھے مُنہ بات نہیں کرتی۔ اتنا گھمنڈ! جیسے یہی وکٹوریہ ہیں! رام رام تھک گیا۔ ابھی تک دم پھول رہا ہے ایسا آج تک کبھی نہ ہوا تھا۔ کہ اتنا دوڑ کر کسی نے کورا جواب دے دیا ہو۔ خیر۔ بھگوان کی یہی اچھا ہوگی۔ اے دل! اتنا غم نہ کر۔ مانگنا تمہارا کام ہے اور دینا دوسروں کا۔ اپنا تو من ہے۔ کوئی نہیں دیتا تو تمہیں بُرا کیوں لگتا ہے؟ لوگوں سے کہہ دوں کہ صاحب زمین مانگتے تھے؟ نہیں۔ سب گھبرا جائیں گے۔ میں نے جواب تو دے ہی دیا۔ اب دوسروں سے کہنا فضول ہے"۔

یہ سوچتا ہوا وہ اپنے دروازہ پر پہنچا۔ بہت ہی معمولی جھونپڑی تھی۔ سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ دروازہ پر کواڑوں کی جگہ بانس کی ٹہنیوں کی ایک ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ سورداس نے ٹٹی ہٹائی کمر سے پیسوں کی ایک چھوٹی پوٹلی نکالی۔ جو آج دن بھر کی کمائی تھی۔ پھر جھونپڑی کی چھت میں سے ٹٹول کر ایک تھیلی نکالی۔

جو اُس کی زندگی کا ماحصل تھی۔ اُس نے اُن پیسوں کو بہت آہستہ
سے رکھا کہ کسی کے کانوں میں بھنک نہ پڑے۔ ازاں بعد اُس نے تھیلی
کو چھت میں چھپا کر پڑوس کے گھر سے آگ مانگ لایا۔ پیڑوں
کے نیچے سے کچھ سوکھی ٹہنیاں جمع کر رکھی تھیں۔ اُنہیں سے چولہا
جلایا۔ جھونپڑی میں دھندلی سی روشنی ہوئی۔ بے سروسامانی کا
نظارہ کتنا دل شکن تھا! نہ کھاٹ۔ نہ بستر۔ نہ برتن۔ نہ بھانڈے۔
ایک گوشہ میں ایک مٹی کا گھڑا تھا جس کی عمر کا کچھ اندازہ اُس پر
جمی ہوئی کائی سے ہو سکتا تھا۔ چولہے کے پاس ایک ہانڈی تھی
پرانا اور سوراخوں سے چھلنی بنا ہوا ایک لوہے کا توا۔ ایک چھوٹی
کٹھوت اور ایک لوٹا۔ بس یہی اُس گھر کی ساری دولت تھی۔
انسانی خواہشات کا کتنا مکمل خلاصہ! سور داس نے آج جتنا اناج
پایا تھا وہ سب جوں کا توں ہانڈی میں ڈال دیا۔ کچھ جو تھا۔ کچھ
گیہوں۔ کچھ مٹر۔ کچھ چنے۔ تھوڑی سی جوار اور مٹھی بھر چاول۔ اوپر
سے تھوڑا سا نمک ڈال دیا۔ کس کی زبان نے ایسی غذائے لطیف
و نفیس کا مزہ چکھا ہوگا؟ اُس میں قناعت کی شیرینی تھی جس سے
شیریں تر دُنیا میں کوئی چیز نہیں۔ ہانڈی کو چولہے پر چڑھا کر وہ
گھر سے نکلا۔ دروازہ پر ٹٹی لگائی۔ اور سڑک پر جا کر ایک بنئے کی
دوکان سے تھوڑا سا آٹا اور ایک پیسہ کا گڑ لایا۔ آٹے کو کٹھوت
میں گوندھا اور پھر نصف گھنٹہ تک چولہے کے سامنے ہانڈی کا
دلکش ترانا سنتا رہا۔ اُس دھندلی سی روشنی میں اُس کا [illegible]
اور اُس کے بوسیدہ کپڑے انسانوں کی اُس محبت کا مضحکہ اُڑاتے

تھے۔ جوان کو زندگی کے ساتھ فطرتاً ہوا کرتی ہے۔

ہانڈی میں کئی دفعہ اُبال آیا۔ اور کئی دفعہ آگ بجھی۔ بار بار چولھا پھونکتے پھونکتے سُوردا س کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا آنکھیں چاہے دیکھ نہ سکیں پر رو سکتی ہیں۔ آخر وہ لذیذ مرکب تیار ہوا۔ اُس نے اُس کو اُتار کر نیچے رکھا۔ چولھے پر توا چڑھایا۔ اور ہاتھوں سے روٹیاں بنا بنا کر سینکنے لگا۔ کتنا صحیح اندازہ تھا! روٹیاں سب یکساں تھیں۔ نہ چھوٹی نہ بڑی، نہ سیوڑی، نہ جلی ہوئی۔ توے سے اُتار اُتار کر روٹیوں کو چولھے میں پکاتا تھا اور زمین پر رکھتا جاتا تھا۔ جب روٹیاں بن گئیں تو اُس نے دروازہ پر کھڑے ہو کر زور سے پکارا:۔ "مٹھو! مٹھو! آؤ بیٹا! کھانا تیار ہے۔" مگر جب مٹھو نہ آیا تو اُس نے پھر دروازہ پر ٹٹی لگائی اور نایک رام کے برآمدہ میں جا کر "مٹھو مٹھو" پکارنے لگا۔ مٹھو وہیں پڑا سو رہا تھا۔ آواز سُن کر چونکا۔ ۱۲-۱۳ سال کا خوب صورت اور خندہ رُو لڑکا تھا۔ بھرا ہوا جسم۔ سڈول ہاتھ پاؤں۔ یہ سُورداس کا بھتیجا تھا۔ اِس کے ماں باپ دونوں طاعون میں مر چکے تھے۔ تین سال سے اُس کی پرورش و پرداخت کا بار سورداس ہی پر تھا۔ وہ اِس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ وہ خود چاہے فاقہ کرے مگر مٹھو کو ہر روز تین مرتبہ ضرور کھلاتا تھا۔ خود مٹر چبا کر رہ جاتا مگر اُس کو شکر اور روٹی کبھی گھی اور نمک کے ساتھ روٹیاں کھلاتا تھا۔ اگر کوئی بھیک میں مٹھائی یا گڑ دے دیتا تو اُس کو بڑی احتیاط سے اپنے انگوچھے کے گوشہ میں باندھ لیتا اور مٹھو کو دیتا۔ سب سے کہتا "یہ کمائی

بڑھاپے کے لئے کر رہا ہوں۔ ابھی تو ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ مانگ کھاتا ہوں۔ جب اُٹھ بیٹھ نہ سکوں گا تو لوٹا بھر پانی کون دے گا؟ مٹھو کو سوتا پا کر گود میں اُٹھا لیا۔ اور جھونپڑی کے دروازہ پر اُتارا۔ پھر دروازہ کھولا۔ اُس کا مُنہ دھلوایا اور سامنے گڑ اور روٹیاں رکھ دیں۔ مٹھو نے روٹیاں دیکھیں تو مچل کر بولا "میں روٹی اور گڑ نہ کھاؤں گا" یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

سُورداس۔ بیٹا! بہت اچھا گڑ ہے۔ کھاؤ تو۔ دیکھو کیسی نرم نرم روٹیاں ہیں۔ گیہوں کی ہیں۔

مٹھو۔ میں نہ کھاؤں گا۔

سُورداس۔ تو کیا کھاؤ گے بیٹا؟ اتنی رات گئے اور کیا ملے گا؟

مٹھو۔ میں تو دودھ روٹی کھاؤں گا۔

سُورداس۔ بیٹا! اس وقت کھا لو۔ میں سویرے دودھ لا دوں گا۔

مٹھو رونے لگا۔ سُورداس اُسے بہلا کر تھک گیا۔ تو اپنے نصیبوں کو روتا ہوا اُٹھا۔ لکڑی اُٹھائی اور ٹٹولتا ہوا بجرنگی اہیر کے گھر آیا جو اُس کی جھونپڑی کے پاس ہی تھا۔ بجرنگی کھاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اُس کی بیوی جمنی کھانا پکاتی تھی صحن میں تین بھینسیں اور چار پانچ گائیں چرنی پر بندھی ہوئیں چارا کھا رہی تھیں۔ بجرنگی نے کہا: "کہو سورداس! کیسے چلے؟ آج بگھی پر کون لوگ بیٹھے ہوئے تم سے باتیں کر رہے تھے"؟

سورداس۔ وہی گودام کے صاحب تھے۔

بجرنگی۔ تم بہت دور تک گاڑی کے پیچھے دوڑے۔ کچھ ہاتھ لگا؟

سُورداس۔ پتھر ہاتھ لگا! جیسا بیھوں میں بھی کہیں دیا دھرم ہوتا ہے۔ میری وہی زمین لینے کو کہتے ہیں ؞

بجرنگی۔ گودام کے پیچھے والی نا؟

سُورداس۔ ہاں۔ وہی۔ بہت لالچ دیتے رہے پر میں نے ہاں نہیں کہا ؞

سُورداس نے سوچا تھا کہ ابھی کسی سے یہ بات نہیں کہوں گا۔ لیکن اس وقت دودھ لینے کے لئے کچھ خوشامد ضروری تھی۔ اپنا تیاگ دکھا کر سُرخرُو بننا چاہتا تھا ؞

بجرنگی۔ تم ہاں بھی کرتے تو یہاں کون اسے چھوڑے دیتا تھا؟ تین چار گاؤں کے بیچ میں یہی تو اتنی زمین ہے وہ نکل جائے گی تو ہماری گائیں اور بھینسیں کہاں جائیں گی؟

جمنی۔ میں تو انہیں کے دروازہ پر اُن کو باندھ آتی ؞

سُورداس۔ میری جان نکل جائے تب تو بیچوں ہی گا نہیں۔ ہزار پانچ سو کس گنتی میں ہیں؟ بھوجی! ایک گھونٹ دودھ ہو تو دے دے۔ مِٹھوا کھانے بیٹھا ہے۔ روٹی اور گڑ چھوتا ہی نہیں بس دودھ دودھ کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ جو چیز گھر میں نہیں ہوتی اُسی کے لئے ضد کرتا ہے۔ دودھ نہ پائے گا تو بغیر کھائے ہی سو رہے گا ؞

بجرنگی۔ لے جاؤ۔ دودھ کی کون کمی ہے؟ ابھی دوہا ہے۔ گھیسو کی ماں! ایک کُلھیا دودھ دے دو سُورداس کو ؞

جمنی۔ ذرا بیٹھ جاؤ سُورداس! ہاتھ خالی ہو تو دوں ؞

بجر نگی۔ وہاں مٹھو کھانے بیٹھا ہے تو کہتی ہے۔ ہاتھ خالی ہو تو دوں تجھ سے نہ اُٹھا جائے تو میں آؤں۔

جمنی جانتی تھی کہ یہ حضرت اُٹھیں گے تو پاؤ کے بدلے آدھ سیر دے ڈالیں گے۔ جھٹ رسوئی سے نکل آئی۔ ایک کٹھیا میں پانی لیا۔ اوپر سے دودھ ڈال کر سُورداس کے پاس لائی۔ اور دلآزارانہ پھل کے لہجہ میں بولی "یہ لو! اس لونڈے کی زبان تم نے ایسی بگاڑ دی ہے کہ بنا دودھ کے کور ہی نہیں اُٹھاتا۔ باپ جیتا تھا تو پیٹ بھر چنے بھی نہ ملتے تھے۔ اب دودھ کے بنا کھانے ہی نہیں اُٹھتا"۔

سورداس۔ کیا کروں بھابھی؟ رونے لگتا ہے تو ترس آتا ہے۔

جمنی۔ ابھی اس طرح پال پوس رہے ہو کہ ایک دن کام آئے گا مگر دیکھ لینا جو چلّو بھر پانی کو بھی پوچھے۔ میری بات گانٹھ باندھ لو۔ پرایا لڑکا کبھی اپنا نہیں ہوتا۔ ہاتھ پاؤں ہوئے اور تمہیں ٹھینگا کر الگ ہو جائے گا۔ تم اپنے لئے سانپ پال رہے ہو۔

سُورداس۔ جو کچھ میرا دھرم ہے کئے دیتا ہوں۔ آدمی ہوگا تو کہاں تک نہ جس مانے گا۔ ہاں اپنی تقدیر ہی کھوٹی ہوئی تو کوئی کیا کرے گا؟ اپنے ہی لڑکے کیا بڑے ہو کر منہ نہیں پھیر لیتے؟

جمنی۔ کیوں نہیں کہہ دیتے۔ میری بھینسیں چرا لایا کرے؟ جوان تو ہوا۔ کیا جنم بھر ننھا ہی بنا رہے گا؟ گھیسو ہی کا جوڑی دار تو ہے میری بات گانٹھ باندھ لو۔ ابھی سے کسی کام میں نہ لگایا تو کھلاڑی ہو جائے گا۔ پھر کسی کام میں اُس کا جی نہ لگے گا۔ ساری عمر تمہارے

ہی سر پھلوریاں کھاتا رہے گا ۔

شورداس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ دودھ کی کلھیا لی اور لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا گھر چلا۔ مٹھو زمین پر پڑا سو رہا تھا۔ اُس کو پھر اُٹھایا اور دودھ میں روٹیاں مَل کر اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ مٹھو نیند سے گرا پڑتا تھا۔ لیکن لقمہ سامنے آتے ہی اس کا مُنہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ جب وہ ساری روٹیاں کھا چکا۔ تو شورداس نے اُس کو چٹائی پر لٹا دیا۔ اور ہانڈی میں سے اپنی پنچ میل کھچڑی نکال کر کھائی۔ پیٹ نہ بھرا تو ہانڈی دھو کر پی گیا۔ ازاں بعد مٹھو کو گود میں اُٹھا کر باہر آیا۔ دروازہ پر ٹٹی لگائی اور مندر کی طرف چلا ۔

یہ مندر ٹھاکر جی کا تھا۔ بستی کے دوسرے سرے پر۔ اونچی کرسی تھی۔ مندر کے چاروں طرف تین چار گز چوڑا چبوترا تھا۔ یہی محلہ کی چوپال تھی۔ تمام دن یہاں دس پانچ آدمی لیٹے یا بیٹھے رہتے تھے۔ ایک پختہ کنواں بھی تھا۔ جس پر جگدھر نام کا ایک خوانچہ والا بیٹھا کرتا۔ تیل کی مٹھائیاں مونگ پھلی۔ رام دانے کے لڈو وغیرہ رکھتا تھا۔ راہگیر آتے۔ اُس سے مٹھائیاں لیتے۔ پانی نکال کر پیتے اور اپنی راہ چلے جاتے۔ مندر کے پوجاری کا نام دیاگر تھا جو اسی مندر کے قریب ایک کٹیا میں رہتے تھے۔ ٹھوس ایشور کے پوجاری تھے۔ بھجنوں اور گانوں کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور بلا مورت والی پوجا کو ڈھونگ کہتے تھے۔ شہر کے پرانے رئیس کنور بھرت سنگھ کے یہاں سے کچھ ماہوار وثیقہ مقرر تھا۔ اسی سے ٹھاکر جی کا بھوگ لگتا تھا۔ بستی سے بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا۔ بے لوث آدمی تھا۔ لالچ چھو بھی نہیں گیا تھا۔ صبر و توکل

کا پتلا تھا۔ تمام دن ذکر الٰہی میں مصروف رہتا تھا مندر میں ایک چھوٹی سی سنگت تھی۔ آٹھ نو بجے رات کو دن بھر کے کام دھندے سے فارغ ہو کر چند خوش اعتقاد لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اور گھنٹے دو گھنٹے بھجن گا کر چلے جاتے تھے۔ ٹھاکر دین ڈھول بجانے میں مشاق تھے۔ بجرنگی کرتال بجاتا تھا۔ جگدھر کو طنبورہ میں کمال تھا۔ نایک رام اور دیاگر سارنگی بجاتے تھے۔ مجیرے بجانے والوں کی تعداد میں کمی بیشی ہو جایا کرتی تھی۔ جو اور کچھ نہ کر سکتا وہ مجیرا ہی بجاتا تھا۔ سُورداس اِس مجلس کی ناک تھا۔ ڈھول۔ مجیرے۔ کرتال۔ سارنگی۔ طنبورہ سبھی میں اس کو یکساں مہارت تھی اور گانے میں تو آس پاس کے کئی محلوں میں اُس کا جواب نہ تھا۔ ٹھمری، غزل سے اُس کو رغبت نہ تھی۔ کبیر۔ میرا۔ دادو۔ کمال پلٹو وغیرہ صوفیوں کے بھجن گاتا تھا۔ اُس وقت اُس کا چہرہ خوشی سے کھلا جاتا تھا۔ گاتے گاتے مست ہو جاتا۔ تن بدن کی سُدھ نہ رہتی سارے تفکرات و تردداتِ بھگتی کے اتھاہ ساگر میں ڈوب جاتے تھے۔

سُورداس مِٹھو کو لئے ہوئے پہنچا تو مجلس آراستہ ہو چکی تھی جملہ ارکان جمع تھے۔ صرف میرِ مجلس کی کمی تھی۔ سُورداس کو دیکھتے ہی نایک رام نے کہا "تم نے بڑی دیر کر دی۔ آدھ گھنٹہ سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ لونڈا اسی طرح تمہارے گلے پڑا ہے۔ کیوں نہیں ہمارے ہی گھر سے کچھ مانگ کر اسے کھلا دیا کرتے؟

دیاگر۔ یہاں چلا آیا کرے تو ٹھاکر جی کے پرشاد ہی سے پیٹ بھر جائے۔

سُور داس - تمہیں لوگوں کا دیا کھاتا ہے یا اور کسی کا ؟ مَیں تو بتانے بھر کو ہوں ۔
جگدھر - لڑکوں کو اتنا سر چڑھانا اچھا نہیں ۔ گود میں لادے پھرتے ہو جیسے کوئی ننھا سا لڑکا ہو ۔ میرا ودیا دھر اس سے دو سال چھوٹا ہے ۔ میں اس کو کبھی گود میں لے کر نہیں پھرتا ۔
سُور داس - بِنا ماں باپ کے لڑکے ضِدی ہو جاتے ہیں ۔ ہاں کیا ہو گا ؟
دیا گر - پہلے رامائن کی ایک چوپائی ہو جائے ۔
حاضرین نے اپنے اپنے ساز سنبھالے ۔ سُر مِلا اور آدھ گھنٹہ تک رامائن ہوتی رہی ۔
نایک رام - واہ سُورداس واہ ! اب تمہارے ہی دم کا ظہورا ہے ۔
بجرنگی - میری تو کوئی دونوں آنکھیں لے لے اور یہ ہنر مجھے دے دے تو میں خوشی سے بدل لوں ۔
جگدھر - ابھی بھیرو نہیں آیا ۔ اس کے بِنا رنگ نہیں جمتا ۔
بجرنگی - تاڑی بیچتا ہو گا ۔ پیسہ کا لالچ بُرا ہوتا ہے ۔ گھر میں ایک عورت ہے اور ایک بُڑھیا ماں ۔ پَر رات دن ہائے ہائے پڑی رہتی ہے ۔ کام کرنے کو تو دن ہے ہی ۔ بھلا رات کو تو بھگوان کا بھجن ہو جائے ۔
جگدھر - سُورداس کا دَم اُکھڑ جاتا ہے ۔ اُس کا دم نہیں اُکھڑتا ۔
بجرنگی - تم اپنا کھونچہ بیچو ۔ تمہیں کیا معلوم کہ دَم کِس کو کہتے ہیں ؟ سُورداس جتنا دم سادھتے ہیں اُتنا کوئی دوسرا سادھے تو کلیجہ پھٹ جائے ۔ کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے ۔

جگدھر۔ اچھا بھیا! سورداس کے برابر دنیا میں کوئی دم نہیں سادھ سکتا۔ اب خوش ہوئے؟

سورداس۔ بھیا! اس میں جھگڑا کاہے کا؟ میں کب کہتا ہوں کہ مجھے گانا آتا ہے؟ تم لوگوں کا حکم پاکر جیسا بھلا برا بنتا ہے۔ سنا دیتا ہوں۔

اتنے میں بھیرو بھی آکر بیٹھ گیا۔ بجرنگی نے طنز سے کہا۔ "کیا اب کوئی تاڑی پینے والا نہیں تھا؟ اتنی جلد دوکان کیوں بڑھا دی؟"

ٹھاکردین۔ معلوم نہیں ہاتھ پیر بھی دھوئے ہیں یا وہاں سے سیدھے ٹھاکر جی کے مندر میں چلے آئے۔ اب صفائی تو کہیں رہی نہیں گئی۔

بھیرو۔ کیا میری دیہہ میں تاڑی پوتی ہوئی ہے؟

ٹھاکردین۔ بھگوان کے دربار میں اس طرح نہ آنا چاہئے۔ ذات چاہے اونچی ہو یا نیچی پر صفائی چاہئے ضرور۔

بھیرو۔ تم یہاں روز نہاکر آتے ہو؟

ٹھاکردین۔ پان بیچنا کوئی نیچ کام نہیں ہے۔

بھیرو۔ جیسے پان ویسے تاڑی۔ پان بیچنا کوئی اونچا کام نہیں ہے۔

ٹھاکردین۔ پان بھگوان کے بھوگ کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے جنیودھاری میرے ہاتھ کا پان کھاتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کا تو کوئی پانی نہیں پیتا۔

نایک رام۔ ٹھاکردین! یہ بات تو تم نے بڑی کھری کہی۔ سچ تو ہے۔ پاسی سے کوئی گھڑے تک نہیں چھوتا۔

بھیرو۔ ہماری دوکان پر ایک دن آکر بیٹھ جاؤ تو دکھاؤں کہ کیسے

کیسے دھرماتما اور مہاتما آتے ہیں۔ سادھو مہاتماؤں کو بھی کسی نے پان کھاتے دیکھا ہے۔ تاڑی گانجہ چرس پیتے ہوئے جب چاہیے۔ دیکھ لو۔ ایک سے ایک مہاتما آکر خوشامد کرتے ہیں ٭

نایک رام۔ ٹھاکردین! اب اس کا جواب دو۔ بھیرو پڑھا لکھا ہوتا تو وکیلوں کے کان کاٹتا ٭

بھیرو۔ میں تو بات سچی کہتا ہوں۔ جیسے تاڑی ویسے پان۔ بلکہ پرات کی تاڑی کو تو لوگ دوا کی طرح پیتے ہیں ٭

جگدھر۔ یارو! دو ایک بھجن ہونے دو۔ مان کیوں نہیں جاتے۔ ٹھاکردین؟ تمہیں ہارے۔ بھیرو جیتا سہی۔ چلو چھٹی ہوئی ٭

نایک رام۔ واہ۔ ہار کیوں مان لیں؟ سا سنترا نتھ ہے کہ دل لگی ہاں ٹھاکردین! کوئی جواب سوچو ٭

ٹھاکردین۔ میری دوکان پر کھڑے ہو جاؤ۔ جی خوش ہو جائے کیوڑہ اور گلاب کی خوشبو اُڑتی ہے۔ اس کی دوکان پر کوئی جائے تو بدبو کے مارے ناک پھٹنے لگتی ہے۔ کھڑا نہیں رہا جاتا۔ تا بدان میں بھی ایسی بدبو نہ ہوتی ہوگی ٭

بجرنگی۔ مجھے تو گھنٹہ بھر کے لئے راج مل جاتا۔ تو سب سے پہلے شہر بھر کی تاڑی کی دوکانوں میں آگ لگوا دیتا ٭

نایک رام۔ اب بتاؤ بھیرو! اس کا جواب دو۔ بدبو تو سچ مچ اُڑتی ہے۔ ہے کوئی جواب؟

بھیرو۔ جواب ایک نہیں سینکڑوں ہیں۔ پان سڑ جاتا ہے تو کوئی مٹی کے مول بھی نہیں پوچھتا۔ یہاں تاڑی جتنی سڑتی ہے اُتنا ہی

اُس کا مول بڑھتا ہے۔ سرکہ بن جاتی ہے تو ردپے بوتل بکتی ہے اور بڑے بڑے جینو دھاری لوگ کھاتے ہیں ۔

نایک رام۔ کیا بات کہی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ میرا اختیار ہوتا تو اسی دم تم کو وکالت کی سند دے دیتا۔ ٹھاکر دین! اب ہار مان جاؤ بھیرو سے پیش نہ پا سکو گے ۔

جگدھر۔ بھیرو! تم چپ کیوں نہیں ہو جاتے؟ پنڈا جی کو تو جانتے ہو۔ دوسروں کو لڑا کر تماشہ دیکھنا ان کا کام ہے۔ اتنا کہہ دینے میں کون سی مرجاد گھٹی جاتی ہے کہ بابا تم جیتے اور میں ہارا ۔

بھیرو۔ کیوں اتنا کہہ دوں؟ بات کہنے میں کسی سے کم ہوں کیا؟

جگدھر۔ تو ٹھاکر دین! تمہیں چپ ہو جاؤ ۔

ٹھاکر دین۔ ہاں جی! چپ نہ ہو جاؤں گا تو کیا کروں گا؟ یہاں آئے تھے کہ کچھ بھجن کیرتن ہوگا۔ بے فائدہ کا جھگڑا کرنے لگے۔ پنڈا جی کو کیا۔ انہیں تو بے ہاتھ پیر ہلائے امرتیاں اور لڈو کھانے کو ملتے ہیں۔ ان کو اسی طرح کی دل لگی سوجھتی ہے۔ یہاں تو پہر رات سے اٹھ کر پھر چکی میں جتنا ہے ۔

جگدھر۔ میری تو اب کی بھگوان سے بھینٹ ہوگی تو کہوں گا کہ کسی پنڈے کے گھر جنم دینا ۔

نایک رام۔ بھیا! مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ دبلا پتلا آدمی ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جل پان کے لئے تمہارے ہی کھونچے سے مٹھائیاں لیا کروں۔ مگر اس پر اتنی مکھیاں اڑتی ہیں۔ اور اوپر اتنا میل جما رہتا ہے کہ کھانے کو جی نہیں چاہتا ۔

جگدھر۔ (چڑ کر) تمہارے نہ لینے سے میری مٹھائیاں سڑ تو نہیں جاتیں کہ بھوکوں مرتا ہوں؟ دن بھر میں روپے بیس آنہ بنا ہی لیتا ہوں۔ جس کو محنت میں رس گلّے مل جائیں وہ میری مٹھائیاں کیوں لے گا؟
ٹھاکر دین۔ پنڈا جی کی آمدنی کا کوئی ٹھکانا ہے؟ جتنا روز مل جائے تھوڑا ہی ہے۔ اور اوپر سے بھوجن کھاتے ہیں۔ کوئی آنکھ کا اندھا۔ گانٹھ کا پورا پھنس گیا تو ہاتھی۔ گھوڑے۔ جگہ۔ زمین۔ سب دے گیا ایسا بھاگوان اور کون ہوگا؟
دیاکر۔ کہیں نہیں۔ ٹھاکر دین! اپنی محنت کی کمائی سب سے اچھی پنڈوں کو جاتریوں کے پیچھے دوڑتے نہیں دیکھا ہے؟
نایک رام۔ بابا! اگر کوئی کمائی پسینہ کی ہے تو وہ ہماری ہے۔ ہماری کمائی کا حال بجرنگی سے پوچھو۔
بجرنگی۔ اور وں کی کمائی پسینہ کی ہوتی ہوگی۔ تمہاری کمائی تو خون کی ہے۔ اور لوگ پسینہ بہاتے ہیں۔ تم خون بہاتے ہو! ایک ایک ججمان کے پیچھے لہو کی ندی بہہ جاتی ہے۔ جو لوگ کھونچہ سامنے رکھ کر دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں وہ کیا جانیں۔ تمہاری کمائی کیسی ہوتی ہے؟ ایک دن مورچہ تھامنا پڑے تو بھاگنے کو جگہ نہ ملے۔
جگدھر۔ چلو بھی! آئے ہو منہ دیکھی کہنے۔ سیر بھر دودھ کا ڈھائی سیر بناتے ہو اس پر بھگوان کے بھگت بنتے ہو۔
بجرنگی (غصہ سے) اگر کوئی مائی کا لال میرے دودھ میں ایک بوند پانی نکال دے تو اس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ یہاں دودھ میں پانی ملانا گوہتیا سمجھتے ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ تیل کی مٹھائی کو گھی کی کہہ کر

بیچیں اور بھولے بھالے بچوں کو ٹھگیں ؂

جگدھر۔ اچھا بھائی! تم جیتے اور میں ہارا۔ تم سچے تمہارا دودھ سچا۔ بس ہم خراب۔ ہماری مٹھائیاں خراب۔ چلو چھٹی ہوئی ؂

بجرنگی۔ میرے مزاج کو تم نہیں جانتے۔ جتیا دیتا ہوں۔ سچ کہہ کر کوئی سو جوتے مارے لیکن جھوٹی بات سُن کر میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے ؂

بھیرو۔ بجرنگی! بہت بڑھ کر باتیں نہ کرو۔ اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بس مُنہ نہ کھلواؤ۔ میں نے بھی تمہارے یہاں کا دودھ پیا ہے۔ اُس سے تو میری تاڑی ہی اچھی ؂

ٹھاکردین۔ بھائی مُنہ سے جو چاہے ایمان دار بن لے پر اب دودھ سپنا ہوگیا۔ سارا دودھ جل جاتا ہے۔ ملائی کا نام نہیں۔ دودھ جب ملتا تھا تب ملتا تھا ایک آنچ میں اُنگل بھر موٹی ملائی پڑ جاتی تھی ؂

دیاگر۔ بچہ! ابھی بھلا بُرا کچھ مل تو جاتا ہے۔ وہ دن آ رہے ہیں کہ دودھ آنکھوں میں لگانے کو بھی نہ ملے گا ؂

بھیرو۔ حال تو یہ ہے کہ گھر والی سیر کا تین سیر بناتی ہے اس پر دعوٰی یہ کہ ہم سچا مال بیچتے ہیں۔ سچا مال بیچو تو دیوالہ نکل جاتے۔ یہ ٹھاٹھ ایک دن نہ چلے ؂

بجرنگی۔ پسینہ کی کمائی کھانے والوں کا دیوالہ نہیں نکلتا۔ دیوالہ اُن کا نکلتا ہے جو دوسروں کی کمائی کھا کھا کر موٹے پڑتے ہیں۔ بھاگ کو سرا ہو کہ شہر میں ہو۔ کسی گاؤں میں ہوتے تو مُنہ میں مکھیاں آتیں جاتیں۔ میں تو اُن سبھوں کو پاپی سمجھتا ہوں جو آونے پونے کرکے اِدھر کا سودا

اُدھر بیچ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ سچی کمائی اُنہیں کی ہے جو چھاتی پھاڑ کر دھرتی سے دَھن نکالتے ہیں ❊

بجرنگی نے بات تو کہہ ڈالی لیکن شرمندہ ہو گیا۔ اِس لپیٹ میں وہاں کے سبھی آدمی آجاتے تھے۔ وہ بھیرو جگدھر اور ٹھاکردین کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن سورداس۔ نایک رام۔ دیاگر سبھی پاپیوں کے درجہ میں آ گئے ❊

نایک رام۔ تب تو بھیّا! تم ہمیں بھی لے بیٹھے۔ ایک پاپی تو میں ہی ہوں کہ سارا دن مٹر گشت کرتا ہوں اور وہ بھوجن کرتا ہوں کہ بڑے بڑوں کو میسّر نہ ہو ❊

ٹھاکردین۔ دوسرا پاپی میں ہوں کہ شوق کی چیز بیچ کر روٹیاں کماتا ہوں۔ سنسار میں تمبولی نہ رہیں تو کس کا نقصان ہو گا؟

جگدھر۔ تیسرا پاپی میں ہوں کہ دن بھر اُون پَون کرتا رہتا ہوں۔ سیو اور خرمے کھانے کو نہ ملیں تو کوئی مر نہ جائے گا ❊

بھیرو۔ سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ سب کو نشہ پلا کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ سچ پوچھو تو اِس سے بُرا کوئی کام نہیں۔ آٹھوں پہر نشہ بازوں کا ساتھ۔ اُنہیں کی باتیں سُننا اُنہیں کے بیچ میں رہنا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

دیاگر۔ کیوں بجرنگی؟ سادھو مہاتما تو سب سے بڑے پاپی ہوں گے کہ وہ کچھ نہیں کرتے ❊

بجرنگی۔ نہیں بابا۔ بھگوان کے بھجن سے بڑھ کر کون کام ہو گا؟ رام نام کی کھیتی سب کاموں سے بڑھ کر ہے ❊

نایک رام۔ تو یہاں اکیلے بجرنگی پلیا تما ہے۔ اور سب کے سب پاپی ہیں؟

بجرنگی۔ سچ پوچھو تو سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ گایوں کا پیٹ کاٹ کر ان کے بچھڑوں کو بھوکوں مار کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔

سُور داس۔ بھائی! کھیتی سب سے اُتم ہے (بان رتجارت) اُس سے مدھم ہے۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ آن کو پاپ کیوں کہتے ہو؟ اور کیوں پاپی بنتے ہو؟ ہاں چاکری بُری ہے۔ چاہو تو اُس کو پاپ کہو اب تک تو تمہارے اوپر بھگوان کی دَیا ہے۔ اپنا اپنا کام کرتے ہو۔ مگر ایسے بُرے دن آ رہے ہیں جب تمہیں سیوا او ٹہل کر کے پیٹ پالنا پڑے گا۔ جب تم اپنے نوکر نہیں پرائے کے نوکر ہو جاؤ گے۔ جب تم میں نتیہ دھرم کا نشان بھی نہ رہے گا۔

سُور داس نے یہ باتیں نہایت متانت کے ساتھ کہیں۔ جیسے کوئی رِشی پیشینگوئی کر رہا ہو۔ سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔ ٹھاکر دین نے متفکر ہو کر پوچھا "کیوں سور داس! کوئی مصیبت آنے والی ہے کیا؟ مجھے تو تمہاری باتیں سن کر ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی نئی مصیبت تو نہیں آ رہی ہے؟

سور داس۔ ہاں لچھن تو دکھائی دیتے ہیں۔ چمڑے کے گودام والا صاحب یہاں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے جا رہا ہے۔ میری زمین مانگ رہا ہے۔ کارخانہ کا کھلنا ہی ہمارے اوپر مصیبت کا آنا ہے۔

ٹھاکر دین۔ تو جب یہ جانتے ہی ہو تو کیوں اپنی زمین دیتے ہو؟

سُور داس۔ میرے دینے پر تھوڑا ہی ہے۔ بھائی! میں دوں تو بھی

زمین نکل جائے گی۔ نہ دوں تو بھی نکل جائے گی۔ روپے والے سب کچھ کر سکتے ہیں ۔

بجرنگی۔ صاحب روپے والے ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ ہماری زمین کیا کھا کر لے لیں گے ؟ ماتھے گر جائیں گے ماتھے اٹھنا نہیں ہے ۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سید طاہر علی آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور نایک رام سے بولے "پنڈا جی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا ادھر چلے آئیے ۔

بجرنگی۔ اُسی زمین کے بارہ میں کچھ بات چیت کرنی ہے نا؟ وہ زمین نہ بکے گی ۔

طاہر علی۔ میں تم سے تھوڑا ہی پوچھتا ہوں۔ تم اُس زمین کے مالک مختار نہیں ہو ۔

بجرنگی۔ کہہ تو دیا۔ وہ زمین نہ بکے گی۔ مالک مختار کوئی ہو ۔

طاہر علی۔ آئیے پنڈا جی آپ! انہیں بکنے دیجئے ۔

نایک رام۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہئے۔ یہ سب لوگ اپنے ہی ہیں۔ کسی سے پردا نہیں ہے۔ سُنیں گے تو سب سُنیں گے اور جو بات طے ہو گی۔ سب کی صلاح سے ہو گی۔ کہئے کیا کہتے ہیں ؟

طاہر علی۔ اُسی زمین کے بارہ میں بات چیت کرنی تھی ۔

نایک رام۔ تو اُس زمین کا مالک آپ کے سامنے بیٹھا ہُوا ہے جو کچھ کہنا ہے اُسی سے کیوں نہیں کہتے۔ مجھے بیچ میں دلالی نہیں کھانی ہے۔ جب سور داس نے صاحب کے سامنے انکار کر دیا تو پھر کون سی

ت باقی رہ گئی؟
بجرنگی۔ اُنہوں نے سوچا ہوگا کہ پنڈا جی کو بیچ میں ڈال کر کام نکال
یں گے۔ صاحب سے کہہ دینا۔ یہاں صاحبی نہ چلے گی +
طاہر علی۔ تم اہیر ہونا۔ جبھی اتنے گرم ہو رہے ہو۔ ابھی صاحب کو
جانتے نہیں ہو۔ جبھی بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے ہو۔ جس وقت صاحب
زمین لینے پر آ جائیں گے۔ لے ہی لیں گے۔ تمہارے روکے نہ رکیں
گے۔ جانتے ہو۔ شہر کے حاکموں سے اُن کا کتنا میل جول ہے۔ ان کی
لڑکی کی منگنی حاکم ضلع سے ہونے والی ہے۔ اُن کی بات کو کون ٹال
سکتا ہے؟ سیدھے سے رضامندی کے ساتھ دے دوگے۔ تو اچھے
دام پا جاؤگے۔ شرارت کروگے تو زمین بھی نکل جائے گی اور کوڑی
بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ ریلوں کے مالک کیا زمین اپنے ساتھ لائے تھے؟
ہماری ہی زمین تو لی ہے۔ کیا اُسی قاعدے سے یہ زمین نہیں نکل سکتی؟
بجرنگی۔ تمہیں بھی کچھ طے کرائی ملنے والی ہوگی۔ جبھی اتنی خیر خواہی
کر رہے ہو!
جگدھر۔ اُن سے جو کچھ ملنے والا ہو وہ ہمیں سے لے لیجئے اور اُن سے
کہہ دیجئے کہ زمین نہ ملے گی۔ آپ لوگ جھانسہ باز ہیں۔ ایسا جھانسہ دیجئے
کہ صاحب کی عقل گم ہو جائے +
طاہر علی۔ میری خیر خواہی روپیے کے لالچ سے نہیں ہے۔ اپنے مالک
کی آنکھ بچا کر ایک کوڑی بھی لینا حرام سمجھتا ہوں۔ خیر خواہی اس لئے کرتا
ہوں کہ ان کا نمک کھاتا ہوں +
جگدھر۔ اچھا صاحب بھول ہوئی معاف کیجئے۔ میں نے تو سنسار کے

چلن کی بات کہی تھی ۔

طاہر علی۔ تو شوورداس! میں صاحب سے جاکر کیا کہہ دوں؟

شووَرداس۔ بس یہی کہہ دیجئے کہ زمین نہ بکے گی ۔

طاہر علی۔ میں پھر کہتا ہوں۔ دھوکا کھاؤ گے۔ صاحب زمین کو لے کر چھوڑیں گے ۔

شووَرداس۔ میرے جیتے جی تو زمین نہ ملے گی۔ ہاں مر جاؤں تو بھلے ہی مل جائے ۔

طاہر علی چلے گئے تو بھیرو بولا "دُنیا اپنا ہی فائدہ دیکھتی ہے۔ اپنا کلیان ہو۔ دوسرے جئیں یا مریں۔ بجرنگی! تمہاری تو گائیں چرتی ہیں۔ اس لئے تمہاری بھلائی تو اسی میں ہے کہ زمین بنی رہے۔ میری کون گائے چرتی ہے؟ کارخانہ کھلا تو میری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ یہ بات تمہارے دھیان میں کیوں نہیں آتی؟ تم سب کی طرف سے وکالت کرنے والے کون ہو؟ شووَرداس کی زمین ہے۔ وہ بیچے یا رکھے تم کون ہوتے ہو بیچ میں کُودنے والے؟

نایک رام۔ ہاں بجرنگی۔ جب تم سے کوئی واسطہ سروکار نہیں ہے تو تم کون ہوتے ہو بیچ میں کودنے والے؟ بولو! بھیرو کا جواب دو۔

بجرنگی۔ واسطہ سروکار کیسے نہیں؟ دس گاؤں اور محلے کے جانور یہاں چرنے آتے ہیں۔ وہ کہاں جائیں گے۔ صاحب کے گھر؟ بھیرو کے ونہیں تو اپنی دوکان کی ہائے ہائے پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے گھر سیند کیوں نہیں مارتے۔ جلدی سے دھنوان ہو جاؤ گے ۔

بھیرو۔ سیند مارو تم۔ یہاں دودھ میں پانی نہیں ملاتے ۔

دیاگر۔ بھیرو! تم سچ مچ بڑے جھگڑالو ہو۔ جب تم کو ملائم بات کہنا نہیں آتا تو چپ کیوں نہیں رہتے؟ بہت باتیں کرنا عقلمندی کی نشانی نہیں بلکہ بے عقلی کی نشانی ہے ؞

بھیرو۔ ٹھاکر جی کے بھوگ کے بہانہ سے روز چھاچھ پا جاتے ہو نا؟ بجر نگی کی جے کیوں نہ مناؤ گے ؞

نایک رام۔ بیٹھا بات بے لاگ کہتا ہے کہ ایک بار سُن کر پھر کسی کی زبان نہیں کھلتی ؞

ٹھاکر دین۔ اب بھجن بھاؤ ہو چکا۔ ڈھول مجیرا اُٹھا کر رکھ دو؛

دیاگر۔ تم کل سے یہاں نہ آیا کرو۔ بھیرو!

بھیرو۔ کیوں نہ آیا کریں؟ مندر تمہارا بنوایا ہوا نہیں ہے۔ مندر بھگوان کا ہے۔ تم کسی کو بھگوان کے دربار میں آنے سے روک دو گے؟

نایک رام۔ لو باباجی! اور لو گے؟ ابھی پیٹ بھرا کہ نہیں؟

جگدھر۔ باباجی! تمہیں غم کھا جاؤ۔ اس سے سادھو سنتوں کی مہیا نہیں گھٹتی۔ بھیرو! سادھو سنتوں کی بات کا تمہیں بڑا نہ ماننا چاہئے

بھیرو۔ تم خوشامد کرو۔ کیونکہ خوشامد کی روٹیاں کھاتے ہو۔ یہاں کسی کے دبیل نہیں ہیں ؞

بجر نگی۔ لے اب چپ ہی رہنا۔ بھیرو! بہت ہو چکا۔ چھوٹا منہ بڑی بات ؞

نایک رام۔ تو بھیرو کو دھمکاتے کیا ہو؟ کیا کوئی بھگوڑا سمجھ لیا ہے؟ تم نے جب دنگل مارے تھے تب مارے تھے۔ اب تم وہ نہیں ہو۔ آج کل تو بھیرو کی دوہائی ہے ؞

بھیرو نایک رام کے طنز یہ مذاق پر جھلا یا نہیں ہنس پڑا۔ طنز میں زہر نہیں۔ رس تھا بشکھیا مر کر رس ہو جاتا ہے۔

بھیرو کا ہنسنا تھا کہ لوگوں نے اپنے اپنے ساز سنبھالے اور بھجن ہونے لگا۔ سورداس کی سُریلی تان خلا میں یوں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جیسے پانی کے اندر روشنی کی شعاعیں ناچتی ہیں:۔

(بھجن)

جھینی جھینی بینی چدریا

کاہے کا تانا کاہے کی بھرنی، کون تار سے بینی چدریا
اِنگلا پنگلا تانا بھرنی، سکھمن تار سے بینی چدریا
آٹھ کنول دل چرکھا ڈولے، پانچ تتّو، گن تینی چدریا
سائیں کو سیت ماس دس لاگے، ٹھوک ٹھوک کے بینی چدریا
سو چادر سُر نر مُن اوڑھیں، اوڑھ کے میلی کینی چدریا
داس کبیر جتن سے اوڑھی، جیوں کی تیوں دھر دینی چدریا

باتوں میں رات زیادہ گزر چکی تھی۔ گیارہ کا گھنٹہ سُنائی دیا۔ لوگوں نے ڈھول مجیرے سمیٹ دیئے۔ مجلس برخاست ہوئی۔ سورداس نے مٹھو کو پھر گود میں اُٹھایا اور اپنی جھونپڑی میں لاکر ٹاٹ پر سُلا دیا۔ آپ زمین پر لیٹ رہا۔

(۳)

مسٹر جان سیوک کا بنگلہ سگرا میں تھا۔ اُن کے والد مسٹر ایشور سیوک نے فوجی محکمہ سے پنشن پانے کے بعد وہیں مکان بنوا لیا تھا۔ اور اب تک اُس کے مالک تھے۔ اس کے آگے اُن کے آبا و اجداد کا پتہ

نہیں چلتا اور نہ ہمیں اُس کے جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ ہاں
یہ امر البتہ یقینی ہے کہ حضرت عیسیٰ پر اعتقاد لانے کا شرف ایشور سیوک
کو نہیں بلکہ اُن کے والد کو ملا تھا۔ ایشور سیوک کو اب بھی اپنا عہد طفولیت
کچھ کچھ یاد آجاتا تھا۔ جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو
جایا کرتے تھے۔ ماں کی لاش جلانے کی یاد بھی ابھی نہیں بھولی تھی۔
والدہ کے انتقال کے بعد اُن کو یاد آتا تھا کہ میرے گھر میں کئی فوجی
سپاہی گھس آئے تھے۔ اور میرے والد کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس
کے بعد یادداشت کا سلسلہ شکست ہو جاتا تھا۔ ہاں اُن کے گورے
رنگ و شباہت سے اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ کہ وہ
عالی نسب تھے اور شاید اسی صوبہ میں اُن کی قدیم جائے رہایش بھی تھی۔
یہ بنگلہ جس زمانہ میں بنا تھا اُس وقت شملہ میں زمین کی اتنی
قدر نہ تھی۔ وسیع احاطہ میں پھول پتّوں کی جگہ سبزی ترکاری اور
پھلوں کے درخت تھے۔ یہاں تک کہ گملوں میں بھی نفع کو نفاست پر
ترجیح دی گئی تھی۔ بیلیں۔ پرول کند روسیم وغیرہ کی تھیں۔ ایک کنارے
کھپریل کا برآمدہ تھا۔ جس میں گائیں بھینسیں پلی ہوئی تھیں۔ دوسری
طرف اصطبل تھا۔ موٹر کا شوق نہ باپ کو تھا۔ نہ بیٹے کو۔ ٹمٹم رکھنے
میں کفایت بھی تھی۔ اور آسایش بھی۔ ایشور سیوک کو تو موٹروں سے
چڑ تھی اُن کے شور سے اُن کی شانتی میں خلل واقع ہوتا تھا۔ ٹمٹم کا
گھوڑا احاطہ میں ایک لمبی رسّی سے باندھ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اصطبل
سے باغ کے لئے کھاد نکل آتی تھی اور صرف ایک سائیس سے کام چل
جاتا تھا۔ ایشور سیوک کو خانہ داری کے انتظامات میں خاص ملکہ تھا۔

اور ایسے کاموں میں اُن کا حوصلہ ذرا بھی پست نہ ہوتا تھا اُن کی آرام کُرسی بنگلے کے سائبان میں پڑی رہتی تھی۔ اس پر وہ صبح سے شام تک بیٹھے جان سیوک کی فضول خرچی اور گھر کی بربادی کا رونا رویا کرتے تھے۔ وہ اب بھی باقاعدگی کے ساتھ اپنے لڑکے کو گھنٹہ دو گھنٹہ نصیحت کیا کرتے تھے۔ اور شاید اسی نصیحت کا پھل تھا کہ جان سیوک کی دولت اور عزت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کفایت اُن کی زندگی کا اصل اصول تھا اور اس کی خلاف ورزی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اپنے گھر میں فضول خرچی مطلق نہ دیکھ سکتے تھے۔ خواہ روپیہ کسی مہمان ہی کا کیوں نہ ہو۔ مذہب کے ایسے پکے تھے کہ بلا ناغہ دونوں وقت گرجا جاتے۔ اُن کی اپنی الگ سواری تھی۔ اس تامجان کو ایک آدمی کھینچ کر گرجا کے دروازہ تک پہنچا آیا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایشر سیوک اس کو فوراً ہی گھر واپس کر دیتے تھے۔ گرجا کے احاطہ میں تامجان کی حفاظت کے لئے کسی آدمی کو بیٹھے رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر گھر آ کر وہ آدمی اور کوئی کام کر سکتا تھا۔ اکثر وہ واپس کرتے وقت اُس کو کام بھی بتلا دیا کرتے تھے۔ دو گھنٹہ کے بعد وہ آدمی جا کر اُن کو واپس کھینچ لاتا تھا۔ لوٹتے ہوئے وہ حتی الامکان خالی ہاتھ نہ لوٹتے تھے۔ کبھی دو چار پپیتے مل جاتے کبھی نارنگیاں۔ کبھی سیر آدھ سیر مکوے پادری اُن کا بہت احترام کرتا تھا۔ اُس کی ساری اُمت میں اتنا مسن اور دوسرا شخص نہ تھا۔ اُس پر دھرم کا اتنا شیدائی۔ وہ اُس کے مواعظ کو جتنی محویت اور توجہ سے سُنتے تھے اور جتنی عقیدت سے وہاں کے بھجنوں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ معیار کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ٭

صبح کا وقت تھا۔ یہ لوگ ناشتہ کی میز پر سے اُٹھے۔ مسٹر جان سیوک نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ ایشور سیوک نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے چائے کا ایک پیالہ پیا تھا اور جھنجھلا رہے تھے کہ اس میں شکر کیوں اتنی جھونک دی گئی ہے۔ شکر کوئی نعمت تو نہیں کہ پیٹ بھر کر کھائی جائے۔ ایک تو مشکل سے ہضم ہوتی ہے دوسرے اتنی مہنگی۔ اس کی نصف شکر چائے کو مزے دار بنانے کے لئے کافی تھی۔ اندازہ سے کام کرنا چاہیئے۔ شکر کوئی پیٹ بھرنے کی چیز نہیں ہے۔ سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں پر میری سُنتا کون ہے؟ مجھے تو سب نے کُتا سمجھ رکھا ہے۔ اُس کے بھونکنے کی پرواہ کس کو ہے؟

مسز سیوک نے مذہبیت اور کفایت کا سبق خوب یاد کر رکھا تھا۔ ندامت کا اظہار کرتی ہوئی بولیں "پاپا! معاف کیجئے آج صوفی نے شکر زیادہ ڈال دی تھی۔ کل سے آپ کو یہ شکایت نہ رہے گی۔ مگر کروں کیا؟ یہاں تو ہلکی چائے کسی کو اچھی نہیں لگتی"۔ ایشور سیوک نے بے اعتنائی سے کہا "مجھے کیا کرنا ہے۔ کچھ قیامت تک تو بیٹھا رہوں گا نہیں مگر گھر کی بربادی کی یہی علامتیں ہیں۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا"!

مسز سیوک۔ پاپا! میں اپنی بھول مانتی ہوں۔ مجھے اندازہ سے شکر نکال کر دینی چاہئے تھی :-

ایشور سیوک۔ ارے تو آج یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ روز تو یہی رونا رہتا ہے۔ جان سمجھتا ہے میں گھر کا مالک ہوں۔ روپے کماتا ہوں۔ خرچ کیوں نہ کروں؟ مگر روپیہ کمانا ایک بات ہے اور اُس کا مناسب صرف دوسری بات۔ ہوشیار آدمی اُس کو کہتے ہیں جو دولت

کا مناسب صرف کرے۔ اِدھر سے لا کر اُدھر خرچ کر دیا تو کیا فائدہ؟ اس سے تو نہ لانا ہی اچھا۔ میں سمجھاتا ہی رہا مگر اتنی کلاں راس کا گھوڑا لے لیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟ تمہیں گھوڑ دوڑ نہیں کرنا ہے۔ ایک ٹٹو سے کام چل سکتا تھا۔ یہی نا کہ اوروں کے گھوڑے آگے نکل جاتے تو اس میں تمہاری کیا شیخی ماری جاتی تھی؟ کہیں دور جانا نہیں پڑتا۔ ٹٹو ہوتا تو چھ سیر کی جگہ دو سیر دانہ کھاتا۔ آخر چار سیر دانہ فضول ہی جاتا ہے نا؟ مگر میری کون سنتا ہے۔ یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! صوفی! یہاں آ بیٹی! کلامِ پاک سنا!

صوفیہ پربھو سیوک کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی مسیح کے اس ارشاد پر اپنا شبہ ظاہر کر رہی تھی۔ کہ غریبوں کے لئے آسمان کی بادشاہت ہے اور امیروں کا بہشت میں جانا اُسی قدر غیر ممکن ہے جتنا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں جانا۔ اُس کے دل میں سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا غریب ہونا بجائے خود کوئی ثواب ہے اور امیر ہونا بجائے خود کوئی گناہ؟ اس کی عقل سلیم اس کلام کی سچائی کو قبول نہ کرتی تھی۔ کیا مسیح نے صرف اپنے بھگتوں کو خوش کرنے ہی کے لئے دولت کی اس قدر ہجو کی ہے؟ تاریخ بتلا رہی ہے کہ اوائل میں صرف غریب۔ رنجیدہ، مفلس اور جماعت سے خارج شدہ آدمیوں نے ہی مسیح کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اس لئے تو انھوں نے دولت کی اتنی بے وقعتی نہیں کی تھی؟ کتنے ہی غریب ایسے ہیں جو سراپا بے قاعدگی اور بداخلاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شاید ان کی بدکاری ہی اُن کی مفلسی کا سبب ہے۔ کیا صرف مفلسی اُن کے تمام گناہوں کا کفارہ کر دے گی؟ کتنے ہی دولت مند لوگ ہیں جن کے دل

آئینہ کی طرح صاف ہے۔ کیا محض اُن کی ثروت اُن کے تمام نیکیوں کو زائل کر دے گی؟

صوفیہ سچ جھوٹ کی جانچ میں ہمیشہ مصروف رہتی تھی۔ مذہبی اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر کسنا اُس کی فطرت میں داخل تھا اور جب تک عقل۔ دلایل کے ذریعہ قبول نہ کرے اُس وقت تک وہ صرف مذہبی کتب کی بنا پر کسی اصول کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ جب اُس کے دل میں کوئی شک پیدا ہوتا تو اپنے بھائی پربھوسیوک کی مدد سے اُس کے دفعیہ کی کوشش کرتی۔

صوفیہ۔ میں اس بارہ میں بہت دیر سے غور کر رہی ہوں پر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت مسیح نے مفلسی کو اس قدر اہمیت کیوں دی؟ اور دولت و ثروت کو کیوں قابل نفرین قرار دیا؟

پربھوسیوک۔ جا کر مسیح سے پوچھو۔

صوفیہ۔ تم کیا سمجھتے ہو؟

پربھوسیوک۔ میں کچھ نہیں سمجھتا اور نہ کچھ سمجھنا ہی چاہتا ہوں۔ کھانا سونا اور کھیلنا یہی انسانی زندگی کے تین اصول ہیں۔ ان کے سوا سب گورکھ دھندا ہے۔ میں مذہب کو عقل سے بالکل الگ سمجھتا ہوں۔ مذہب کے تولنے کے لئے عقل اُتنی ہی بیکار ہے۔ جتنا کہ بینگن تولنے کے لئے سنار کا کانٹا۔ مذہب مذہب ہے اور عقل عقل۔ یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یا پھر اُس میں ایسی زبردست تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ان جھگڑوں میں بے فائدہ سر کھپاتی ہو۔ سُنا! آج پاپا چلتے چلتے کیا کہہ گئے؟

صوفیہ۔ نہیں میرا دھیان اُدھر نہ تھا ۔

پرکھو سیوک۔ یہی کہ مشینوں کے لئے جلد آرڈر دے دو۔ اُس زمین کو لینے کا انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اُس کا موقع بہت پسند آیا۔ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد بنیاد پڑ جائے۔ لیکن میرا جی اس کام سے گھبراتا ہے۔ میں نے یہ کاروبار سیکھا تو پر سچ پوچھو تو میرا جی وہاں بھی نہ لگتا تھا۔ اپنا وقت فلسفہ ادب اور اشعار کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔ وہاں کے نامی گرامی عالموں اور مصنفوں سے بات چیت کرنے میں جو مسرت حاصل ہوتی تھی وہ کارخانہ میں کہاں نصیب تھی؟ سچ پوچھو تو میں اسی لئے وہاں گیا بھی تھا۔ اب عجیب کشمکش میں پڑا ہوں۔ اگر اس کام میں ہاتھ نہیں لگاتا تو پاپا کی دل شکنی ہوگی۔ وہ سمجھیں گے کہ میرے ہزاروں روپیوں پر پانی پھر گیا۔ شاید میری صورت سے نفرت کرنے لگیں۔ کام شروع کرتا ہوں تو یہ خوف ہوتا ہے۔ کہ کہیں میری بیدلی سے نفع کے بجائے نقصان نہ ہو۔ مجھے اس کام میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو رہنے کو ایک جھونپڑی چاہئے اور فلسفہ و ادب کا ایک عمدہ کتب خانہ۔ اس کے سوا مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں ۔ یہ لو دادا کو تمہاری یاد آگئی۔ جاؤ نہیں تو وہ یہاں آ پہنچیں گے اور فضول کی بکواس میں گھنٹوں وقت خراب کر دیں گے ۔

صوفیہ۔ یہ مصیبت میرے سر بُری پڑی ہے۔ جہاں کچھ پڑھنے بیٹھی ان کا بلاوا پہنچا۔ آج کل پیدائش کا بیان پڑھوا رہے ہیں۔ مجھے ایک ایک لفظ پر شک پیدا ہوتا ہے۔ کچھ بولوں تو بگڑ جائیں۔ بالکل بیگار کرنی پڑتی ہے ۔

مسز سیوک بیٹی کو بلانے آ رہی تھیں۔ آخری الفاظ اُن کے کانوں میں پڑ گئے۔ تلملا گئیں۔ آ کر بولیں:۔ بیشک کلام پاک پڑھنا بیکار ہے۔ مسیح کا نام لینا پاپ ہے۔ تجھے تو اُس اندھے بھکاری کی باتوں میں مزہ آتا ہے۔ ہندوؤں کے گپوڑے پڑھنے میں تیرا جی لگتا ہے۔ کلام پاک تو تیرے لئے زہر ہے۔ خدا جانے تیرے دماغ میں یہ خبط کہاں سے سما گیا ہے۔ جب دیکھتی ہوں۔ تجھے اپنے پاک مذہب کی بُرائی کرتے ہی دیکھتی ہوں۔ تو اپنے دل میں بھلے ہی سمجھ لے کہ کلام پاک بالکل فرضی و مصنوعی ہے لیکن اندھے کی آنکھوں میں اگر آفتاب کا نور نہ پہنچے تو یہ آفتاب کا قصور نہیں بلکہ اندھے کی آنکھوں ہی کا قصور ہے۔ آج تین چوتھائی دُنیا جس مہاتما کے نام پر جان دیتی ہے جس مہاتما کی امرت بانی آج ساری دنیا کو زندگی بخش رہی ہے اُس سے اگر تیرا دل منحرف ہو رہا ہے تو یہ تیری نافہمی اور بدبختی ہے۔ خدا تیرے حال پر رحم کرے!

صوفیہ۔ مہاتما عیسٰے کی شان میں میرے مُنہ سے کوئی نامناسب بات کبھی نہیں نکلی۔ میں اُنہیں دھرم تیاگ اور نیک خیالی کا اوتار سمجھتی ہوں۔ لیکن اُن پر ایمان لانے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ عقیدت مندوں نے اُن کے مواعظ میں جو ناواجب باتیں بھر دی ہیں یا اُن کی ذات سے جو معجزے منسوب کر رکھے ہیں۔ اُن پر بھی ایمان لاؤں۔ اور یہ زیادتی کچھ حضرت مسیح کے ساتھ ہی نہیں کی گئی بلکہ دُنیا کے سبھی مہاتماؤں کے ساتھ ایسا کیا گیا ہے *

مسز سیوک۔ تجھے کلام پاک کے ہر لفظ پر ایمان لانا ہوگا ورنہ تو اپنا شمار حضرت مسیح۔ کی بھیڑوں میں نہیں کر سکتی *

صوفیہ۔ تو میں اپنے کو بدرجۂ مجبوری اُن کی اُمت کے باہر سمجھوں گی کیونکہ بائبل کے ہر لفظ پر ایمان لانا میرے لئے ناممکن ہے ۔

مسز سیوک۔ تو کافر اور مردود ہے۔ حضرت مسیح تجھے کبھی معاف نہ کریں گے ۔

صوفیہ۔ اگر مذہبی تنگ خیالی سے دور رہنے کے سبب یہ نام دئیے جاتے ہیں تو مجھے اُن کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے ۔

مسز سیوک سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ ابھی تک اُنہوں نے اپنا قاتل وار نہ کیا تھا۔ ما متا ہاتھوں کو روکے ہوئے تھی۔ لیکن صوفیہ کی گستاخانہ بحث نے بالآخر اُن کے تحمل کا خاتمہ کر دیا۔ بولی "حضرت مسیح سے منحرف ہونے والے کے لئے اس گھر میں جگہ نہیں ہے"۔

پربھو سیوک۔ ماما! آپ سخت ظلم کر رہی ہیں۔ صوفیہ یہ کب کہتی ہے کہ مجھے حضرت مسیح پر اعتقاد نہیں ہے؟

مسز سیوک۔ ہاں وہ یہی تو کہہ رہی ہے۔ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔ کلام پاک پر ایمان نہ لانے کے اور کیا معنے ہو سکتے ہیں؟ اِس کو حضرت یسوع کے معجزوں پر شبہ اور اُن کے اخلاقی مواعظ پر شک ہے۔ یہ اُن کے کفارہ کی حقیقت کو نہیں مانتی۔ اُن کے پاک احکامات کو تسلیم نہیں کرتی ۔

پربھو سیوک۔ میں نے اِس کو حضرت یسوع کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا ۔

صوفیہ۔ میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات کو نہیں مانتی ۔

مسز سیلوک - میں تجھ کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی۔ اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی ۰

یہ کہہ کر وہ صوفیہ کے کمرہ میں گھس گئی اور اُس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کئی کتابیں اُٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینک دیں ۰ اُسی جوش میں اُنہیں پیروں سے کچلا اور پھر جا کر ایشور سیوک سے بولیں :" پاپا! آپ صوفی کو ناحق بُلا رہے ہیں - وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے "۰

مسٹر ایشور سیوک ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی چنگاری گر پڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے " کیا کہا ۔ صوفی حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے ؟ صوفی ؟"

مسز سیلوک - ہاں ہاں صوفی! کہتی ہے - مجھے اُن کے معجزوں اُن کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے ۰

ایشور سیوک (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہِ راست پر لا! کہاں ہے صوفی! مجھے اُس کے پاس لے چلو! میرے ہاتھ پکڑ کر اُٹھاؤ - خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر! میں اُس کے پیروں پر گروں گا - اُس سے منتیں کروں گا ۔ اُس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا ۔ مجھے اُس کے پاس لے چلو!

مسز سیلوک - میں سب کچھ کر کے ہار گئی - اُس پر خدا کا قہر ہے - میں اُس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی ۰

ایشور سیوک - بیٹی! ایسی باتیں نہ کرو - وہ میرے گوشت کا گوشت -

میرے خون کا خون۔ میری جان کی جان ہے! میں اُسے کلیجہ سے لگاؤں گا۔ یسوع نے کافروں کو سینہ سے لگایا تھا۔ سیاہ کاروں کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔ وہ میری صوفیا پر ضرور رحم کرے گا۔ یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا!

جب مسٹر سیوک لے اب بھی سہارا نہ دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اُٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ کے دروازہ پر آکر بولے ”بیٹی صوفی! کہاں ہے؟ اِدھر آ بیٹی! تجھے گلے سے لگاؤں۔ ہمارا یسوع خدا کا دولارا بیٹا تھا۔ غریبوں کا مددگار۔ کمزوروں کا محافظ۔ مفلسوں کا دوست۔ ڈوبتوں کا سہارا۔ گناہ گاروں کا شافع۔ دُکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا۔ بیٹی! ایسا اور کون سا نبی ہے جس کا دامن اتنا وسیع ہو۔ جس کی گود میں دنیا کے سارے گناہوں۔ ساری بُرائیوں کے لئے جگہ ہو؟ وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو کافروں کو۔ گناہگاروں کو نجات کا مژدہ دیا۔ نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لئے نجات کہاں تھی؟ ہم کو بچا لینے والا کون تھا؟“

یہ کہتے کہتے اُنھوں نے صوفیہ کو گلے سے لگا لیا۔ ماں کے سخت الفاظ نے اُس کے ضعیف غصّہ کو تیز کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں آکر رو رہی تھی۔ طبیعت بار بار پریشان ہو جاتی تھی۔ سوچتی تھی۔ ابھی اس وقت اس گھر سے نکل جاؤں۔ کیا اس وسیع دنیا میں میرے لئے جگہ نہیں ہے؟ میں کام کر سکتی ہوں۔ اپنا بوجھ آپ سنبھال سکتی ہوں ضمیر کی آزادی کا خون کر کے اگر مجھ کو تفکراتِ زندگی سے فراغت ملی تو کیا؟ میرا ضمیر ایسی حقیر شے نہیں ہے کہ پیٹ کے لئے اُس کا خون کر

دیا جائے۔ پر بھوسیوک کو اپنی بہن سے ہمدردی تھی۔ مذہب پر اُن کو اُس سے کہیں کم اعتقاد تھا۔ لیکن وہ اپنی آزاد خیالی کو اپنے ہی دل تک محدود رکھتے تھے۔ گرجا چلے جاتے تھے۔ گھر کی روزانہ دعاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی بھجن بھی گا لیتے تھے۔ وہ مذہب کو سنجیدہ خیالی کے دائرہ سے خارج سمجھتے تھے۔ وہ گرجا میں بھی اُسی خیال سے جاتے جس خیال سے کہ تھیٹر دیکھنے۔ اُنہوں نے پہلے کمرہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں ماما تو نہیں دیکھ رہی ہیں کہ مجھ پر اُن کا قہر ابھی نازل ہو جائے۔ پھر چپکے سے صوفیہ کے پاس آگئے اور بولے "صوفی! کیوں ناداں بنتی ہو؟ سانپ کے مُنہ میں اُنگلی ڈالنا کون سی عقل مندی ہے؟ دل میں جو چاہے خیال کرو۔ جن باتوں کو جی چاہے مانو۔ پر اس طرح ڈھنڈورا پیٹنے سے کیا فائدہ؟ جماعت میں نکو بننے کی کیا ضرورت؟ کون تمہارے دل کے اندر دیکھنے جاتا ہے؟"

صوفیہ نے بھائی کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میں مذہب کے معاملہ میں قول و فعل کو یکساں رکھنا چاہتی ہوں چاہتی ہوں دونو سے ایک ہی راگ نکلے۔ میرے لئے گندم نمائی جو فروشی" ناممکن ہے۔ ضمیر کی آزادی کے لئے میں دُنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کرنے کو تیا ہوں۔ اگر میرے لئے اس گھر میں جگہ نہیں ہے۔ تو خدا کی خلق کی ہوئی وسیع دنیا تو ہے۔ کہیں بھی اپنا گزارہ کر سکتی ہوں۔ میں ساری تکلیفیں سہ لوں گی۔ رسوائی کا مجھے ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ مگر اپنی نگاہوں میں گر کر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی مان لوں کہ میرے لئے چاروں طرف دروازے بند ہیں تو بھی میں اپنے ضمیر کا سودا کرنے کی بہ نسبت بھوکوں مر جانا کہیں بہتر

خیال کرتی ہوں ÷
پربھوسیوک۔ دُنیا اُس سے کہیں زیادہ تنگ ہے جتنا تم خیال کرتی ہو ÷
صوفیہ۔ قبر کے لئے تو جگہ نکل ہی آئے گی!
یکایک ایشور سیوک نے جا کر اُس کو سینہ سے لگا لیا اور اپنے عقیدت مندانہ آنسوؤں سے اُس کی تفتہ دلی کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے ÷ صوفیہ کو اُن کی خوش اعتقادی پر رحم آگیا۔ کون ایسا بیرحم ہے جو بھولے بھالے بچے کے اسپ چوبیں کا مضحکہ اُڑا کر اُس کا دل توڑ کھائے! اُس کے خواب مسرت کو پریشان کر دے؟
صوفیہ نے کہا "دادا! آپ آکر اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ کھڑے کھڑے آپ کو تکلیف ہوتی ہے"÷
ایشورسیوک۔ جب تک تو اپنی زبان سے نہ کہے گی کہ میں یسوع پر اعتقاد رکھتی ہوں۔ تب تک مَیں تیرے دروازہ پر اسی طرح فقیر دل جیسا کھڑا رہوں گا ÷
صوفیہ۔ دادا! میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں یسوع پر اعتقاد نہیں رکھتی ہوں۔ میں اُنہیں ایک بہت بڑا قابل تقلید بزرگ اور عفو و رحم کا اوتار سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہوں گی ÷
ایشور سیوک نے صوفیہ کے رخساروں کو بوسہ دے کر کہا "بس میرا دل مطمئن ہو گیا۔ یسوع تجھے اپنے دامن میں لے۔ اب میں بیٹھتا ہوں مجھ کو کلام پاک سُنا! میرے کانوں کو یسوع کے کلمات سے پاک بنا"
صوفیہ انکار نہ کر سکی۔ پیدایش کا ایک باب کھول کر پڑھنے لگی۔

ایشور سیوک آنکھیں بند کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ مسز سیوک نے یہ نظارہ دیکھا اور فاتحانہ انداز سے مسکراتی ہوئی چلی گئیں ۔

یہ مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن ایشور سیوک کے مرہم سے صوفیہ کے دل کا ناسور نہ اچھا ہو سکتا تھا۔ آئے دن اُس کے دل میں مذہبی شکوک پیدا ہوتے رہتے تھے اور اُسے اپنے گھر میں رہنا روز بروز زیادہ ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پربھو سیوک کی ہمدردی بھی کم ہونے لگی۔ مسٹر جان سیوک کو اپنے تجارتی مشاغل سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ صوفیہ کی دماغی پریشانیوں کو رفع کرتے مسز سیوک کامل خود مختاری سے اُس پر حکومت کرتی تھیں۔ صوفیہ کے لئے سخت ترین آزمائش کا موقع وہ ہوتا تھا جب وہ ایشور سیوک کو بائبل پڑھ کر سناتی تھی۔ اِس آزمائش سے بچنے کے لئے وہ ہر روز بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ پس اُس کو اپنی اس مصنوعی زندگی سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔ اُس کا دل بار بار تقاضا کرتا کہ گھر سے کہیں نکل جائے اور آزادی کے ساتھ حق و باطل کی تحقیق میں مصروف ہو لیکن اس خواہش کو عملی میدان میں قدم رکھتے ہوئے ہچک جانا پڑتا تھا۔ پہلے پربھو سیوک سے اپنے شکوک کا اظہار کر کے وہ مطمئن ہو جایا کرتی تھی مگر جوں جوں اُن کی بے رخی بڑھنے لگی۔ صوفیہ کے دل سے بھی اُن کی عزت اور محبت زائل ہونے لگی۔ اُس کے دل میں خیال پیدا ہو گیا کہ پربھو سیوک کا دل صرف آسائش اور آرام طلبی کا غلام ہے جس کا اصولوں سے کوئی علاقہ نہیں یہاں تک کہ اُن کے اشعار بھی جنہیں وہ پہلے بڑے شوق سے سنا کرتی

تھی اب اُس کو محض فرضی باتوں سے مملو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اکثر ٹال دیا کرتی کہ میرے سر میں درد ہے۔ سُننے کو جی نہیں چاہتا۔ اپنے دل میں کہتی کہ اُن کو ایسے پاک جذبات وخیالات کو قلمبند کرنے کا کیا حق ہے۔ جن کا اظہار دلی ایجاب اور تجربہ پر مبنی نہ ہو۔

ایک روز جب گھر سے سب لوگ گرجا گھر جانے لگے تو صوفیہ نے درد سر کا بہانہ کیا۔ اب تک وہ شکوک کے باوجود بھی اتوار کو گرجا چلی جایا کرتی تھی۔ پربھوسیوک اُس کے دل کی بات تاڑ گئے۔ بولے "صوفی! اگر جانے میں تمہیں کیا عذر ہے؟ وہاں جا کر آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھے رہنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں"۔

پربھوسیوک بڑے شوق سے گرجا جایا کرتے تھے۔ وہاں اُنہیں ریاونمود۔ ڈھونگ اور ڈھکوسلہ کی فلسفیانہ تحقیقات کرنے اور طنز گوئیوں کے لئے مسالہ جمع کرنے کا موقع خوب ملتا تھا۔ صوفیہ کے لئے عبادت کھیل کی چیز نہ تھی بلکہ تسکین وآسودگی کی۔ بولی "تمہارے لئے آسان ہے مگر میرے لئے مشکل"۔

پربھوسیوک۔ کیوں اپنی جان وبال میں ڈالتی ہو؟ ماما کے مزاج سے تو خوب واقف ہو۔

صوفیہ۔ میں تم سے رائے نہیں طلب کرتی۔ اپنے کاموں کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار رہوں۔

مسز سیوک نے آکر پوچھا "صوفی! کیا سر میں اتنا درد ہے کہ تم گرجا تک نہیں جا سکتیں"۔

صوفیہ۔ جا کیوں نہیں سکتی پر جانا نہیں چاہتی۔

مسز سیوک۔ کیوں؟
صوفیہ۔ میری طبیعت۔ میں نے گرجا جانے کا عہد نہیں کر رکھا ہے؟
مسز سیوک۔ کیا تو چاہتی ہے کہ ہم کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟
صوفیہ۔ ہرگز نہیں۔ میں صرف اتنا ہی چاہتی ہوں کہ آپ مجھے گرجا جانے کے لئے مجبور نہ کریں۔
ایشور سیوک پہلے ہی اپنے تامجان پر بیٹھ کر چل دئے تھے +
جان سیوک نے آکر صرف اتنا پُوچھا "صوفی! کیا سر میں زیادہ درد ہے؟ میں اُدھر سے کوئی دوا لیتا آؤں گا۔ ذرا پڑھنا کم کر دو اور روز گھومنے جایا کرو۔"
یہ کہہ کر وہ پربھو سیوک کے ساتھ فٹن پر جا بیٹھے لیکن مسز سیوک اتنی آسانی سے اُس کا گلا چھوڑنے والی نہ تھیں۔ بولیں "تجھے یسوع کے نام سے کیوں اتنی نفرت ہے؟"
صوفیہ۔ میں اُن پر دل سے اعتقاد رکھتی ہوں۔
مسز سیوک۔ تو جھوٹ بولتی ہے۔
صوفیہ۔ اگر دل میں اعتقاد نہ ہوتا تو زبان سے ہرگز نہ کہتی۔
مسز سیوک۔ تو یسوع کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے؟
صوفیہ۔ ہرگز نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ میری نجات اگر ہو سکتی ہے تو میرے اعمال کے ذریعے۔
مسز سیوک۔ تیرے اعمال سے تیرا مُنہ سیاہ ہوگا۔ تیری نجات نہ ہوگی۔

یہ کہہ کر مسز سیوک بھی فٹن پر جا بیٹھیں۔ شام ہو گئی تھی۔ سڑک پر عیسائیوں کے دَل کے دَل کوئی اوور کوٹ پہنے۔ کوئی ماگھ کی سردی سے سکڑے ہوئے خوش خوش گرجے چلے جا رہے تھے۔ لیکن صوفیہ کو آفتاب کی کمزور کرنیں بھی ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بیٹھ گئی "تیرے اعمال سے تیرا منہ سیاہ ہوگا" یہ الفاظ اُس کے دل میں نشتر کی طرح چبھتے تھے۔ سوچنے لگی۔ میری تن پروری کی یہی مناسب سزا ہے۔ میں صرف روٹیوں کے لئے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہوں۔ اتنی حقارت اور ذلت برداشت کر رہی ہوں۔ اِس گھر میں کون میرا ہمدرد ہے۔ کون ہے۔ جو میرے مرنے کی خبر پا کر آنسو کی چار بوندیں گرا دے ؟ شاید میرے مرنے سے لوگوں کو خوشی ہو۔ میں ان کی نظروں میں اتنا گر گئی ہوں۔ ایسی زندگی پر لعنت ہے۔ میں نے دیکھے ہیں ہندو گھروں میں مختلف عقائد کے لوگ کتنی محبت سے رہتے ہیں۔ باپ سناتنی ہے تو بیٹا آریہ سماجی۔ شوہر برہمو سماج میں ہے تو بیوی بُت پرستوں میں۔ سبھی اپنے اپنے عقائد پر عامل ہوتے ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں بولتا۔ ہمارے یہاں آتما کچلی جاتی ہے۔ پھر بھی یہ دعوٰے ہے کہ ہماری تعلیم و تہذیب آزاد خیالی کے معاون ہیں! ہیں تو ہمارے یہاں بھی وسیع الخیال لوگ۔ پربھو سیوک ہی اُن کی ایک مثال ہے لیکن اُن کی وسیع الخیالی دراصل نافہمی ہے۔ ایسے وسیع الخیال آدمیوں سے تو تنگ خیال ہی اچھے۔ اُن میں کچھ یقین کا مادہ تو ہے۔ بالکل بھروپئے تو نہیں ہیں۔ آخر ماما اپنے دل میں کیا سمجھتی ہیں کہ بات بات پر اپنے سخت کلامی کے تیروں سے مجھے چھیدنے لگتی ہیں ؟ ان کے دل میں یہی

خیال ہوگا کہ اس کا کہیں اور ٹھکانا نہیں ہے۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہیں ہے۔ میں انہیں دکھادوں گی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکتی ہوں۔ اب اس گھر میں رہنا نرک میں رہنا ہے۔ اس بے حیائی کی روٹیاں کھانے سے بھوکوں مرجانا بہتر ہے۔ بلا سے۔ لوگ ہنسیں گے میں آزاد تو ہوجاؤں گی۔ کسی کے طعنے تو نہ سننے پڑیں گے۔

صوفیہ اُٹھی اور کسی مقام کو تجویز کئے بغیر ہی احاطہ سے باہر نکل آئی۔ اس گھر کی ہوا اب اُس کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ آگے بڑھتی جاتی تھی پر دل میں لگاتار سوال اُٹھ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ جب وہ گھنی آبادی میں پہنچی تو شہدوں نے اُس پر اِدھر اُدھر سے آوازے کسنے شروع کئے۔ مگر وہ شرم سے سر نیچا کرنے کی بجائے اُن آوازوں اور بُری نگاہوں کا جواب نفرت آمیز نگاہوں سے دیتی چلی جاتی تھی جیسے کوئی تیز پانی کی دھار پتھروں کو ٹھکراتی ہوئی آگے بہتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ وہ اُس کشادہ سڑک پر آگئی جو دسا اومیدھ گھاٹ کی طرف جاتی ہے۔

اُس کے جی میں آیا۔ ذرا دریا کی سیر کرتی چلوں۔ شاید کسی بھلے آدمی سے ملاقات ہوجائے۔ جب تک دو چار آدمیوں سے شناسائی نہ ہو اور وہ میرا حال نہ جانیں۔ مجھ سے کون ہمدردی کا اظہار کرے گا؟ کون میرے دل کا حال جانتا ہے؟ ایسے رحم دل اشخاص اتفاق ہی سے ملتے ہیں۔ جب اپنے ماں باپ دشمن ہو رہے ہیں تو دوسرے سے بھلائی کی کیا اُمید؟

وہ اسی نااُمیدی کی حالت میں چلی جا رہی تھی کہ یکایک اُس کو

ایک عالی شان محل نظر آیا جس کے سامنے بہت وسیع سبزہ زار تھا۔ اندر جانے کے لئے ایک اونچا پھاٹک تھا جس کے اوپر ایک سنہرا گنبد بنا ہوا تھا۔ اس گنبد میں نوبت بج رہی تھی۔ پھاٹک سے محل تک سُرخی کی ایک روش تھی۔ جس کے دونوں طرف بیلیں اور گلاب کی کیاریاں تھیں سبزہ زار پر کتنے ہی مرد عورت بیٹھے ہوئے ماگھ کی سرد سرد ہوا کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ کوئی لیٹا ہوا تھا۔ کوئی تکیہ دار چوکیوں پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

صوفیہ نے شہر میں ایسا پُر فضا مقام نہ دیکھا تھا۔ اُس کو تعجب ہوا کہ شہر کے درمیانی حصہ میں بھی ایسے دلکش مقامات موجود ہیں۔ وہ ایک چوکی پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی:۔ اب لوگ گرجا سے آ گئے ہوں گے مجھے گھر میں نہ دیکھ کر چونکیں گے۔ تو ضرور سمجھ لیں گے۔ کہیں گھومنے گئی ہو گی اگر رات بھر یہیں بیٹھی رہوں تو بھی وہاں کسی کو کچھ فکر نہ ہو گی۔ آرام سے کھا پی کر سو جائیں گے۔ ہاں دادا کو ضرور دُکھ ہو گا۔ وہ بھی محض اس لئے کہ اُنھیں بائبل پڑھ کر سنانے والا کوئی نہیں۔ ماما تو دل میں خوش ہوں گی کہ اچھا ہوا آنکھوں سے دور ہو گئی۔ میرا کسی سے تعارف نہیں اِسی سے کہا ہے کہ سب سے ملتے رہنا چاہئے۔ نہ جانے کب کس سے کام پڑ جائے۔ مجھے برسوں رہتے ہو گئے اور کسی سے راہ و رسم نہ پیدا کی۔ میرے ساتھ نینی تال میں یہاں کے کسی رئیس کی لڑکی پڑھتی تھی۔ بھلا سا نام تھا۔ ہاں آندو۔ مزاج میں کتنی نرمی تھی۔ بات بات سے محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ ہم دونوں گلے میں باہیں ڈال کر ٹہلتی تھیں۔ وہاں کوئی لڑکی ایسی خوب صورت اور با اخلاق نہ تھی۔ میرے اور اُس کے خیالات میں کتنی یکسانیت تھی۔ کہیں اس کا پتہ چل جاتا تو دس پانچ

روز اُسی کے یہاں مہمان ہو جاتی۔ اُس کے والد کا اچھا سا نام تھا۔ ہاں یاد آ گیا۔ کنور بھرت سنگھ۔ پہلے یہ بات نہ سوجھی تھی ورنہ ایک کارڈ لکھ کر ڈال دیتی۔ مجھے بھول تو کیا گئی ہو گی۔ اتنی بے اُنس تو نہ معلوم ہوتی تھی کم سے کم انسانی اخلاق کی پرکھ ہو جائے گی۔

مجبوری میں ہمیں اُن لوگوں کی یاد آتی ہے جن کی صورت بھی بھول چکی ہوتی ہے۔ پردیس میں اپنے محلّہ کا نائی یا کہار بھی مل جائے تو ہم اُس کے گلے مل جاتے ہیں۔ چاہے دیس میں اُس سے کبھی سیدھے مُنہ بات بھی نہ کی ہو۔

صوفیہ سوچ ہی رہی تھی کہ کسی سے کنور بھرت سنگھ کا پتہ دریافت کروں۔ اسی اثنا میں محل کے سامنے والے پختہ چبوترہ پر فرش بچھ گیا کئی آدمی ستار، بیلا، مردنگ لئے ہوئے آ بیٹھے اور ان سازوں کے ساتھ سُر ملا کر کئی نوعمر لوگ ایک ہی لہجہ میں گانے لگے:۔

پاک جنگ میں کبھی بھول کر صبر نہیں کھونا ہوگا
بجلی کا ہو وار سروں پر نہیں مگر رونا ہوگا
دشمن سے بدلہ کا مَن میں بیج نہیں بونا ہوگا
گھر میں کان روئی دے کر پھر تجھے نہیں سونا ہوگا
دیش داغ کو خون جل سے خوش ہو کر دھونا ہوگا
دیش کاج کی بھاری گٹھڑی سر پر رکھ ڈھونا ہوگا
آنکھیں لال بھویں ٹیڑھی کر کرودھ نہیں کرنا ہوگا
بل بیدی پر تجھے خوشی سے چڑھ کر کٹ مرنا ہوگا
فانی ہے یہ جسم موت سے کبھی نہیں ڈرنا ہوگا

سچائی کی راہ چھوڑ کر پیر نہیں دھرنا ہوگا
ہوگی جیت ضرور دھرم کی یہی بھاؤ بھرنا ہوگا
ماتری بھوم کے لئے جگ میں جینا اور مرنا ہوگا

گانے میں نہ کشش تھی نہ لطافت۔ لیکن وہ لطافت وہ تحریک بھری ہوئی تھی جو ہم آہنگی کا خاصہ ہے۔ ایثار و ترقی کا مقدس پیغام وسیع خلاء میں ساکت آسمان میں اور صوفیہ کے غیر مطمئن دل میں گونجنے لگا۔ وہ ابھی تک مذہبی تحقیقات ہی میں مصروف رہتی تھی۔ قومی پیغام کے سننے کا موقع اُسے کبھی نہ ملا تھا۔ شمع سے نور نکلتا ہے۔ اُسی طرح صوفیہ کی روئیں روئیں سے وہی آواز نکل رہی تھی "ماتری بھوم کے لئے جگ میں جینا اور مرنا ہوگا!"

اُس کے دل میں ایک ترنگ اُٹھی کہ میں بھی جا کر گانے والوں کے ساتھ گانے لگتی۔ طرح طرح کے جذبات و خیالات پیدا ہونے لگے۔ میں کسی دور دراز مُلک میں جا کر ہند کی فریاد سناتی۔ یہیں کھڑی ہو کر کہہ دوں۔ میں اپنے کو مُلکی خدمت کے لئے بھینٹ کرتی ہوں۔ اپنی زندگی کے مقصد پر ایک تقریر کرتی کہ ہم اپنی قسمت کا رونا رونے کے لئے اپنی تنزل پذیر حالت پر آنسو بہانے کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں۔ سماں بندھا ہوا تھا۔ صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے اُسی قسم کے جذبات کی تصویریں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ابھی نغمہ کی آواز گونج رہی تھی کہ اچانک اُسی احاطہ کے اندر ایک کھپریل کے مکان میں آگ لگ گئی۔ جب تک لوگ اُدھر دوڑیں۔ آگ کے شعلے زیادہ بلند ہو گئے۔ سارا میدان جگمگا اُٹھا۔ درخت اور

پودے چمک دار روشنی کے سمندر میں نہا اُٹھے۔ گانے والوں نے فوراً اپنے اپنے سازو ہیں چھوڑے۔ دھوتیاں ہمیٹ کر باندھیں۔ آستینیں چڑھائیں اور آگ بجھانے دوڑے۔ محل کے اندر سے اور بھی کتنے نوجوان نکل پڑے۔ کوئی کنویں سے پانی لانے دوڑا۔ کوئی آگ کے منہ میں گھس کر اندر کی چیزوں کو نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ لیکن کہیں وہ پریشانی وہ گھبراہٹ وہ سراسیمگی وہ کہرام۔ وہ دوڑو دوڑو کا شور۔ وہ خود کچھ بھی نہ کرتے ہوئے دوسروں کو حکم دینے کا غُل نہ تھا۔ جو ایسی آسمانی مصیبتوں کے نزول کے موقعوں پر بالعموم ہوا کرتا ہے۔ سبھی لوگ ایسے عمدہ اور باقاعدہ طریقہ پر اپنا اپنا کام کر رہے تھے کہ ایک بوند پانی بھی بیکار نہ گرنے پاتا تھا۔ آگ کا زور بھی لحہ لحہ کم ہو رہا تھا۔ لوگ ایسی خوبی سے آگ میں کودتے تھے گویا وہ پانی کا حوض ہے۔

ابھی آگ اچھی طرح نہ بُجھی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "دوڑو! دوڑو! آدمی ڈوب رہا ہے"۔ محل کی دوسری طرف ایک پختہ تالاب تھا جس کے کنارے جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ گھاٹ پر ایک چھوٹی سی کشتی کھونٹے سے بندھی ہوئی پڑی تھی۔ آواز سنتے ہی آگ بُجھانے والی جماعت سے کئی آدمی نکل کر تالاب کی طرف لپکے اور ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لئے پانی میں کود پڑے۔ اُن کے کودنے کی آواز "دُھم دَھم" صوفیہ کے کانوں میں پڑی۔ الیشور کا کیسا قہر کہ ایک ساتھ ہی دو خاص عناصر میں یہ ہیجان! اور ایک ہی جگہ پر! وہ اُٹھ کر تالاب کی طرف جانا ہی چاہتی تھی کہ دفعتاً اُس نے ایک شخص کو پانی کا ڈول لئے پھسل کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ چاروں طرف آگ فرو ہو چکی تھی

لیکن جہاں وہ شخص گرا تھا وہاں اب تک بڑے زوروں کے ساتھ جل رہی تھی۔ آگ کی لپٹ اپنا خوفناک منہ کھولے ہوئے اُس بدنصیب شخص کی طرف لپکی۔ وہ لپٹ اُس کو نگل جاتی لیکن صوفیہ بجلی کی تیزی کے ساتھ شعلہ کی طرف دوڑی اور اُس شخص کو کھینچ کر باہر نکال لائی۔ یہ سب ایک لمحہ میں ہو گیا۔ غریب آدمی کی جان بچ گئی۔ لیکن صوفیہ کا نازک جسم آگ کی لپٹ سے جھلس گیا۔ وہ شعلوں کے حلقہ سے باہر آتے ہی بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی!

صوفیہ نے تین روز تک آنکھیں نہیں کھولیں۔ دل نہ جانے کس کس دنیا کی سیر میں مصروف تھا۔ کبھی عجیب کبھی خوفناک نظارے دکھائی دیتے۔ کبھی یسوع کی شانت مورتی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ کبھی کسی عقیلہ خاتون کی چاندسی صورت کے درشن ہوتے۔ جنہیں یہ سینٹ میری سمجھتی۔

جب چوتھے روز صبح کے وقت اُس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے کو ایک آراستہ کمرہ میں پایا۔ گلاب اور صندل کی خوشبو آرہی تھی۔ سامنے کرسی پر وہی خاتون بیٹھی ہوئی تھی جس کو اُس نے حالت خواب میں سینٹ میری سمجھا تھا۔ اور سرہانے ایک سن رسیدہ شخص بیٹھا ہوا تھا جسکی آنکھوں سے رحم ٹپکا پڑتا تھا۔ انہیں کو شاید اُس نے نیم خوابی کی حالت میں پہلے سمجھا تھا۔ خواب محض یادداشت کی تکرار ہے۔

صوفیہ نے خفیف لہجہ میں پوچھا "میں کہاں ہوں؟ ماما کہاں ہیں؟"
بڈھے آدمی نے کہا "تم کنور بھرت سنگھ کے گھر میں ہو۔ تمہارے سامنے رانی صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ تمہارا جی اب کیسا ہے؟"

صوفیہ۔ اچھی ہوں۔ پیاس لگی ہے۔ ماما کہاں ہیں؟ پاپا کہاں ہیں؟ آپ کون ہیں؟
رانی۔ یہ ڈاکٹر گنگولی ہیں۔ تین دن سے تمہاری دوا کر رہے۔ تمہارے پاپا ماما کون ہیں؟
صوفیہ۔ پاپا کا نام مسٹر جان سیوک ہے۔ ہمارا بنگلہ سگرا میں ہے *
ڈاکٹر۔ اچھا تو تم مسٹر جان سیوک کی بیٹی ہو۔ ہم اُن کو جانتا ہے۔ ابھی بلاتا ہے *
رانی۔ کسی کو ابھی بھیج دوں؟
صوفیہ۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ آجائیں گے۔ میں نے جس آدمی کو پکڑ کر کھینچا تھا اُس کی کیا حالت ہے؟
رانی۔ بیٹی! ایشور کی دَیا سے وہ بہت اچھی طرح ہے۔ اُسے ذرا بھی آنچ نہیں لگی۔ وہ میرا بیٹا وِنے ہے۔ ابھی آتا ہوگا۔ تمہیں نے تو اُس کی جان بچائی۔ اگر تم دوڑ کر نہ پہنچ جاتیں تو آج نہ جانے کیا ہوتا۔ میں تمہارے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ تم میرے خاندان کی حفاظت کرنے والی دیوی ہو *
صوفیہ۔ جس گھر میں آگ لگی تھی اُس کے آدمی سب بچ گئے؟
رانی۔ بیٹی! وہ تو محض تماشہ تھا۔ وِنے نے یہاں ایک سیوا سمتی بنا رکھی ہے۔ جب شہر میں کوئی میلہ ہوتا ہے۔ یا کہیں سے کسی حادثہ کی خبر آتی ہے تو سمتی وہاں پہنچ کر ضرور خدمت اور مدد کرتی ہے۔ اُس روز سمتی کے امتحان کے لئے کنور صاحب نے یہ تماشہ کیا تھا *
ڈاکٹر۔ کنور صاحب دیوتا ہے۔ کتنے غریب لوگوں کی اچھا کرتا ہے۔

یہ سمتی ابھی تھوڑے دن ہوئے بنگال گئی تھی۔ یہاں سورج گرہن کا اشنان ہونے والا ہے۔ لاکھوں جاتری دور دور سے آئیں گے۔ اُسی کے لئے یہ سب تیاری ہو رہا ہے ؎

اتنے میں ایک نوجوان حسینہ وہاں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرہ سے شمع روشن کی طرح نور کی کرنیں چھٹک رہی تھیں۔ گلے میں موتیوں کے ہار کے سوا اُس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ صبح کی سفید روشنی مجسم نمودار تھی!

صوفیہ نے اُسے ایک لمحہ تک غور سے دیکھا۔ پھر بولی "اندو! تم یہاں کہاں؟ آج کتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے"؟

آندو چونک پڑی۔ تین دن سے برابر صوفیہ کو دیکھ رہی تھی۔ خیال آتا تھا کہ اِسے کہیں دیکھا ہے پر کہاں دیکھا ہے۔ یہ یاد نہ پڑتا تھا۔ اُس کی باتیں سُنتے ہی یادداشت تازہ ہو گئی۔ آنکھیں چمک اُٹھیں۔ گلاب کھِل گیا۔ بولی "او ہو صوفی! تم ہو"؟

دونوں سہیلیاں گلے مِل گئیں۔ یہ وہی آندو تھی جو صوفیہ کے ساتھ نینی تال میں پڑھتی تھی۔ صوفیہ کو امید نہ تھی کہ آندو اتنی محبت سے ملے گی۔ آندو پچھلی باتوں کو یاد کر کے کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی گلے مِل جاتی۔ اپنی ماں سے اُس کی تعریف کرنے لگی۔ ماں اس کی محبت کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھی۔ بالآخر صوفیہ نے شرماتے ہوئے کہا "اندو! ایشور کے لئے اب میری زیادہ تعریف نہ کرو۔ ورنہ مَیں تم سے نہ بولوں گی۔ اتنے عرصہ تک کبھی خط بھی نہ لکھا۔ مُنہ دیکھے کی محبت کرتی ہو"؎

رانی۔ نہیں بیٹی صوفی! آندو مجھ سے کئی بار تمہارا ذکر کر چکی ہے۔ یہاں

کتنے ہی رئیسوں کی لڑکیاں اس سے ملنے آتی ہیں پر کسی سے اس کا دل نہیں ملتا۔ کسی سے ہنس کر بولتی تک نہیں۔ تمہارے سوا میں نے ایسے اور کسی کی تعریف کرتے نہیں سُنا۔

اندو۔ بہن! تمہاری شکایت بجا ہے۔ پر کروں کیا؟ مجھے خط ہی نہیں لکھنا آتا۔ ایک تو بڑی بھول یہ ہوئی کہ تمہارا پتہ نہیں پوچھا۔ اور اگر پتہ معلوم بھی ہوتا تو بھی مَیں خط نہ لکھ سکتی۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم ہنسنے نہ لگو۔ میرا خط کبھی ختم ہی نہ ہوتا اور نہ جانے کیا کیا لکھ جاتی۔

کنور صاحب کو معلوم ہوا کہ صوفیہ باتیں کر رہی ہے تو وہ بھی شکر یہ ادا کرنے کے لئے وہاں آئے۔ پورے چھ فٹ کے آدمی تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ لمبے بال لمبی داڑھی۔ موٹے کپڑے کا ایک لمبا کُرتہ پہنے ہوئے تھے۔ صوفیا نے ایسا نورانی چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں رشیوں کی جو شکل قایم کر رکھی تھی وہ بالکل اسی قسم کی تھی۔ اس بڑے جسم میں بیٹھی ہوئی بڑی آتما دونوں آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ صوفی نے تعظیماً اُٹھنا چاہا لیکن کنور صاحب شیریں اور سادہ لہجہ میں بولے۔ بیٹی لیٹی رہو۔ تمہیں اُٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ لو میں بیٹھا جاتا ہوں۔ تمہارے پاپا سے مجھے ملاقات ہے۔ پر کیا معلوم تھا کہ تم مسٹر سیوک کی بیٹی ہو۔ میں نے اُن کو بلایا ہے۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ میں ابھی تمہیں جانے نہ دوں گا۔ یہ کمرہ اب تمہارا ہے۔ اور یہاں سے چلے جانے پر بھی تم کو ایک مرتبہ روزانہ یہاں آنا پڑے گا۔ (رانی سے) جاہنوی! یہاں پیانو منگوا کر رکھ دو۔ آج میں سہراب جی کو بلوا کر صوفیہ کی ایک روغنی تصویر تیار کروالو۔ سہراب جی

ہ ہوشیار رہیں پر میں نہیں چاہتا کہ صوفیہ کو اُن کے سامنے بیٹھنا
ے۔ وہ تصویر ہم کو یاد دلاتی رہے گی۔ کہ کس نے سخت مصیبت کے
ت ہماری مدد کی ÷
ی۔ کچھ اناج بھی دان کرا دوں ؟
یہ کہہ کر رانی نے ڈاکٹر گنگولی کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے اشارہ
۔ کنور صاحب فوراً بولے " پھر وہی ڈھکوسلے ! اس زمانہ میں جو
یب ہے اسے غریب ہونا چاہئے۔ جو بھوکوں مرتا ہے اُسے بھوکوں
چاہئے۔ جب گھنٹے دو گھنٹے کی محنت سے کھانے بھر کو مل سکتا ہے تو
ئی وجہ نہیں کہ کیوں کوئی شخص بھوکوں مرے ؟ دان نے ہماری قوم
جتنے سُست آدمی پیدا کر دئے ہیں۔ اُتنے کُل نشوں نے بھی مل کر
یدا کئے ہوں گے۔ دان کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی۔ یہ میری سمجھ
نہیں آتا ÷
نی۔ رشیوں نے بھول کی کہ تم سے صلاح نہ لے لی ÷
در۔ ہاں میں ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ آپ لوگ یہ کاہلی بد اعمالی اور
ی کا بیج بو رہے ہیں۔ دان کاہلی کی جڑ ہے۔ اور کاہلی تمام گناہوں کی
پس دان ہی گناہوں کی جڑ ہے۔ کم سے کم اُس کا معاون تو ضرور
ہے۔ دان نہیں۔ اگر جی چاہتا ہو تو دوستوں کی دعوت کر دو ÷
کٹر۔ صوفیہ ! تم راجہ صاحب کا بات سُنتا ہے ؟ تمہارا یسوع تو
ن کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تم کنور صاحب سے کچھ نہیں
۔ ÷
صوفیہ نے آندو کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں گویا

کہہ رہی تھی کہ میں اِن کی عزت کرتی ہوں ورنہ جواب دینے کے ناقابل نہیں ہوں +

صوفیہ دل ہی دل میں اِن لوگوں کی باہمی محبت کا مقابلہ اپنے گھر والوں سے کر رہی تھی۔ آپس میں کتنی محبت ہے۔ اماں باپ دونوں آندو پر جان دیتے ہیں۔ ایک میں بدنصیب ہوں کہ کوئی منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ چار دن یہاں پڑے ہو گئے کسی نے خبر تک نہ لی۔ کسی نے کھوج ہی نہ کی ہوگی۔ سمجھ لیا ہوگا۔ کہیں ڈوب مری ہوگی + جی میں خوش ہوں گی۔ کہ اچھا ہوا گھر سے ایک بلا ٹل گئی۔ میں ایسے نیک دل لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری اِن سے کیا برابری؟

اگرچہ یہاں کسی کے برتاؤ میں رحم کا شائبہ بھی نہ تھا لیکن صوفیہ کو انہیں اپنی اس قدر خاطر و مدارات کرتے دیکھ کر اپنی بیکسی کی حالت پر رنج ہوتا تھا۔ آندو سے بھی تکلف کا برتاؤ کرنے لگی۔ آندو اُس کو محبت سے تم کہتی تھی پر وہ اُس کو آپ کہہ کر باتیں کرتی تھی +

کنور صاحب کہہ گئے تھے۔ میں نے مسٹر سیوک کو اطلاع کر دی ہے وہ آتے ہی ہوں گے۔ صوفیہ کو اب یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں وہ آ نہ رہے ہوں۔ آتے ہی آتے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں گے۔ میرے سر پھر وہی مصیبت پڑے گی۔ آندو سے اپنی مصیبت کی داستان کہوں تو شاید اُس کو مجھ سے کچھ ہمدردی ہو۔ یہ خادمہ یہاں فضول ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اندو آئی بھی تو اُس سے کس طرح باتیں کروں گی؟ پاپا کے آنے سے قبل ایک بار آندو سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل جاتا تو اچھا ہوتا۔ کیا کروں؟ اندو کو بلا بھیجوں؟ نہ جانے کیا کرنے لگی؟ پیانو بجا رہی

توشاید سُن کر آئے ۔

اِس طرف اندو بھی صوفیہ سے کتنی ہی باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ رانی جی کے سامنے اُس کو دل کی باتیں کہنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ خوف تھا کہ صوفیہ کے باپ اُس کو لیتے گئے۔ تو میں پھر اکیلی ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر گنگولی نے کہا تھا کہ انہیں زیادہ باتیں نہ کرنے دینا۔ آج اور آرام سے سولیں تو پھر کوئی اندیشہ نہ رہے گا۔ اس لئے وہ آنے کا ارادہ کر کے بھی رُک جاتی تھی۔ آخر نو بجتے بجتے وہ بے صبر ہو گئی۔ آ کر خادمہ کو اپنا کمرہ صاف کرنے کے بہانے وہاں سے ہٹا دیا۔ اور صوفیہ کے سرہانے بیٹھ کر بولی "کیوں بہن۔ بہت کمزوری تو نہیں معلوم ہوتی؟"

صوفیہ۔ بالکل نہیں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں بالکل اچھی ہو گئی ۔

اندو۔ تمہارے پاپا کہیں تم کو اپنے ساتھ لے گئے تو میری جان نکل جائے گی۔ ان کے آتے ہی خوش ہو کر جاؤ گی اور شاید پھر کبھی میری یاد بھی نہ کرو گی؟

یہ کہتے کہتے آندو کی آنکھیں اشک آلودہ ہو گئیں۔ جذبات کے نامناسب جوش کو ہم اکثر اپنے آنسوؤں سے چھپاتے ہیں۔ آندو کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پر وہ مُسکرا رہی تھی ۔

صوفیہ بولی۔ آپ مجھے بھول سکتی ہیں پر میں آپ کو کیسے بھولوں گی؟ وہ اپنا دردِ دل سُنانے ہی کو تھی کہ غیرت نے زبان بند کر دی۔ بات پھیر کر بولی "میں کبھی کبھی آپ سے ملنے آیا کروں گی"۔

اندو۔ میں ابھی یہاں سے تم کو پندرہ روز تک نہ جانے دوں گی۔ مذہب کی رکاوٹ نہ ہوتی تو کبھی نہ جانے دیتی۔ اماں جی تم کو اپنی بہو بنا کر چھوڑتیں

تمہارے اوپر بے طرح ریجھ گئی ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں تمہاری ہی چرچا کرتی ہیں۔ دل سے بھی تمہارے ہاتھوں بکا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ تم چلی جاؤ گی۔ تو سب سے زیادہ رنج اُسی کو ہوگا۔ ایک راز کی بات تم سے کہتی ہوں۔ آماں جی تم کو کوئی چیز تحفہ کے طور پر دیں تو انکار نہ کرنا۔ ورنہ اُن کو بہت رنج ہوگا۔

اِس محبت آمیز ضد نے تامّل کا لنگر اُکھاڑ دیا۔ جو اپنے گھر میں روزانہ سخت الفاظ کے سُننے کا عادی ہو اُس کے لئے اِس قدر ہمدردی کافی سے زیادہ تھی۔ اب صوفیہ کو اندو سے اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنا آئینِ دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ دردناک لہجہ میں بولی "اندو! میرا بس ہوتا تو کبھی رانی جی کے چرنوں کو نہ چھوڑتی پر اپنا کیا بس ہے؟ یہ محبت اور کہاں ملے گی؟"

اندو اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اپنی فطرتی سادگی سے بولی۔ "کہیں شادی کی بات چیت ہو رہی ہے کیا؟"

اُس کی سمجھ میں شادی کے سوا لڑکیوں کے اس قدر غمگین ہونے کا کوئی سبب نہ تھا۔

صوفیہ۔ میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ شادی نہ کروں گی۔

اندو۔ کیوں؟

صوفیہ۔ اس لئے کہ شادی سے مجھ کو اپنی مذہبی آزادی ترک کر دینا ہوگی۔ مذہب آزادِ خیالی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ میں اپنی آتما کو کسی مذہب کے ہاتھ نہیں بیچنا چاہتی۔ مجھے ایسا عیسائی شوہر ملنے کی امید نہیں جس کا دل اتنا فیاض ہو کہ وہ میرے مذہبی شکوک سے درگزر کر

سکے۔ میں حالات سے مجبور ہوکر حضرت یسوع کو خدا کا بیٹا اور نجات
دہندہ نہیں مان سکتی۔ نہ مجبوری سے گرجا میں ایشور کی عبادت کرنے
کے لئے جانا چاہتی ہوں۔ میں یسوع کو ایشور نہیں تسلیم کر سکتی ؟
اندو۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تمہارے یہاں ہم لوگوں کے یہاں سے کہیں
زیادہ آزادی ہے۔ جہاں چاہو تنہا جاسکتی ہو۔ ہمارا تو گھر سے نکلنا مشکل
ہے ؟
صوفیہ۔ لیکن اس قدر مذہبی تنگ خیالی تو نہیں ہے ؟
اندو۔ نہیں کوئی کسی کو پوجا پاٹ کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ بابو جی
روز گنگا اشنان کرتے ہیں۔ گھنٹوں شو جی کی پوجا کرتے ہیں۔ اماں
جی کبھی بھول کر بھی اشنان کرنے نہیں جاتیں۔ نہ کسی دیوتا کی پوجا ہی
کرتی ہیں۔ پر بابو جی کبھی ہٹ نہیں کرتے۔ بھگتی کا انحصار تو اپنے
اعتقاد اور خیال پر ہے۔ ہم بھائی بہن کے خیالات میں بھی زمین آسمان
کا فرق ہے۔ میں کرشن کو مانتی ہوں۔ ونے ایشور کی ہستی سے بھی منکر
ہے۔ پر بابو جی ہم لوگوں سے کبھی کچھ نہیں کہتے اور نہ ہم بھائی بہن میں
کبھی اس بات پر بحث مباحثہ ہوتا ہے ؟
صوفیہ۔ ہماری آزادی جسمانی ہے اور اس لئے جھوٹی۔ آپ کی
آزادی روحانی ہے اور اس لئے سچی ؟
اندو۔ تم گرجا کبھی نہیں جاتیں ؟
صوفیہ۔ پہلے جبراً جاتی تھی اب کے نہیں گئی۔ اس پر گھر والے بہت
ناراض ہوئے۔ بُری طرح میری بے عزتی کی گئی ؟
اندو نے محبت آمیز سادگی سے کہا "وہ لوگ ناراض ہوئے ہوں گے

تو تم بہت روئی ہوں گی؟

صوفیہ۔ پہلے رو یا کرتی تھی۔ اب پرواہ نہیں کرتی ۔

اندو۔ مجھے تو کبھی کوئی کچھ کہہ دیتا ہے تو دل پر تیر سا لگتا ہے۔ دن دن بھر روتی ہی رہ جاتی ہوں۔ آنسو ہی نہیں تھمتے۔ وہ بات بار بار دل میں چُبھا کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے کسی کے غصہ پر رونا نہیں آتا رونا آتا ہے اپنے اوپر کہ میں نے کیوں انہیں ناراض کیا۔ کیوں مجھ سے ایسی بھول کیوں ہوئی ۔

صوفیہ کو وہم ہوا۔ کہ اندو مجھے اپنی خطا بخشی سے نادم کرنا چاہتی ہے۔ ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ بولی میری جگہ پر آپ ہوتیں تو ایسا نہ کہتیں۔ آخر کیا آپ اپنے مذہبی خیالات کو ترک کر دیتیں"؟

اندو۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں کیا کرتی پر گھر والوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ۔

صوفیہ۔ آپ کی ماتا جی اگر آپ کو جبراً کرشن کی عبادت کرنے سے روکیں تو کیا آپ مان جائیں گی ؟

اندو۔ ہاں میں تو مان جاؤں گی۔ اماں کو ناراض نہ کروں گی۔ کرشن تو عالم الغیب ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کے لئے عبادت کی ضرورت نہیں۔ عبادت تو صرف اپنے دل کی تسکین کے لئے ہے ۔

صوفیہ (تعجب سے) آپ کو ذرا بھی دماغی تکلیف نہ ہوگی ؟

اندو۔ ضرور ہوگی پر اُن کی خاطر سے سہ لوں گی ۔

صوفیہ۔ اچھا اگر وہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی شادی کرنا چاہیں تو؟

اندو (شرماتے ہوئے) وہ مسئلہ تو حل ہو چکا۔ ماں باپ نے جس سے مناسب سمجھا بیاہ دیا۔ میں نے زبان تک نہیں کھولی ۔

صوفیہ۔ ارے یہ کب ؟

اندو۔ اس کو تو دو سال ہو گئے (آنکھیں نیچی کرکے) اگر میرا اپنا بس ہوتا تو اُن کو کبھی نہ بیاہتی۔ چاہے کنواری ہی رہتی۔ میرے مالک مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دولت کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن میں اُن کے دل کے صرف ایک چوتھائی کی مالکہ ہوں۔ اُس کے تین حصّے رفاہ عام کے کاموں کی نذر ہوتے ہیں۔ ایک کے بدلے چوتھائی پاکر کون آسودہ ہو سکتا ہے ؟ مجھے تو باجرے کی پوری بسکٹ کے چوتھائی حصے سے کہیں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بھوک تو رفع ہو جاتی ہے جو کھانا کھانے کا واقعی مقصد ہے ۔

صوفیہ۔ آپ کی مذہبی آزادی میں تو خلل نہیں ڈالتے ؟

اندو۔ نہیں۔ اُنہیں اتنی فرصت کہاں ہے ؟

صوفیہ۔ تب تو میں آپ کو مبارک باد دوں گی ۔

اندو۔ اگر کسی قیدی کو مبارکباد دینا مناسب ہو تو شوق سے دو ۔

صوفیہ۔ زنجیر محبت کی ہو تو ؟

اندو۔ ایسا ہوتا تو میں خود ہی تم سے مبارک باد دینے کے لئے اصرار کرتی۔ میں بندھ گئی وہ آزاد ہیں۔ مجھے یہاں آئے تین مہینے ہونے آتے ہیں پر تین دفعہ سے زیادہ نہیں آئے اور وہ بھی ایک ایک گھنٹہ کے لئے! اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دس منٹ میں موٹر آ سکتی ہے۔ مگر اتنی فرصت کس کو ہے ؟ ہاں خطوط سے اپنی ملاقات کا کام نکالنا چاہتے

ہیں۔ اور وہ خطوط بھی کیسے ہوتے ہیں؟ اوّل سے آخر تک اپنے دُکھڑوں سے بھرے ہوئے۔ آج یہ کام ہے کل وہ کام ہے۔ اِن سے ملنے جانا ہے۔ اُن کا خیر مقدم کرنا ہے۔ میونسپلٹی کے چیرمین کیا ہوگئے راج مل گیا۔ جب دیکھو۔ وہی دُھن سوار۔ اور سب کاموں کے لئے فرصت ہے۔ اگر فرصت نہیں ہے تو صرف یہاں آنے کی! میں تم کو متنبہ کئے دیتی ہوں کسی ملک و قوم کے خادم سے بیاہ نہ کرنا ورنہ پچھتاؤگی۔ تم اُس کے فرصت کے وقت کی محض ایک دل بہلاؤ کی چیز رہوگی ؛

صوفیہ۔ میں تو پہلے ہی اپنی رائے قایم کر چکی۔ سب سے الگ ہی الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں میری آزادی میں خلل ڈالنے والا کوئی نہ ہو۔ میں ٹھیک راستہ پر چلوں گی یا غلط پر۔ یہ ذمہ داری بھی اپنے ہی سر لینا چاہتی ہوں۔ میں بالغ ہوں اور اپنا نفع نقصان خود سمجھ سکتی ہوں تمام عمر کسی کی حفاظت میں نہیں رہنا چاہتی کیونکہ اِس حفاظت کے معنی غلامی کے سوا اور کچھ نہیں ؛

اندو۔ کیا تم اپنے ماما اور پاپا کے تحت میں نہیں رہنا چاہتی ؟

صوفیہ۔ نا۔ ماتحتی میں نوعیت کا نہیں۔ صرف حدود کا فرق ہے ؛

اندو۔ تو میرے ہی گھر کیوں نہیں رہتیں؟ میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ اور آماں جی تو تم کو آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھیں گی۔ میں چلی جاتی ہوں تو وہ اکیلی گھبرایا کرتی ہیں۔ تمہیں پا جائیں تو پھر گلا نہ چھوڑیں۔ کہو تو آماں سے کہوں۔ یہاں تمہاری آزادی میں کوئی خلل نہ دے گا۔ بولو۔ کہوں جا کر آماں سے ؟

ندو (شرماتے ہوئے) وہ مسئلہ تو حل ہو چکا۔ ماں باپ نے جس سے مناسب سمجھا بیاہ دیا۔ میں نے زبان تک نہیں کھولی۔

صوفیہ۔ ارے یہ کب؟

ندو۔ اس کو تو دو سال ہو گئے (آنکھیں نیچی کرکے) اگر میرا اپنا بس ہوتا تو اُن کو کبھی نہ بیاہتی۔ چاہے کنواری ہی رہتی۔ میرے مالک مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دولت کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن میں اُن کے دل کے صرف ایک چوتھائی کی مالکہ ہوں۔ اُس کے تین حصے رفاہ عام کے کاموں کی نذر ہوتے ہیں۔ ایک کے بدلے چوتھائی پاکر کون آسودہ ہو سکتا ہے؟ مجھے تو باجرے کی پوری بسکٹ کے چوتھائی حصے سے کہیں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بھوک تو رفع ہو جاتی ہے جو کھانا کھانے کا واقعی مقصد ہے۔

صوفیہ۔ آپ کی مذہبی آزادی میں تو خلل نہیں ڈالتے؟

ندو۔ نہیں۔ اُنہیں اتنی فرصت کہاں ہے؟

صوفیہ۔ تب تو میں آپ کو مبارک باد دوں گی۔

ندو۔ اگر کسی قیدی کو مبارکباد دینا مناسب ہو تو شوق سے دو۔

صوفیہ۔ زنجیر محبت کی ہو تو؟

ندو۔ ایسا ہوتا تو میں خود ہی تم سے مبارک باد دینے کے لئے اصرار کرتی۔ میں بندھ گئی وہ آزاد ہیں۔ مجھے یہاں آئے تین مہینے ہونے آتے ہیں پر تین دفعہ سے زیادہ نہیں آئے اور وہ بھی ایک ایک گھنٹہ کے لئے! اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دس منٹ میں موٹر آسکتی ہے۔ مگر اتنی فرصت کس کو ہے؟ ہاں خطوط سے اپنی ملاقات کا کام نکالنا چاہتے

ہیں۔ اور وہ خطوط بھی کیسے ہوتے ہیں؟ اوّل سے آخر تک اپنے دُکھڑوں سے بھرے ہوئے۔ آج یہ کام ہے کل وہ کام ہے۔ ان سے ملنے جانا ہے۔ اُن کا خیر مقدم کرنا ہے۔ میونسپلٹی کے چیرمین کیا ہو گئے راج مل گیا۔ جب دیکھو۔ وہی دُھن سوار۔ اور سب کاموں کے لئے فرصت ہے۔ اگر فرصت نہیں ہے تو صرف یہاں آنے کی! میں تم کو متنبہ کئے دیتی ہوں کسی ملک و قوم کے خادم سے بیاہ نہ کرنا ورنہ پچھتاؤگی۔ تم اُس کے فرصت کے وقت کی محض ایک دل بہلاؤ کی چیز رہو گی ؛

صوفیہ۔ میں تو پہلے ہی اپنی رائے قایم کر چکی۔ سب سے الگ ہی الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں میری آزادی میں خلل ڈالنے والا کوئی نہ ہو۔ میں ٹھیک راستہ پر چلوں گی یا غلط پر۔ یہ ذمہ داری بھی اپنے ہی سر لینا چاہتی ہوں۔ میں بالغ ہوں اور اپنا نفع نقصان خود سمجھ سکتی ہوں تمام عمر کسی کی حفاظت میں نہیں رہنا چاہتی کیونکہ اس حفاظت کے معنی غلامی کے سوا اور کچھ نہیں ؛

اندو۔ کیا تم اپنے ماما اور پاپا کے تحت میں نہیں رہنا چاہتی ؟

صوفیہ۔ نا۔ ماتحتی میں نوعیت کا نہیں۔ صرف حدود کا فرق ہے ؛

اندو۔ تو میرے ہی گھر کیوں نہیں رہتیں؟ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ اور اماں جی تو تم کو آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھیں گی۔ میں چلی جاتی ہوں تو وہ اکیلی گھبرایا کرتی ہیں۔ تمہیں پا جائیں تو پھر گلا نہ چھوڑیں۔ کہو تو اماں سے کہوں۔ یہاں تمہاری آزادی میں کوئی خلل نہ دے گا۔ بولو۔ کہوں جا کر اماں سے ؟

صوفیہ۔ نہیں ابھی بھول کر بھی نہیں۔ آپ کی اماں جی کو جب معلوم ہوگا۔ کہ اس کے ماں باپ اس کی بات نہیں پوچھتے تو میں اُن کی نظروں سے بھی گر جاؤں گی۔ جس کی اپنے گھر میں عزت نہیں اُس کی باہر بھی عزت نہیں ہوتی ۔

اندو۔ نہیں۔ صوفی! اماں جی کا سوبھاؤ بالکل نرالا ہے۔ جس بات سے تمہیں اپنی بے عزتی کا خوف ہے۔ وہی بات اماں جی سے عزت پانے کی چیز ہے۔ وہ خود اپنی ماں سے کسی بات پر ناراض ہو گئی تھیں۔ جب سے مائیکے نہیں گئیں۔ نانی مر گئیں پر اماں جی نے اُنہیں معاف نہیں کیا۔ سینکڑوں بلاوے آئے پر اُن کو دیکھنے تک نہ گئیں۔ اُنہیں جوں ہی یہ بات معلوم ہوگی۔ تمہاری دونی عزت کرنے لگیں گی ۔

صوفیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "بہن! میری لاج اب آپ ہی کے ہاتھ ہے"۔

اندو نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کہا "وہ مجھے اپنی لاج سے کم عزیز نہیں ہے"۔

اُدھر مسٹر جان سیوک کو کنور صاحب کا خط ملا۔ تو آ کر بیوی سے بولے "دیکھا میں کہتا نہ تھا۔ کہ صوفی پر کوئی مصیبت آ پڑی۔ یہ دیکھو! کنور بھرت سنگھ کا خط ہے۔ تین روز سے اُن کے گھر پڑی ہوئی ہے اُن کے ایک جھونپڑے میں آگ لگ گئی تھی۔ اُس کے بجھانے میں وہ بھی مصروف تھی۔ کہیں لپٹ لگ گئی"۔

مسز سیوک۔ یہ سب بہانے ہیں۔ مجھے اُس کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا۔ جس کا دل خدا سے پھر گیا اُسے جھوٹ بولنے سے کیا ڈر؟

یہاں سے بگڑ کر گئی تھی ۔ سمجھا ہوگا ۔ گھر سے نکلتے ہی پھولوں کی سیج بچھی ہوئی ملے گی ۔ جب کہیں ٹھکانا نہ لگا تو یہ خط لکھوا دیا ۔ اب آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا نے اُس کے کفر کی یہ سزا دی ہو ؎

جان سیوک ۔ چپ بھی رہو ۔ تمہاری بیدردی پر مجھے تعجب ہوتا ہے ۔ میں نے تم جیسی سخت دل کی عورت نہیں دیکھی ؎

مسز سیوک ۔ میں تو نہیں جاتی ۔ تمہیں جانا ہو ۔ جاؤ !

جان سیوک ۔ مجھے تو دیکھ رہی ہو ۔ مرنے کی فرصت نہیں ہے ۔ اُسی پانڈے پور والی زمین کے بارہ میں بات چیت کر رہا ہوں ۔ ایسے موذی سے پالا پڑا ہے کہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا ۔ دیہاتیوں کو جو لوگ سادہ لوح کہتے ہیں ۔ بڑی غلطی کرتے ہیں ۔ ان سے زیادہ چالاک آدمی ملنا مشکل ہے ۔ تمہیں اس وقت کوئی کام نہیں ہے ۔ موٹر منگائے دیتا ہوں ۔ شان سے چلی جاؤ اور اُس کو اپنے ساتھ لیتے آؤ ؎

ایشور سیوک وہیں آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے ہوئے یادِ الٰہی میں محو تھے ۔ جیسے بہرا آدمی مطلب کی بات سنتے ہی چونک پڑتا ہے موٹر کار کا ذکر سنتے ہی دھیان ٹوٹ گیا ۔ بولے ۔ موٹر کی کیا ضرورت ہے ؟ کیا دس پانچ روپے کاٹ رہے ہیں ؟ یوں اُڑنے کے لئے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہوگا ۔ کیا گاڑی پر جانے سے شان میں فرق آجائے گا ؟ تمہاری موٹر دیکھ کر کنور صاحب رعب میں نہ آئیں گے ۔ اُنہیں خدا نے بہتیری موٹریں دی ہیں ۔ یسوع ! مجھے اپنے دامن میں لو ! اب دیر نہ کرو ! میری صوفی بیچاری وہاں بیگانوں میں پڑی

ہوئی ہے۔ نہ جانے اتنے دن کس طرح کاٹے ہوں گے؟ خدا اُس کو راہ راست پر لائے۔ میری آنکھیں اُس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ جب سے وہ گئی ہے کلام پاک سننے کی نوبت نہیں آئی۔ یسوع! اُسے اپنے دامن میں لے! وہاں اُس بیچاری کا کون پوچھنے والا ہے؟ امیروں کے گھر میں غریبوں کا گزر کہاں؟

جان سیوک۔ اچھا ہی ہوا۔ یہاں ہوتی تو روزانہ ڈاکٹر کی فیس نہ دینی پڑتی؟

ایشور سیوک۔ ڈاکٹر کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ کے فضل سے میں خود تھوڑی بہت ڈاکٹری جانتا ہوں۔ گھر والوں کی محبت و تیمار داری ڈاکٹر کی دواؤں سے کہیں زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔ میں اپنی بچّی کو گود میں لے کر کلام پاک سُناتا۔ اُس کے لئے خدا سے دعا مانگتا۔

مسز سیوک۔ تو آپ ہی چلے جائیے نا؟

ایشور سیوک۔ بسر و چشم۔ میرا تانگہ منگوا دو۔ ہم سب کو چلنا چاہئے۔ گمراہوں کو محبّت ہی راہ راست پر لاتی ہے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ بیٹی! امیروں کے سامنے عاجزی دکھلانی پڑتی ہے۔ اُن سے برابری کا دعوےٰ نہیں کیا جاتا۔

جان سیوک۔ مجھے ابھی ساتھ نہ لے جائیے۔ میں کسی دوسرے موقع پر جاؤں گا۔ اس وقت وہاں بجز رسمی شکر گزاری کے اور کوئی کام نہ ہوگا میں اُن کا شکریہ ادا کروں گا۔ وہ میرا۔ میں اِس تعارف کو غیبی امداد سمجھتا ہوں۔ اطمینان سے ملوں گا۔ کنور صاحب کا شہر میں خاصا دباؤ ہے۔ میونسپلٹی کے صدر اُن کے داماد ہیں۔ ان کی مدد سے [illegible] پور والی زمین

مجھ کو بہت آسانی سے مل جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ چند حصے بھی خرید لیں۔ مگر آج ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔

ایشور سیوک۔ مجھے تمہاری اس فراست پر ہنسی آتی ہے۔ جس آدمی سے ربط ضبط پیدا کرکے تمہارے اتنے کام نکل سکتے ہیں اُس سے ملنے میں بھی تمہیں اتنا تامل ہے۔ تمہارا وقت اتنا قیمتی ہے کہ نصف گھنٹے کے لئے بھی وہاں نہیں جا سکتے؟ اوّل ہی ملاقات میں ساری باتیں طے کر لینا چاہتے ہو۔ ایسا سنہرا موقع پاکر بھی تمہیں اُس سے فائدہ اُٹھانا نہیں آتا۔

جان سیوک۔ خیر آپ کا اصرار ہے تو میں ہی چلا جاؤں گا۔ میں ایک ضروری کام کر رہا تھا۔ پھر کرلوں گا۔ آپ کو تکلیف اُٹھانے کی ضرورت نہیں (بیوی سے) تم تو چل رہی ہو؟

مسز سیوک۔ مجھے ناحق لے چلتے ہو۔ مگر خیر چلو!

کھانا کھاکر چلنا طے ہوا۔ انگریزی رواج کے مطابق یہاں دن کا کھانا ایک بجے ہوتا تھا۔ درمیانی وقت تیاریوں میں صرف ہوا۔ مسز سیوک نے اپنے زیور نکالے جنہیں اُنہوں نے عالم ضعیفی میں بھی ترک نہیں کیا تھا۔ اپنا بہترین گون اور بلاؤز نکالا۔ اتنا بناؤ سنگار وہ اپنے سال گرہ کے دن کے علاوہ اور کسی تقریب پر نہ کرتی تھیں۔ مطلب تھا صوفیہ کو جلانا اُس کو دکھانا کہ تیرے چلے آنے سے میں رورو کر مری نہیں جارہی ہوں۔ کوچوان کو گاڑی دھوکر صاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ پربھو سیوک کو بھی ساتھ لے چلنے کی رائے ہوئی۔ لیکن جان سیوک نے اُس کے کمرہ میں جاکر دیکھا تو اُس کا پتہ نہ تھا۔ اس کی میز پر ایک فلسفہ کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اُٹھ کر کہیں چلا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب

تین روز سے اسی طرح کھلی پڑی تھی۔ پربھو سیوک کو اُسے بند کرکے رکھ دینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ وہ صبح سے دو گھڑی رات گئے تک شہر کا چکر لگایا کرتا۔ صرف دو بار کھانا کھانے گھر پر آتا تھا۔ ایسا کوئی اسکول نہ تھا جہاں اُس نے صوفی کو نہ تلاش کیا ہو۔ کوئی شناسا۔ کوئی دوست ایسا نہ تھا۔ جس کے گھر جاکر اُس نے کھوج نہ کی ہو۔ تمام دن کی دوا دوش کے بعد رات کو مایوس ہوکر لوٹ آتا اور چارپائی پر لیٹ کر گھنٹوں سوچتا اور روتا۔ کہاں چلی گئی؟ پولیس کے دفتر میں دن میں دس دس بار جاتا اور پوچھتا۔ کچھ پتہ چلا؟ اخباروں میں بھی اعلان کر دیا تھا۔ وہاں بھی روزانہ کئی کئی بار جاکر دریافت کرتا۔ اُسے یقین ہوتا جاتا تھا کہ صوفی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ آج بھی حسب معمول ایک بجے تھکا ہوا اور اُداس لوٹ کر گھر آیا تو جان سیوک نے مژدہ سنایا کہ صوفی کا پتہ مل گیا۔

پربھو سیوک کا چہرہ شگفتہ ہو گیا بولا ”سچ؟ کہاں ہے؟ کیا اُس کا کوئی خط آیا ہے؟“

جان سیوک۔ کنور بھرت سنگھ کے مکان پر ہے۔ آؤ کھانا کھا لو۔ تمہیں بھی وہاں چلنا ہے۔

پربھو سیوک۔ میں تو لوٹ کر کھانا کھاؤں گا۔ بھوک غائب ہو گئی ہے تو اچھی طرح ہے؟

مسز سیوک۔ ہاں ہاں۔ بہت اچھی طرح ہے! خدا نے یہاں سے روٹھ کر جانے کی سزا دے دی۔

پربھو سیوک۔ ماما! خدا نے آپ کا دل نہ جانے کس پتھر کا بنایا ہے۔

کیا گھر سے آپ ہی آپ روٹھ کر چلی گئی تھی؟ آپ ہی نے اُسے نکالا اور اب بھی آپ کو اُس پر ذرا رحم نہیں آتا!

مسز سیوک۔ گنا ہوں پر رحم کرنا گناہ ہے ؀

پربھو سیوک۔ اگر صوفی گمراہ ہے تو عیسائیوں میں ۹۹ فی صدی آدمی گمراہ ہیں! وہ مذہب کا سوانگ نہیں بھرنا چاہتی۔ اُس میں یہی عیب ہے نہیں تو حضرت عیسےٰ پر جتنا اعتقاد اُس کو ہے اُتنا اُنہیں بھی نہ ہوگا جو عیسےٰ پر جان دینے کا دم بھرتے ہیں ؀

مسز سیوک۔ خیر معلوم ہوگیا کہ تم اُس کی وکالت خوب کرسکتے ہو۔ مجھے ان دلایل کے سُننے کی فرصت نہیں ؀

یہ کہہ کر مسز سیوک وہاں سے چلی گئیں۔ کھانے کا وقت آیا۔ لوگ میز پر بیٹھے۔ پربھو سیوک بہت اصرار کرنے پر بھی نہ گیا۔ تینوں آدمی فٹن میں بیٹھے تو ایشور سیوک نے چلتے چلتے جان سیوک سے کہا "صوفی کو ضرور ساتھ لانا اور اُس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ یسوع تمہیں عقل عطا کریں اور کامیابی ؀

ذرا دیر میں فٹن کنور صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔ کنور صاحب نے بڑے تپاک سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ مسز سیوک نے دل میں ٹھان لی تھی کہ میں صوفیہ سے ایک لفظ بھی نہ بولوں گی۔ دور ہی سے کھڑی دیکھتی رہوں گی۔ لیکن جب صوفیہ کے کمرہ میں پہنچی۔ اور اُس کا پژمردہ چہرہ دیکھا تو دل پر قابو نہ رہا۔ ماما اُبل پڑی۔ بے اختیار اُس سے لپٹ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس بہاو میں صوفیہ کی دلی کدورت بھی بہ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ ماں کی گردن میں ڈال دئے اور کئی منٹ

دونوں محبت کے روحانی مزہ سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ جان سیوک نے صوفیہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مگر پربھو سیوک آنکھوں میں آنسو بھرے اُس کے سامنے کھڑا رہا۔ بہن کو چھوتے ہوئے اُسے خوف ہوتا تھا کہ مبادا دل نہ پھٹ جائے۔ ایسے موقعوں پر اُس کا دل اور زبان دونوں ساکت و بیکار ہو جاتے تھے۔

جب جان سیوک صوفی کو دیکھ کر کنور صاحب کے ساتھ باہر چلے گئے۔ تو مسز سیوک بولیں "تجھے اُس دن کیا سوجھی کہ یہاں چلی آئی! یہاں اجنبیوں میں پڑے پڑے تیری طبیعت گھبراتی رہی ہوگی۔ یہ لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں تیری بات بھی نہ پوچھتے ہوں گے"۔

صوفیہ۔ نہیں ماما۔ یہ بات نہیں ہے۔ گھمنڈ تو یہاں کسی میں چھو تک نہیں گیا ہے۔ سبھی ہمدردی اور انکسار کے پتلے ہیں۔ یہاں تک کہ نوکر چاکر بھی اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ مجھے آج چوتھے دن ہوش آیا ہے۔ پر ان لوگوں نے اتنی محبت سے تیمارداری نہ کی ہوتی تو شاید مجھے ہفتوں تک بستر علالت پر پڑا رہنا ہوتا۔ میں اپنے گھر میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنے ہی آرام سے رہتی۔

مسز سیوک۔ تم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی۔ تو کیا یہ لوگ اتنا کرنے سے بھی رہتے؟

صوفیہ۔ نہیں ماما یہ لوگ نہایت خلیق اور نیک ہیں۔ خود رانی جی عموماً میرے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھلتی رہتی ہیں۔ کنور صاحب دن میں کئی بار آ کر دیکھ جاتے ہیں۔ اور اندو سے تو میرا بہناپا سا ہو گیا ہے۔ یہی لڑکی ہے جو میرے ساتھ نینی تال میں پڑھا کرتی تھی۔

مسز سیلوک (چڑ کر) تجھے دوسروں میں سب وصف ہی وصف نظر آتے ہیں۔ بُرائیاں سب گھروالوں ہی کے حصّہ میں پڑی ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے مذہب بھی اپنے سے اچھے ہیں ؀

پربھو سیلوک۔ ماما! آپ تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ اٹھتی ہیں۔ اگر کوئی اپنے ساتھ اچھا سلوک کرے تو کیا اُس کا احسان نہ مانا جائے ؟ احسان فراموشی سے بُرا کوئی عیب نہیں ہے ؀

مسز سیلوک۔ یہ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ گھروالوں کی بُرائی کرنا تو اُس کی عادت میں داخل ہے۔ یہ مجھے جتانا چاہتی ہے کہ یہ لوگ اُس کے ساتھ مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ دیکھوں یہاں سے جاتی ہے تو کون سی سوغات دے دیتے ہیں + کہاں ہیں تیری رانی صاحبہ ؟ میں بھی اُن کا شکریہ ادا کر دوں۔ اُن سے اجازت لے لو اور گھر چلو۔ پاپا اکیلے گھبرا رہے ہوں گے ؀

صوفیہ۔ وہ تو تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔ وہ یہاں کب کی آ گئی ہوتیں۔ لیکن شاید ہمارے درمیان میں بغیر بُلائے آنا مناسب نہ سمجھتی ہوں گی ؀

پربھو سیلوک۔ ماما! ابھی صوفی کو یہاں دو چار دن اور آرام سے پڑی رہنے دیجئے۔ ابھی اُس کو اُٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ دیکھئے نا کتنی کمزور ہو گئی ہے ؀

صوفیہ۔ رانی جی بھی یہی کہتی تھیں کہ ابھی میں تم کو نہ جانے دوں گی +

مسز سیلوک۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ تیرا ہی جی یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔ وہاں تیرا اتنا پیار کون کرے گا ؟

صوفیہ۔ نہیں ماما! آپ میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہیں۔ میں اب یہاں ایک دن بھی اور نہیں رہنا چاہتی۔ میں اب ان لوگوں کو زیادہ تکلیف نہ دوں گی۔ مگر ایک بات مجھے معلوم ہو جانی چاہئے۔ مجھ پر پھر تو ظلم نہ کیا جائے گا؟ میری مذہبی آزادی میں پھر تو کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی؟

پر بھوسیوک۔ صوفی! تم خواہ مخواہ اِن باتوں کا تذکرہ کیوں کرتی ہو؟ تمہارے ساتھ کون سا جبر کیا جاتا ہے؟ ذرا سی بات کا تبنگڑ بناتی ہو۔

مسز سیوک۔ نہیں۔ تو نے یہ بات پوچھ لی۔ بہت اچھا کیا۔ میں بھی تجھے مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میرے گھر میں یسوع کے مخالفین کے لئے جگہ نہیں ہے۔

پر بھوسیوک۔ آپ ناحق اُس سے الجھتی ہیں۔ سمجھ لیجئے کوئی ہذیان بک رہی ہے۔

مسز سیوک۔ کیا کروں؟ میں نے تمہاری طرح فلسفہ نہیں پڑھا۔ واقع کو خواب نہیں سمجھ سکتی۔ یہ وصف تو فلاسفروں ہی میں ہو سکتا ہے یہ مت سمجھو کہ مجھے اپنی اولاد سے محبت نہیں ہے۔ خدا جانتا ہے۔ میں نے تمہاری خاطر کیا کیا تکلیفیں نہیں اُٹھائیں اس وقت تمہارے پاپا ایک دفتر میں کلرک تھے۔ گھر کا سارا کام کاج مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ بازار جاتی۔ کھانا پکاتی۔ جھاڑو لگاتی۔ تم دونوں ہی بچپن میں کمزور تھے روز ہی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ گھر کے کاموں سے ذرا فرصت ملتی تو ڈاکٹروں کے پاس جاتی۔ اکثر تمہیں گود میں لئے ہی لئے راتیں کٹ جاتیں۔ اتنی قربانی سے پالی ہوئی اولاد کو حب ایشور سے منحرف ہوتے دیکھتی

ہوں تو میں غم و غصہ سے پاگل ہو جاتی ہوں۔ تمہیں میں سچا ایمان کا پکّا۔
یسوع کا بندہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس جب تمہیں یسوع سے
مُنہ موڑتے دیکھتی ہوں۔ اُن کی زندگی اُن کے وعظ اُن کے معجزات
پر شبہ کرتے پاتی ہوں۔ تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہی جی
چاہتا ہے کہ اس کی صورت نہ دیکھوں۔ مجھے اپنا مسیح ساری دنیا سے
اولاد سے یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے ؎

صوفیہ۔ آپ کو یسوع اتنا عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی روح اپنا ایمان
اُس سے کم عزیز نہیں ہیں۔ میں ان پر کسی قسم کا جبر ہونا برداشت نہیں
کر سکتی ؎

مسنر سیوک۔ خدا تجھے اس کفر کی سزا دے گا۔ میری اُس سے یہی
دُعا ہے کہ وہ پھر مجھے تیری صورت نہ دکھائے ؎

یہ کہہ کر مسنر سیوک کمرہ سے باہر نکل آئیں۔ رانی صاحبہ اور آندو اُدھر
سے آ رہی تھیں۔ دروازہ پر اُن سے ملاقات ہو گئی۔ رانی صاحبہ مسنر سیوک
کے گلے لپٹ گئیں اور تشکر آمیز الفاظ کا دریا بہا دیا۔ مسنر سیوک کو اس
خالص محبت میں تصنع کی بو آئی۔ لیکن رانی صاحبہ کو مردم شناسی کا ملکہ
نہ تھا۔ آندو سے بولیں "دیکھ اس صوفیہ سے کہہ دے کہ ابھی جانے
کی تیاری نہ کرے۔ مسنر سیوک! آپ میری خاطر سے صوفیہ کو ابھی دو چار
روز اور یہاں رہنے دیں۔ میں آپ سے عاجزانہ اصرار کرتی ہوں۔ ابھی
میری طبیعت اُس کی باتوں سے سیر نہیں ہوئی اور نہ میں اُس کی کچھ
خدمت ہی کر سکی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔ میں خود اُس کو آپ
کے پاس پہنچا دوں گی۔ جب تک وہ یہاں رہے گی آپ سے کم از کم دو دفعہ

ایک مرتبہ ملاقات ہوتی رہے گی ۔ آپ خوش نصیب ہیں۔ آپ کو ایسی اچھی لڑکی ملی۔ رحم اور روشن خیالی کا مجسمہ ہے۔ ایثار تو اُس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

مسز سیلوک۔ میں اُسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتی۔ آپ جتنے دن چاہیں شوق سے رکھیں۔

رانی۔ بس بس میں اتنا ہی چاہتی تھی۔ آپ نے مجھے خرید لیا۔ آپ سے ایسی ہی امید بھی تھی۔ آپ خود اس قدر خلیق نہ ہوتیں تو صاحبزادی میں یہ اوصاف کہاں سے آتے؟ ایک میری آندرو ہے کہ باتیں کرنے کا بھی طریقہ نہیں جانتی۔ ایک بڑی ریاست کی رانی ہے پر اتنا بھی نہیں جانتی کہ میری سالانہ آمدنی کیا ہے۔ لاکھوں کے زیورات صندوق میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُنہیں چھوتی تک نہیں۔ ہاں گھومنے کو کہہ دیجئے تو دن بھر گھوما کرے۔ کیوں آندرو! جھوٹ کہتی ہوں؟

اندرہ۔ تو کیا کروں؟ من بھر سونا لادے بیٹھی رہوں؟ مجھے تو اس طرح اپنے جسم کو جکڑنا اچھا نہیں لگتا۔

رانی۔ سُنی آپ نے اُس کی باتیں؟ گہنوں سے اس کا جسم جکڑ جاتا ہے! آئیے! اب آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔

مسز سیلوک۔ مسٹر سیلوک باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ دیر ہو گئی۔

رانی۔ واہ اتنی جلدی! کم از کم آج یہاں کھانا تو تناول فرمائیے۔ لنچ کھا کر ہوا کھانے چلیں۔ پھر لوٹ کر کچھ دیر گپ شب کریں۔ رات کا کھانا کھا لینے کے بعد میری موٹر آپ کو گھر پہنچا دے گی۔

مسز سیوک انکار نہ کر سکیں، رانی نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے محل کی سیر کرانے لگیں، نصف گھنٹہ تک مسز سیوک گویا عالم طلسمات کی سیر کرتی رہیں۔ محل کیا تھا، تفریح۔ آسایش، شوق اور عظمت کا تماشا گاہ تھا، سنگ مرمر کے فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوتے تھے۔ چلتے وقت اُن میں پیر گھس جاتے تھے۔ دیواروں پر دلفریب مرقع کاری۔ کمروں کی دیواروں پر بڑے بڑے قد آدم آئینے نقش و نگار اس قدر خوب صورت کہ آنکھیں محو ہو جائیں۔ شیشہ کی قیمتی کمیاب اشیاء قدیم مصوروں کی صنعت کے نمونے۔ چینی کے بڑھیا گلدان۔ جاپان۔ چین۔ یونان۔ اور ایران کے صنعتی کمال کی عمدہ مثالیں۔ سونے کے گملے لکھنؤ کے بولتے ہوئے کھلونے۔ اٹلی کے بنے ہوئے ہاتھی دانت کے پلنگ۔ لکڑی کے نفیس طاق۔ دیوار گیریں کشتیاں۔ آنکھوں کو لبھانے والی پنجروں میں چہکتی ہوئی طرح طرح کی چڑیاں صحن میں سنگ مرمر کا حوض اور اُس کے کنارے سنگ مرمر کی حوریں، مسز سیوک نے ان ساری چیزوں میں سے کسی کی تعریف نہیں کی۔ کہیں بھی حیرت یا مسرت کا ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکالا۔ اُنہیں خوشی کے بجائے حسد ہوتا تھا۔ حسد میں قدردانی کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ ایک یہ خوش قسمت ہیں کہ خدا نے اُن کو عیش و تکلف۔ آسایش و تفریح کی اتنی چیزیں دے رکھی ہیں۔ ایک بدقسمت میں ہوں کہ ایک جھونپڑے میں پڑی ہوئی دن کاٹ رہی ہوں! سجاوٹ اور بناوٹ کا تو ذکر ہی کیا۔ ضروری چیزیں بھی کافی نہیں۔ اس پر طُرّہ یہ کہ ہم صبح سے شام تک جان توڑ محنت کرتے ہیں۔ یہاں کوئی تنکا تک نہیں اٹھاتا۔ لیکن اس کا غم کیا؟ آسمان کی

بادشاہت میں تو امیروں کا حصّہ نہیں۔ وہ تو ہماری میراث ہوگی۔ امیر لوگ کتّوں کی طرح ڈنکارے جائیں گے۔ کوئی جھانکنے تک نہ پائے گا۔

اس خیال سے اُنہیں گو نہ تشفی ہوئی۔ حسد کی ہمہ گیری ہی مساوات عامّہ کے اصولوں کی ہر دل عزیزی کا سبب ہے۔ رانی صاحبہ کو تعجب ہو رہا تھا کہ ان کو میری کوئی چیز پسند نہ آئی۔ کسی چیز کی تعریف نہ کی میں نے ایک ایک تصویر اور ایک ایک پیالہ کے لئے ہزاروں روپے خرچ کئے ہیں۔ ایسی چیزیں یہاں اور کس کے پاس ہیں؟ اب نایاب ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی نہ ملیں گی۔ کچھ نہیں یا تو یہ بن رہی ہیں یا ان میں اتنی پرکھ نہیں کہ ایسی چیزوں کی قدر کر سکیں۔

اتنے پر بھی رانی صاحبہ مایوس نہیں ہوئیں۔ اُن کو اپنا باغ دکھانے گئیں طرح طرح کے پھول اور پودے دکھائے۔ مالی بڑا ہوشیار تھا۔ ہر پودے کے حالات و اوصاف بیان کرتا جاتا تھا۔ کہاں سے آیا۔ کب آیا کس طرح نصب کیا گیا۔ کیسے اُس کی حفاظت کی جاتی ہے پر مسز سیوک کا مُنہ اب بھی نہ کُھلا۔ یہاں تک کہ آخر میں اُس نے ایک ایسی ننھی سی جڑی بوٹی دکھائی جو یروشلم سے لائی گئی تھی۔ کنور صاحب اُسے خود ہی نہایت احتیاط سے لائے تھے۔ اور اس میں ایک ایک پتّی کا نکلنا اُن کے لئے ایک ایک خوشخبری تھی۔ مسز سیوک نے فوراً ہی اُس گملے کو اُٹھا لیا۔ اُسے آنکھوں سے لگایا اور پتّیوں کو بوسہ دیا۔ بولیں "میری خوش نصیبی ہے کہ اس نایاب شے کی زیارت نصیب ہوئی"

رانی نے کہا یہ کنور صاحب خود اس کی نہایت قدر کرتے ہیں۔ اگر یہ آج خشک ہو جائے تو دو روز تک وہ یقیناً کھانا نہ کھائیں۔

اِس اثنا میں چاء تیار ہوئی مسنر سیوک لنچ پر بیٹھیں۔ رانی جی کو چاء سے رغبت نہ تھی۔ وہ سنے اور آنڈو کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ وہ سنے کے عادات و اخلاق۔ خدمت و اطاعت۔ جود و سخا کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ مسنر سیوک کا جی اُکتا گیا۔ اس کے جواب میں وہ اپنی اولاد کی ثنا خوانی نہ کر سکتی تھیں ۔

اُدھر مسٹر جان سیوک اور کنور صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے لنچ تناول کر رہے تھے ۔ چاء اور انڈوں سے کنور صاحب کو رغبت نہ تھی۔ وہ سنے بھی ان دونوں چیزوں کو قابل ترک سمجھتے تھے۔ جان سیوک اُن آدمیوں میں سے تھے جن کی شخصیت جلد ہی دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اُن کی باتیں اس قدر عالمانہ ہوتی تھیں کہ اور لوگ اپنی باتیں بھول کر اُنہیں کی سُننے لگتے تھے۔ اور یہ بات نہ تھی کہ اُن کی گفتگو میں فقط لسانی ہو۔ اُن کے معلومات وسیع تھے۔ اُن کو طبائع انسانی کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ ذہانت خدا داد تھی جس کے بغیر کسی مجلس میں عزت نہیں مل سکتی ۔ اس وقت وہ مُلک کی صنعت و حرفت کی تباہی پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ موقع سے اُن تجاویز کا بھی ذکر کرتے جاتے تھے ۔ جو اِن حالات کے اصلاح کے لئے اُنھوں نے سوچ رکھی تھیں۔ آخر میں بولے ”ہمارے مُلک کی نجات صنعت و حرفت کی ترقی میں ہے۔ اس سگریٹ کے کارخانہ سے کم از کم ایک ہزار آدمیوں کے کسب معاش کی صورت نکل آئے گی اور اُن کا بار زراعت کے سر سے دور ہو جائے گا۔ جتنی زمین کو ایک شخص بخوبی کاشت کر سکتا ہے اُس میں گھر بھر کا لگا رہنا بالکل فضول ہے۔ میرا کارخانہ

ایسے بیکاروں کو اپنی روٹی کمانے کا موقع دے گا ۔

کنور صاحب۔ لیکن جن کھیتوں میں اس وقت اناج بویا جاتا ہے اُنہیں میں تمباکو کی کاشت ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اناج اور مہنگا ہو جائیگا۔

جان سیوک۔ میری سمجھ میں تمباکو کی کاشت کا اثر جوٹ سَن تلہن اور افیون پر پڑے گا۔ رفتنی والی جنس کچھ کم ہو جائے گی۔ غلہ پر اُس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ پھر ہم اُس اراضی کو بھی مزروعہ بنانیکی کوشش کریں گے۔ جو ابھی تک پرتی پڑی ہوئی ہے ۔

کنور صاحب۔ لیکن تمباکو کوئی اچھّی چیز تو نہیں۔ اس کا شمار مسکرات میں ہے اور اُس کا اثر صحت پر بُرا ہی پڑتا ہے ۔

جان سیوک (ہنس کر) یہ سب ڈاکٹروں کی محض فرضی باتیں ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اگر ہم زندگی بسر کرنا چاہیں تو زندگی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ دودھ میں دق وسل کے جراثیم ہیں۔ گھی میں چربی کی مقدار زیادہ ہے چاء اور قہوہ محرک ہیں۔ یہاں تک کہ سانس لینے سے بھی امراض کے جراثیم بدن میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے کہنے کے مطابق تو ساری دُنیا کیڑوں سے بھری ہوئی ہے۔ جو ہماری جان لینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کاروباری لوگ اِن گورکھ دھندوں میں نہیں پھنستے۔ اُن کا تعلق صرف حالاتِ حاضرہ سے ہوا کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں ممالکِ غیر سے کروڑوں روپیے کے سگریٹ اور سگار آتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اِس روپیوں کے بہاؤ کو دوسرے ملکوں میں جانے سے روکیں۔ اس کے بغیر ہماری اقتصادی زندگی کی نمو ناممکن ہے ۔

یہ کہہ کر انہوں نے کنور صاحب کو فاتحانہ انداز سے دیکھا۔ کنور صاحب کے شکوک بہت کچھ رفع ہو چکے تھے۔ عموماً معترض کو لاجواب ہوتے دیکھ کر ہم زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ بچہ بھی بھاگتے ہوئے کتے پر بیخوف ہو کر پتھر پھینکتا ہے ۔

جان سیوک بیخوف ہو کر بولے "میں نے ان تمام پہلوؤں پر غور کر کے یہ رائے قائم کی اور آپ کے اس خادم کو (پربھو سیوک کی طرف اشارہ کر کے) اس فن میں ماہر ہونے کے لئے امریکہ بھیجا۔ میری کمپنی کے بیشتر حصے فروخت ہو چکے ہیں لیکن ابھی روپے نہیں وصول ہوئے ان اطراف میں ابھی تک مشترکہ کاروبار کرنے کا رواج نہیں۔ لوگوں میں اعتبار نہیں۔ اس لئے میں نے ابھی صرف دس فی صدی سرمایہ وصول کر کے کام شروع کر دینا تجویز کیا ہے۔ سال دو سال میں جب امید سے زیادہ کامیابی ہوگی۔ اور سالانہ نفع ہونے لگے گا تو سرمایہ خود بخود دوڑا ہوا چلا آنے لگے گا۔ چھت پر بیٹھا ہوا کبوتر آ آ کی آواز سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور زمین پر نہیں اترتا۔ مگر تھوڑا سا دانہ بکھیر دیجئے تو فوراً اتر آتا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اول ہی سال ہم کو ۲۵ فی صدی منافع ہوگا۔ پراسپکٹس حاضر ہے۔ اسے بغور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے منافع کا اندازہ کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ خواہ زیادہ ہو جائے کم تو ہو ہی نہیں سکتا ۔

کنور صاحب۔ پہلے ہی سال ۲۵ فی صدی؟

جان سیوک۔ جی ہاں۔ بڑی آسانی سے۔ آپ سے میں حصہ خریدنے کی درخواست کرتا۔ لیکن جب تک ایک سال کا منافع دکھلا نہ دوں

اصرار نہیں کرسکتا۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اُس حالت میں ممکن ہے۔ حصّے برابر پر نہ مل سکیں۔ سو کے حصّے شاید دو سو پر ملیں *

کنور صاحب۔ مجھے اب ایک ہی شک اور ہے۔ اگر اس کاروبار میں اس قدر منافع ہوسکتا ہے تو اب تک ایسی اور کمپنیاں کیوں نہ قائم ہوئیں؟

جان سیوک (ہنس کر) اس لئے کہ ابھی تک تعلیم یافتہ جماعت میں کاروبار کی تمیز پیدا نہیں ہوئی۔ لوگوں کی رگ رگ میں غلامی بھری ہوئی ہے۔ وکالت یا سرکاری ملازمت کے سوا اور کسی طرف نگاہ جاتی ہی نہیں۔ دو چار کمپنیاں کھلیں بھی لیکن انھیں کسی ماہر کی رائے اور تجربہ سے فایدہ اُٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تو بہت مہنگا پڑا۔ مشینری منگانے میں ایک کے دو دینے پڑے۔ بندوبست معقول نہ ہوسکا مجبوراً اُن کو کاروبار بند کرنا پڑا۔ یہاں بالعموم سبھی کمپنیوں کا یہی حال ہے۔ ڈائرکٹروں کی جیبیں بھری جاتی ہیں۔ حصّے بیچنے اور اشتہار دینے میں لاکھوں روپیے اُڑا دیئے جاتے ہیں۔ نہایت فیاضی سے دلالوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ عمارتوں پر سرمایہ کا بیشتر حصّہ صرف کردیا جاتا ہے۔ منیجر کو بھی بہت زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ڈائرکٹر صاحبان اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ منیجر اپنی تنخواہ سے مستفید ہوتا ہے۔ دلال اپنی دلالی لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس طرح سارا سرمایہ اوپر ہی اوپر اڑ جاتا ہے۔ میرا اصول ہے کم سے کم خرچ اور زیادہ سے زیادہ نفع۔ میں نے دلالی ایک کوڑی نہیں دی۔ اشتہاروں کی مد اُڑا دی۔ یہاں تک کہ میں نے منیجر کو کل صرف پانچ سو روپیے مشاہرہ پر بنا لے لیا ہے۔ حالانکہ کسی

دوسرے کارخانہ میں ایک ہزار آسانی سے مل جاتے۔ اُس پر گھر کا آدمی ٭
ڈائرکٹر۔ں کے بارہ میں بھی میری یہ تجویز ہے کہ سفر خرچ کے سوا اور
کچھ نہ دیا جائے ٭

کنور صاحب دنیاوی آدمی نہ تھے۔ اُن کا زیادہ وقت صرف مذہبی
کتب کے مطالعہ کے نذر ہوتا تھا۔ وہ کسی ایسے کام میں شریک نہ ہونا
چاہتے تھے جو اُن کی مذہبی یکسوئی میں خلل انداز ہو۔ بڑے لوگوں نے
اُنھیں انسانی عادات کا نکتہ چین بنا دیا تھا۔ انہیں کسی پر اعتبار نہ ہوتا
تھا۔ مدرسوں اور یتیم خانوں کو چندہ دیتے ہوئے وہ بہت ڈرتے تھے۔
اور اکثر ان معاملات میں حدودِ مناسب سے بھی تجاوز کر جاتے تھے۔
مستحقین کو بھی اُن سے مایوس ہو جانا پڑتا تھا۔ لیکن احتیاط میں نفع کا
یقین ہو جانے پر حد سے زیادہ بے احتیاطی پیدا ہو جاتی ہے۔ مسٹر جان سیوک
کی تقریر تاجرانہ معاملہ فہمی سے مملو تھی۔ مگر کنور صاحب پر اس سے زیادہ
اثر اُن کی شخصیت کا پڑا۔ وہ اب اُن کی نگاہوں میں صرف دولت کے
پجاری نہ تھے۔ بلکہ ایک خیر خواہ دوست۔ ایسا شخص اُنھیں مغالطہ نہ
دے سکتا تھا۔ بولے یہ جب آپ اتنی کفایت سے کام کریں گے تو آپ کا
کارخانہ ضرور سرسبز ہو گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ آپ کو شاید ابھی معلوم نہ
ہو۔ میں نے یہاں ایک سیوا سمتی قایم کر رکھی ہے۔ کچھ دنوں سے یہی خبط
سوار ہے۔ اس میں اس وقت تقریباً ایک سو والنٹیر ہیں۔ میلوں میں
عوام کی حفاظت اور خدمت کرنا اُس کا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کو
مالی مشکلات سے ہمیشہ کے لئے فراغت کر دوں۔ ہمارے یہاں کی کام کرنے
والی جماعتیں اکثر روپیہ کی کمی کی وجہ سے صرف چند روز زندہ رہتی ہیں۔

میں اپنی اس جماعت کو مضبوط بنانا چاہتا ہوں اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ اس سے مُلک میں کچھ بہتری ہو۔ میں اس کام میں کسی سے کچھ مدد نہیں لینا چاہتا۔ اُس کو بلا کسی رُکاوٹ کے جاری رکھنے کے لئے میں ایک مستقل سرمایہ کی فراہمی کا بندوبست کر دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھ کر دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ کے کارخانے میں حصّے لے لینے سے میرا مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ آپ کے خیال میں کس قدر روپیہ لگا دینے سے ایک ہزار ماہوار کی آمدنی ہو سکتی ہے؟

جان سیوک کی کاروباری طمع نے ابھی اُن کے نیک ارادوں کو زائل نہیں کر دیا تھا۔ کنور صاحب نے اُن کی رائے پر فیصلہ چھوڑ کر انہیں شش و پنج میں ڈال دیا۔ اگر اُن کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ مسئلہ درپیش ہوگا تو نفع کا تخمینہ بتلانے میں زیادہ احتیاط سے کام لیتے۔ غیروں سے چال بازی کرنا قابل عفو سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے خود غرضی کے بندے کم ہیں گے۔ جو دوستوں سے دغا کریں۔ سادہ مزاج کے آدمیوں کے سامنے فریب بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔

جان سیوک ایسا جواب دینا چاہتے تھے جس میں اپنے فائدہ کا لحاظ بھی ہو اور اپنے ضمیر کا بھی۔ بولے "کمپنی کی جو کچھ حالت ہے وہ میں نے بے کم و کاست آپ سے بیان کر دی۔ اُس کے جاری رکھنے کی ترکیبیں بھی آپ سے بتلا چکا ہوں۔ میں نے کامیابی کے جملہ ذرائع پر نگاہ رکھی ہے۔ اس پر بھی ممکن ہے۔ مجھ سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انسان خدا کے ہاتھوں کا صرف ایک کھلونا ہے۔ اُس کا سارا قیاس ساری عقل مندی ساری خیر اندیشی۔

قدرتی طاقت کے محتاج ہیں۔ تمباکو کی پیداوار بڑھانے کے لئے کاشتکاروں کو پیشگی رقمیں دینی ہی پڑیں گی۔ ایک رات کا پالا کمپنی کے لئے مہلک ثابت ہوسکتا ہے جلتے ہوئے سگریٹ کا ایک ٹکڑا اُس کل کارخانہ کو خاک سیاہ کرسکتا ہے۔ ہاں میری محدود عقل کی وسعت جہاں تک ہے میں نے کوئی بات مبالغہ کے ساتھ نہیں کہی ہے۔ ناگہانی حادثات کے خیال سے آپ نفع کے تخمینہ میں کسی قدر تخفیف کرسکتے ہیں"۔

کنور صاحب۔ آخر کہاں تک؟

جان سیوک۔ بیس فی صدی سمجھئے۔

کنور صاحب۔ اور پہلے سال!

جان سیوک۔ کم از کم پندرہ فی صدی۔

کنور صاحب۔ میں پہلے سال دس اور اُس کے بعد پندرہ فی صدی پر قناعت کرسکوں گا۔

جان سیوک۔ تو پھر میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ حصے خریدنے میں توقف نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کبھی مایوسی نہ ہوگی۔

حصے سو روپے کے تھے۔ کنور صاحب نے پانچ سو حصے خرید لینے کا وعدہ کیا۔ اور بولے "کل اول قسط کے دس ہزار روپے بینک کی معرفت آپ کے پاس بھیج دوں گا"۔

جان سیوک کا زیادہ سے زیادہ تخمینہ بھی اس حد تک کا نہ تھا لیکن وہ اس کامیابی پر خوش نہ ہوئے۔ اُن کا ضمیر اب بھی اُنہیں ملامت کر رہا تھا "تم نے ایک سادہ مزاج شریف آدمی کو دھوکا دیا۔ تم نے ملک کی تجارتی ترقی کے لئے نہیں بلکہ اپنے فائدہ کے لئے یہ کوشش کی

ہے۔ ملک کے خادم بن کر تم اپنی پانچوں انگلیاں گھی میں رکھنا چاہتے ہو تمہارا دلی منشا یہی ہے کہ منافع کا معتد بہ حصہ کسی نہ کسی حیلہ سے خود ہضم کرو۔ تم نے اِس کہاوت پر عمل کیا کہ "بنیا مارے جان۔ چور مارے انجان" چ اگر کنور صاحب کی شرکت سے عوام میں کمپنی کی ساکھ قائم ہو جانے کا یقین نہ ہوتا تو مسٹر جان سیوک صاف کہہ دیتے کہ کمپنی اتنے حصّے آپ کو نہیں دے سکتی۔ ایک مفید خلائق جماعت کے روپے کو کسی مشتبہ کاروبار میں لگا کر اُس کی ہستی کو معرض خطر میں ڈالنا خود غرضی کے لئے بھی ایک لقمۂ تلخ تھا۔ مگر دولت کا دیوتا ضمیر کی قربانی ہوئے بغیر خوش نہیں ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب تک وہ اِس کام کو محض ذاتی نفع کے لئے کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی نیت صاف نہیں تھی۔ منافع کو مختلف ناموں سے اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اب اُنہوں نے بے لوثی کے ساتھ نیک نیتی سے برتاؤ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے "میں کمپنی کے منتظم کی حیثیت سے اس امداد کے لئے آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اِس اپنے فیصلہ پر کبھی کفِ افسوس نہ ملنا پڑے گا۔ اب میں آپ سے ایک اور استدعا کرتا ہوں۔ ع کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ میں نے کارخانہ کے لئے جو زمین پسند کی ہے۔ وہ پانڈے پور کے آگے پختہ سڑک پر واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن بھی وہاں سے نزدیک ہے اور قرب و جوار میں بہت سے موضع ہیں۔ رقبہ دس بیگہ کا ہے۔ زمین پرتی پڑی ہوئی ہے۔ ہاں گاؤں کے مواشی اُس میں چرنے آیا کرتے ہیں۔ اُس کا مالک ایک اندھا فقیر ہے۔ اگر آپ کبھی اُس طرف ہوا خوری کے لئے گئے ہوں گے تو آپ نے اُس اندھے کو ضرور دیکھا ہوگا"۔

کنور صاحب۔ ہاں ہاں۔ ابھی تو کل ہی گیا تھا۔ وہی اندھا ہے نا۔ کالا کالا۔ دُبلا دُبلا۔ جو گاڑیوں کے پیچھے دوڑا کرتا ہے؟

جان سیوک۔ جی ہاں۔ وہی وہی۔ وہ زمین اُسی کی ہے۔ مگر وہ اُس زمین کو کسی قیمت پر بھی نہیں دینا چاہتا۔ میں اُسے پانچ ہزار تک دیتا تھا پر وہ راضی نہ ہوا۔ وہ کچھ سڑی سا ہے۔ کہتا ہے میں یہاں دھرمسالہ مندر اور تالاب بنواؤں گا۔ دن بھر بھیک مانگ کر تو گزر کرتا ہے۔ اُس پر ارادے اتنے بلند ہیں۔ شاید محلہ والوں کے خوف سے اُسے کوئی معاملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ میں ایک ذاتی معاملہ میں حکّام سے مدد لینا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن ایسی حالت میں بجز اُس کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اور پھر یہ بالکل میرا ذاتی معاملہ بھی نہیں ہے۔ میونسپلٹی اور سرکار دونوں کو اس کارخانہ سے ہزاروں روپے سال کی آمدنی ہوگی۔ ہزاروں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا بھلا ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ ایک قومی کام ہے اور پس سرکار سے امداد حاصل کرنے میں میں واجبیت کے خلاف نہیں کرتا۔ اگر آپ ذرا توجہ کریں تو نہایت آسانی سے کام نکل جائے ۔

کنور صاحب۔ میرا اُس فقیر پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اور ہوتا بھی تو میں اُس سے کام نہ لیتا ۔

جان سیوک۔ آپ راجہ صاحب چتاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کنور صاحب۔ نہیں میں اُن سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ میرے داماد ہیں اور اس معاملہ میں میرا اُن سے کہنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ کیا وہ آپ کے حصّہ دار نہیں ہیں؟

مسز سیوک۔ مجھے تو اُن سے نفرت ہوگئی۔ میں نے کسی میں اتنا غرور نہیں دیکھا۔

پربھو سیوک۔ ماما! آپ اُن کے ساتھ سخت ناانصافی کر رہی ہیں۔

مسز سیوک۔ تمہارے لئے دیوی ہوں گی۔ میرے لئے تو نہیں ہیں۔

جان سیوک۔ یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہاری اُن سے نہ پٹے گی۔ کام کی باتیں نہ تمہیں آتی ہیں نہ اُنہیں۔ تمہارا کام تو دوسروں میں عیب نکالنا ہے۔ صوفی کو کیوں نہیں لائیں؟

مسز سیوک۔ وہ آئے بھی تو یا جبراً گھسیٹ لاتی؟

جان سیوک۔ آئی نہیں یا رانی نے آنے نہیں دیا؟

پربھو سیوک۔ وہ تو آنے کو تیار تھی۔ مگر اسی شرط پر کہ مجھ پر مذہبی معاملات میں کوئی جبر نہ کیا جائے۔

جان سیوک۔ انہیں یہ شرط کیوں منظور ہونے لگی؟

مسز سیوک۔ ہاں۔ اس شرط پر میں اُس کو نہیں لا سکتی۔ وہ میرے گھر رہے گی تو میری بات ماننی پڑے گی۔

جان سیوک۔ تم دونوں میں سے ایک کو بھی عقل سے سروکار نہیں۔ تم احمق ہو۔ وہ ضدی۔ اُس کو کسی طرح منا کر جلد لانا چاہئے۔

پربھو سیوک۔ اگر ماما اپنی بات پر اڑی رہیں گی۔ تو شاید وہ پھر گھر نہ جائے۔

جان سیوک۔ آخر جائے گی کہاں؟

پربھو سیوک۔ اُسے کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ رانی اُس پر جان دیتی ہیں۔

جان سیوک۔ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ دو میں سے ایک کو دَبنا پڑے گا۔

لوگ گھر پہنچے تو گاڑی کی آہٹ پاتے ہی ایشور سیوک نے بڑے محبت آمیز اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔ صوفی آگئی نا؟ آ بچھے گلے لگالوں۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں لے!"

جان سیوک۔ پاپا! وہ ابھی یہاں آنے کے قابل نہیں ہے۔ بہت کمزور ہوگئی ہے۔ دو چار دن کے بعد آئے گی۔

ایشور سیوک۔ غضب خدا کا! اس کی یہ حالت ہے اور تم سب اُسے اُس کے حال پر چھوڑ آئے! کیا تم لوگوں میں ذرا بھی غیرت و حمیت نہیں؟ بالکل خون سفید ہوگیا؟

مسز سیوک۔ آپ جاکر اُس کی خوشامد کیجئے گا تو آئے گی۔ میرے کہنے سے تو نہیں آئی۔ بچی تو نہیں کہ گود میں اُٹھالاتی۔

جان سیوک۔ پاپا! وہاں بہت آرام سے ہے۔ راجہ اور رانی دونوں ہی اُس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو رانی ہی نے اُس کو نہیں چھوڑا۔

ایشور سیوک۔ کنور صاحب سے کچھ کام کی بات چیت بھی ہوئی؟

جان سیوک۔ جی ہاں۔ مبارک ہو! پچاس ہزار کی رقم ہاتھ لگی۔

ایشور سیوک۔ شکر ہے۔ شکر ہے یسوع! مجھ پر اپنا سایہ کر۔ یہ کہہ کر وہ پھر آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔

(۴)

شہر کے لڑکوں کے لئے اندھے دل بہلاؤ کی چیز ہوا کرتے ہیں۔ سورداس

کو اُن کی بیرحمانہ حرکتوں سے اتنی تکلیف ہوتی تھی۔ کہ وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل پڑتا تا۔ اور چراغ جلنے کے بعد واپس آتا۔ جس روز اُس کو جانے میں دیر ہو جاتی اُس دن وہ بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ سڑک پر راہگیروں کے سامنے اُس کو کوئی خوف نہ تھا۔ لیکن آبادی کی گلیوں میں قدم قدم کسی سانحہ کا اندیشہ قائم رہتا۔ کوئی اُس کی لاٹھی چھین کر بھاگتا۔ کوئی کہتا "سورداس! سامنے گڑھا ہے! بائیں طرف ہو جاؤ" سورداس اُدھر گھومتا تو گڑھے میں گر پڑتا۔ مگر بجرنگی کا لڑکا گھیسو اتنا شریر تھا کہ وہ محض سورداس کو چھیڑنے کے لئے گھڑی رات رہے اُٹھ بیٹھتا۔ اُس کی لاٹھی چھین کر بھاگنے میں اُسے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک روز قبل طلوع آفتاب سورداس گھر سے چلے تو گھیسو ایک تنگ گلی میں چھپا ہوا کھڑا تھا۔ سورداس کو وہاں پہنچتے ہی کچھ شک ہوا وہ کھڑا ہو کر آہٹ لینے لگا۔ اب گھیسو ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے جھپٹ کر سورداس کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ سورداس ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ گھیسو نے پوری طاقت سے کھینچا۔ ہاتھ پھسل گیا۔ اپنے ہی زور میں گر پڑا۔ سر میں چوٹ لگی۔ خون نکل آیا۔ اُس نے خون دیکھا تو چیختا چلاتا گھر پہنچا۔ بجرنگی نے پوچھا "کیوں روتا ہے رے! کیا ہوا؟" گھیسو نے اُس کو کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکے خوب جانتے ہیں کہ کس عدالت میں اُن کی جیت ہوگی۔ جا کر اپنی ماں سے بولا "سورداس نے مجھے دھکیل دیا" ماں نے سر کی چوٹ کا خون دیکھا تو آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ لڑکے کا ہاتھ پکڑے ہوئے بجرنگی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور بولی "اب اِس اندھے کی شامت آگئی ہے۔ لڑکے کو ایسا دھکیلا کہ

ہو لہان ہو گیا۔ اُس کی اتنی ہمت؟ روپیہ کا گھمنڈ اُتار دوں گی؛ بجرنگی نے مصالحانہ لہجہ میں کہا: اسی نے کچھ چھیڑا ہوگا۔ وہ بیچارہ تو ایس سے اپنی جان چھپاتا پھرتا ہے۔

جمنی۔ اسی نے چھیڑا تھا سہی۔ تو بھی کیا اُس کو اتنی بیدردی سے ڈھکیل دینا چاہئے تھا کہ سر پھٹ جائے؟ اندھوں کو سبھی لڑکے چھیڑتے ہیں پر وہ سب سے کٹھیا تو نہیں کرتے پھرتے۔

اتنے میں سورداس بھی آکر کھڑا ہو گیا۔ چہرہ سے ندامت برس رہی تھی۔ جمنی لپک کر اُس کے سامنے آئی اور بجلی کی طرح کڑک کر بولی۔ کیوں سورداس؟ شام ہوتے ہی روز لٹیا لے کر دودھ کے لئے سر پر سوار ہو جاتے ہو۔ اور ابھی گھیسو نے ذرا لاٹھی پکڑ لی تو اُسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ اُس کا سر پھٹ گیا۔ جس پتّل میں کھاتے ہو اُسی میں چھید کرتے ہو۔ کیوں روپے کا گھمنڈ ہو گیا ہے کیا؟

سورداس۔ بھگوان جانتے ہیں جو میں نے گھیسو کو پہچانا ہو سمجھا کوئی شریر لونڈا ہوگا۔ لاٹھی کو مضبوط پکڑے رہا۔ گھیسو کا ہاتھ پھسل گیا۔ وہ گر پڑا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ گھیسو ہے تو لاٹھی اُس کو دے دیتا۔ اتنے دن ہو گئے کوئی مجھے کہہ دے کہ میں نے کسی لڑکے کو جھوٹ موٹ بھی مارا ہے۔ تمہارا ہی دیا کھاتا ہوں۔ تمہارے ہی لڑکے کو ماروں گا۔

جمنی۔ نہیں۔ اب نہیں گھمنڈ ہو گیا ہے۔ بھیک مانگتے ہو۔ پھر بھی لاج نہیں آتی۔ سب کی برابری کرنے کو مرتے ہو۔ آج میں لہو کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ نہیں تو جن ہاتھوں سے تم نے اُس کو دھکیلا ہے اُس میں لوکا لگا دیتی۔

بجرنگی جمنی کو منع کر رہا تھا۔ اور لوگ بھی سمجھا رہے تھے۔ مگر وہ کسی کی نہ سنتی تھی۔ سوروداس مجرموں کی طرح سر جھکائے پھٹکاریں سُن رہا تھا۔ مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالتا تھا۔

بھیرو، تاڑی اُتارنے جا رہا تھا۔ رک گیا اور سوروداس پر دو چار چھینٹے جا دئے ”زمانہ ہی ایسا ہے۔ سب روزگاروں سے بڑھ کر بھیک مانگنا۔ ابھی چار دن پہلے گھر میں بھونی بھانگ نہ تھی۔ اب چار پیسے کے آدمی ہو گئے ہیں۔ پیسے ہوتے ہیں۔ تبھی گھمنڈ ہوتا ہے۔ نہیں تو کیا گھمنڈ کریں گے ہم اور تم جن کی ایک روپیہ کمائی ہے اور دو کا خرچ ہے۔“

جگدھر اوروں سے تو بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ سوروداس کو لعنت ملامت کرنے کے لئے وہ بھی نکل پڑا۔ سوروداس پچھتا رہا تھا کہ میں نے لاٹھی کیوں نہ چھوڑ دی؟ کون کہے کہ کوئی دوسری لکڑی نہ ملتی؟ جگدھر اور بھیرو کے سخت الفاظ سُن سُن کر وہ اور بھی ملول ہو رہا تھا۔ اُسے اپنی بےکسی پر رونا آتا تھا۔ اسی اثنا میں مٹھوا بھی آ پہنچا۔ یہ بھی شرارت کا پُتلا تھا۔ گھیسو سے بھی دو ہاتھ بڑھا ہوا۔ جگدھر کو دیکھتے ہی یہ بول گُنگنا گُنگنا کر چڑھانے لگا ”لالو کا لال مُنہ جگدھر کا کالا۔ جگدھر تو ہو گیا لالو کا سالا۔“

بھیرو کو بھی اُس نے ایک اپنا بنایا ہوا بول سُنایا ”بھیرو بھیرو تاڑی بیچ۔ یا بیوی کی ساڑی بیچ۔“

چڑنے والے چڑتے کیوں ہیں؟ اس کی تحقیقات تو علم الخیال کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو بالعموم پریم یا بھگتی کی

وجہ سے چڑنے دیکھا ہے۔ کوئی رام یا کرشن کے ناموں سے اس سلئے چڑھتا ہے کہ لوگ اُسے چڑھانے ہی کے بہانے ایشور کا نام لیں۔ کوئی اس لئے چڑھتا ہے۔ کہ لڑکے اُس کو گھیرے رہیں۔ کوئی بینگن یا مچھلی سے اس لئے چڑھتا ہے کہ لوگ ان نہ کھانے لایق چیزوں سے نفرت کریں۔ خلاصہ یہ کہ چڑھنا ایک فلسفیانہ عمل ہے۔ اس کا مقصد صرف سبق دینا ہے۔ لیکن بھیرو اور جگدھر میں یہ عقیدت مندانہ فیاضی کہاں؟ وہ بچوں کے طفلانہ مشاغل سے لطف اُٹھانا کیا جانیں؟ دونوں جھلا اُٹھے۔ جگدھر مٹھوا کو گالیاں دینے لگا لیکن بھیرو کو محض گالیاں دینے سے صبر نہ ہوا۔ اُس نے لپک کر مٹھوا کو پکڑ لیا اور دو تین طمانچے زور زور سے جمائے اور نہایت بیرحمی سے اُس کے کان پکڑ کر کھینچنے لگا۔ مٹھوا بلبلا اُٹھا۔ سورداس ابھی تک خفت آمیز انداز سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ مٹھوا کا رونا سُنتے ہی اُس کے تیور پر بل پڑ گئے۔ اور چہرہ تمتما اُٹھا۔ سر اُٹھا کر اندھی آنکھوں سے تاکتا ہوا بولا "بھیرو! بھلا چاہتے ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ نہیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔ اُس نے تم کو کون سی ایسی گولی ماردی تھی کہ تم اُسے مارے ڈالتے ہو۔ کیا سمجھتے ہو کہ اس کے سر پر کوئی ہے ہی نہیں؟ جب تک میں جیتا ہوں کوئی اُسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ نہیں سکتا۔ دلاوری تو جب دیکھتا کہ کڑے آدمی سے ہاتھ ملاتے۔ اِس لڑکے کو پیٹ دیا تو کون سی بڑی بہادری دکھائی؟"

بھیرو۔ مار کی اتنی اکھر ہے تو اسے روکتے کیوں نہیں؟ ہم کو چڑھائے گا۔ تو ہم پیٹیں گے۔ ایک بار نہیں۔ ہزار بار۔ تم کو جو کرنا ہو کر لو۔

جگدھر۔ لڑکے کو ڈانٹنا تو دور، اوپر سے اور شہ دیتے ہو۔ وہ تمہارا

دولارا ہوگا۔ دوسرے کیوں.......

سوُرداس۔ چُپ بھی رہو آئے ہو وہاں سے نیاؔ لے کرلے۔ لڑکوں کی تو یہ عادت ہی ہوتی ہے پر اُس کے لئے کوئی اُنہیں مار بھی نہیں ڈالتا۔ تمہیں لوگوں کو اگر کسی دوسرے لڑکے نے چڑھایا ہوتا تو منہ تک نہ کھولتے۔ دیکھتا تو ہوں۔ جدھر سے نکلتے ہو۔ لڑکے تالیاں بجا بجا کر چڑھاتے ہیں۔ پر آنکھیں بند کئے اپنی راہ چلے جاتے ہو۔ جانتے ہو ناکہ جن لڑکوں کے ماں باپ ہیں اُنہیں ماریں گے تو وہ آنکھیں نکال لیں گے۔ کیلے کے لئے تو ٹھیکرا بھی تیز ہوتا ہے۔

بھیرو۔ دوسرے لڑکوں کی اور اُس کی برابری ہے؟ دارو غہ جی کی گالیاں کھاتے ہیں تو کیا ڈومڑے کی گالیاں بھی کھائیں؟ ابھی تو دو ہی طمانچے لگائے ہیں پھر چڑھائے تو اُٹھا کر پٹک دوں۔ مرے یا جئے۔

سوُرداس (مٹھوا کا ہاتھ پکڑ کر) مٹھوا چڑھا تو! دیکھوں یہ کیا کرتے ہیں؟ آج جو کچھ ہونا ہے یہیں ہو جائے گا۔

لیکن مٹھوا کے گالوں میں ابھی تک جلن ہو رہی تھی۔ مُنہ بھی سوج گیا تھا۔ سسکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔ بھیرو کا غضب ناک چہرہ دیکھا تو اس کے رہے سہے ہوش بھی اُڑ گئے۔ جب بہت بڑھاوا دینے پر بھی اُس کا مُنہ نہ کھلا۔ تو سورداس نے جھنجھلا کر کہا۔ "اچھا میں ہی چڑھاتا ہوں۔ دیکھوں میرا کیا بنا لیتے ہو؟"

یہ کہہ کر اُس نے لاٹھی مضبوط پکڑ لی۔ اور بار بار اسی بول کی رٹ لگانے لگا جیسے کوئی لڑکا اپنا سبق یاد کر رہا ہو۔

بھیرو بھیرو تاڑی بیچ - یا بیوی کی ساڑی بیچ

ایک ہی سانس میں اُس نے کئی بار یہی رٹ لگائی۔ بھیرو کہاں تو غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ کہاں سُورداس کی یہ طفلانہ حرکت دیکھ کر ہنس پڑا۔ اور لوگ بھی ہنسنے لگے۔ اب سُورداس کو معلوم ہوا کہ میں کتنا عاجز و بیکس ہوں۔ میرے غصہ کی یہ عزت ہے! میں طاقت ور ہوتا تو میرا غصہ دیکھ کر یہ لوگ تھر تھر کانپنے لگتے۔ نہیں تو کھڑے کھڑے ہنس رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کر ہی کیا سکتا ہے۔ بھگوان نے اتنا اپنگ نہ بنا دیا ہوتا تو کیوں یہ ذِلت اُٹھانی پڑتی؟ یہ سوچ کر بے اختیار اُسے رونا آ گیا۔ بہت ضبط کرنے پر بھی آنسو نہ رُک سکے۔

بجرنگی نے بھیرو اور جگدھر دونوں کو ملامت کی۔ "کیا اندھے سے ہیکڑی جتاتے ہو۔ شرم نہیں آتی! ایک تو بیچارے لڑکے کو تمانچوں سے مُنہ لال کر دیا اُس پر اور گرجتے ہو۔ وہ بھی تو لڑکا ہی ہے۔ غریب کا ہے تو کیا۔ جتنا لاڈ پیار اُس کا ہوتا ہے۔ اُتنا بھلے گھروں کے لڑکوں کا بھی نہیں ہوتا! جیسے اور سب لڑکے چڑھاتے ہیں وہ بھی چڑھاتا ہے۔ اس میں اتنا بگڑنے کی کیا بات ہے؟ (جمنی کی طرف دیکھ کر) یہ سب تیرے ہی کارن ہوا۔ اپنے لونڈے کو ڈانٹتی نہیں۔ بیچارے اندھے پر غصہ اُتارنے چلی ہے"۔

جمنی سورداس کا رونا دیکھ کر سہم گئی تھی۔ جانتی تھی بیکس کی آہ میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ نادم ہو کر بولی "میں کیا جانتی تھی کہ ذرا سی بات کا اتنا بتنگڑ بن جائے گا۔ آ بیٹا مٹھوا! چل بچھوا پکڑ لے تو دودھ [illegible]" دُلارے لڑکے تنکے کی مار بھی نہیں سہ سکتے۔ مٹھو دودھ کی دھونس سے بھی چُپ نہ ہوا۔ تو جمنی نے آ کر اُس کے آنسو پونچھے اور گودی میں

اُٹھا کر گھر کے اندر لے گئی۔ اُس کو غصّہ جلد آتا تھا مگر جلد ہی پگھل بھی جاتی تھی۔"

مٹھو تو اُدھر گیا۔ بھیرو اور جگدھر نے بھی اپنی اپنی راہ لی۔ مگر سورداس سڑک کی طرف نہ گیا۔ اپنی جھونپڑی میں جاکر اپنی بیکسی پر رونے لگا۔ اپنے نابینا ہونے پر آج اُس کو جتنا ملال ہو رہا تھا اُتنا اور کبھی نہ ہوا تھا۔ سوچا "میری یہ دُرگت اِسی لئے ہے نہ کہ میں اندھا ہوں بھیک مانگتا ہوں۔ محنت کی کمائی کھاتا ہوتا تو میں بھی گردن اُٹھا کر چلتا۔ میرا بھی مان نہ ہوتا؟ کیوں چیونٹی کی طرح پیروں کے نیچے مسلا جاتا؟ آج بھگوان نے اپنگ نہ بنا دیا ہوتا تو کیا دونوں آدمی لڑکے کو مار کر ہنستے ہوئے چلے جاتے؟ ایک ایک کی گردن مروڑ دیتا۔ بجرنگی سے کیوں نہیں کوئی بولتا۔ گھسوا نے بھیرو کی تاڑی کا مٹکا پھوڑ دیا تھا۔ کئی روپے کا نقصان ہوا لیکن بھیرو نے چُوں تک نہ کی۔ جگدھر کو اُس کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہے۔ ابھی دس ہی پانچ دن کی بات ہے اس کا کھونچہ اُلٹ دیا تھا۔ جگدھر نے سانس تک نہ لی۔ جانتے ہیں تاکہ ذرا بھی گرم ہوئے اور بجرنگی نے گردن پکڑی۔ نہ جانے اُس جنم میں ایسے کون سے پاپ کئے تھے۔ جن کا یہ ڈنڈ مل رہا ہے لیکن بھیک نہ مانگوں تو کھاؤں کیا؟ اور پھر زندگی پیٹ ہی پالنے کے لئے تھوڑا ہی ہے؟ کچھ آگے کے لئے بھی تو کرنا ہے۔ نہیں۔ اِس جنم میں تو اندھا ہوا ہی ہوں اُس جنم میں اِس سے بھی زیادہ دُردشا ہوگی۔ پتروں کا دن سر پر سوار ہے۔ گیا جی میں ان کا سرادھ نہ کیا تو وہ بھی کیا سمجھیں گے کہ ہمارے بنس میں کوئی ہے۔ میرے ساتھ تو بنس کا انت ہی ہے۔

میں یہ دِن نہ چکاؤں گا تو اور کون لڑکا بیٹھا ہوا ہے جو چکا دے گا۔ کون اُدّم کروں؟ کسی بڑے آدمی کے گھر پنکھا کھینچ سکتا ہوں۔ مگر یہ کام بھی تو سال میں چار ہی مہینہ رہتا ہے۔ باقی آٹھ مہینے کیا کروں گا؟ سُنتا ہوں۔ اندھے کُرسی۔ مونڑھے دری۔ ٹاٹ بُن سکتے ہیں۔ پر یہ کام کس سے سیکھوں؟ کچھ بھی ہو اب بھیک نہ مانگوں گا"۔

ہر طرف سے مایوس ہونے پر سورداس کے دل میں یکایک یہ خیال آیا کہ اس زمین کو کیوں نہ بیچ دوں۔ اس کے سوا اب مجھے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ کہاں تک باپ دادا کے نام کو روؤں۔ صاحب اُسے لینے کو مُنہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ دام بھی اچھا دے رہے ہیں اُنہیں کو دے دوں۔ چار پانچ ہزار بہت ہوتے ہیں۔ اپنے گھر میں سیٹھ کی طرح بیٹھا ہوا چین کی بنسی بجاؤں گا۔ چار آدمی گھیرے رہیں گے۔ محلّہ میں اپنا مان ہونے لگے گا۔ یہی لوگ جو آج مجھ پر رعب جما رہے ہیں میرا منہ تاکیں گے۔ میری خوشامد کریں گے۔ یہی ہوگا نا۔ محلّہ کی گائیں ماری ماری پھریں گی۔ پھر میں اُس کو میں کیا کروں؟ جب تک نبھ سکا۔ نبھایا۔ اب نہیں نبھ سکتا۔ جن کی گائیں چرتی ہیں کون میری بات پوچھتے ہیں؟ آج کوئی میری پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تو بھیرو مجھے رُلا کر یوں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چلا نہ جاتا۔ جب اتنا بھی نہیں ہے تو مجھے کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے لئے مروں؟ جی ہے تو جہان ہے۔ جب آبرو ہی نہ رہی تو جینے پر دھکّار ہے۔

سورداس یہ سوچ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا گودام کی طرف چلا۔ گودام کے سامنے پہنچا تو دیا گرسے بھینٹ ہو گئی۔

اُنہوں نے پوچھا اِدھر کہاں چلے۔ سورداس؟ تمہاری جگہ تو پیچھے رہ گئی ؟
سورداس۔ ذرا انہیں میاں صاحب سے کچھ بات چیت کرنی ہے ؂
دیاگر۔ کیا اسی زمین کے بارہ میں؟
سورداس۔ ہاں میرا ارادہ ہے کہ یہ زمین بیچ کر کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلا جاؤں۔ اس محلہ میں اب نباہ نہیں ہے ؂
دیاگر۔ سُنا ہے آج بھیرو تمہیں مارنے کی دھمکی دے رہا تھا ؂
سورداس۔ میں طرح نہ دے جاتا تو اُس نے مار ہی دیا ہوتا۔ سارا محلہ بیٹھا ہنستا رہا۔ کسی کی زبان نہ کُھلی کہ اندھے اپاہج آدمی پر یہ اَنیلے کیوں کرتے ہو۔ تو جب میرا کوئی ہتوا نہیں ہے تو میں ہی کیوں دوسروں کے لئے مروں؟
دیاگر۔ نہیں سورداس۔ میں تمہیں زمین بیچنے کی صلاح نہ دوں گا۔ دھرم کا پھل اس جنم میں نہیں ملتا۔ ہمیں آنکھیں بند کر کے نارائن پر بھروسہ رکھتے ہوئے دھرم کے راستہ پر چلتے رہنا چاہئے۔ سچ پوچھو تو آج نارائن نے تمہارے دھرم کی پریکھیا کی ہے۔ سنکٹ ہی میں دھیرج اور دھرم کی پریکھیا ہوتی ہے۔ دیکھو گوسائیں جی نے کہا ہے ؎

آپت کال پَرکھئے چاری ۔ دھیرج۔ دھرم متر اور ناری

زمین پڑی ہے۔ پڑی رہنے دو۔ گائیں چرتی ہیں۔ یہ کتنا بڑا پُن ہے۔ کون جانتا ہے کبھی کوئی دانی دھرماتما آدمی مل جائے تو دھرم شالہ۔ کنواں مندر بنوا دے کہ مرنے پر بھی تمہارا نام اَمر رہے۔ رہی تیرتھ جاترا۔ اُس کے لئے روپے کی ضرورت نہیں۔ سادھو سنت جنم بھر یہی کیا کرتے ہیں پر گھر سے روپوں کی تھیلی باندھ کر نہیں چلتے۔ میں بھی شیوراتری کے بعد

بڑی ناراضی جانے والا ہوں۔ ہمارا تمہارا ساتھ ہو جائے گا۔ راستہ میں تمہاری ایک کوڑی خرچ نہ ہو گی۔ اِس کا میرا ذمہ ہے۔

سورداس۔ نہیں بابا۔ اب یہ اُنیائے نہیں سہا جاتا۔ بھاگ میں دھرم کرنا نہیں لکھا ہوا ہے تو کیسے دھرم کروں گا؟ ذرا ان لوگوں کو بھی تو معلوم ہو جائے کہ سورداس بھی کوئی چیز ہے۔

دیاگر۔ سورداس! آنکھیں بند ہونے پر بھی کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ اہنکار (خودی) ہے۔ اِسے مٹاؤ۔ نہیں تو یہ جنم بھی بگڑ جائے گا۔ یہی اہنکار سب پاپوں کی جڑ ہے۔ نہ یہاں تم ہو۔ نہ تمہاری زمین ہے نہ تمہارا کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ جہاں دیکھو بھگوان ہی بھگوان ہیں۔ اِن جھگڑوں میں نہ پڑو!

سورداس۔ باباجی! جب تک بھگوان کی دیا نہ ہو گی۔ بھگتی اور بیراگ کسی پر من نہ جمے گا۔ اِس گھڑی میرا دل رو رہا ہے اس میں اُپدیش اور گیان کی باتیں نہیں سما سکتیں۔ گیلی لکڑی کھراد پر نہیں چڑھتی۔

دیاگر۔ پچھتاؤ گے۔ اور کیا؟

یہ کہہ کر دیاگر اپنی راہ چلے گئے۔ وہ ہر روز گنگا نہانے جایا کرتے تھے۔

اُن کے چلے جانے پر سورداس نے دل میں کہا " یہ بھی مجھی کو گیان سکھاتے ہیں۔ غریبوں پر اُپدیش کا بھی داؤں چلتا ہے۔ موٹے آدمیوں کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ وہاں تو جا کر ٹھکر سوہاتی کرنے لگتے ہیں۔ مجھے گیان سکھانے چلے ہیں۔ دونوں جون بھوجن مل جاتا ہے نا۔ ایک دن نہ ملے تو سارا گیان نکل جائے "۔

تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی رکاوٹوں کو پھاند جاتی ہے۔ سورداس سمجھانے سے اور بھی ضد پکڑ گیا۔ سیدھا گودام کے برآمدہ میں جا کر رکا۔ اس وقت وہاں بہت سے چمار جمع تھے۔ کھالوں کی خرید ہو رہی تھی۔ چودھری نے کہا "آؤ سورداس! کیسے چلے؟"

سورداس اتنے لوگوں کے سامنے اپنی خواہش ظاہر نہ کر سکا۔ لحاظ نے اس کی زبان بند کر دی بولا "کچھ نہیں۔ ایسے ہی چلا آیا ہوں"

طاہر۔ صاحب ان سے پیچھے والی زمین مانگتے ہیں۔ منہ مانگے دام دینے پر تیار ہیں۔ مگر یہ کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ انہوں نے خود سمجھایا میں نے کتنی منت کی پر ان کے دل میں کوئی بات جمتی ہی نہیں۔

حیا میں نہایت بیحیائی بھی ہوتی ہے۔ آخر وقت بھی جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی الٹی سانسیں چل رہی ہیں۔ وہ ایک دم زندہ ہو جاتی ہے۔ اور پہلے سے بھی زیادہ فرض شناس۔ ہم پریشانیوں میں مبتلا ہو کر کسی دوست سے مدد مانگنے کے لئے گھر سے نکلتے ہیں۔ لیکن دوست سے آنکھیں چار ہوتے ہی حیا ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم ادھر اُدھر باتیں کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک بھی ایسا لفظ منہ سے نہیں نکلنے دیتے جس سے ہماری اندرونی تکلیف کا اظہار ہو۔

طاہر علی کی باتیں سنتے ہی سورداس کی حیا قہقہہ مارتی ہوئی باہر نکل آئی۔ بولا "میاں صاحب! یہ زمین تو پرکھوں کی نشانی ہے۔ بھلا میں اسے بیچ یا پٹہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے اسے دھرم کاج کے لئے سنکلپ کر دیا ہے"

طاہر۔ دھرم کاج بغیر روپوں کے کیسے ہوگا؟ جب روپے ملیں گے جبھی

تو تیرتھ کرو گے۔ سادھو لوگوں کی سیوا کرو گے۔ مندر اور کنواں بنواؤ گے۔

چودھری۔ سورداس! اس بکھت (وقت) اچھے دام مل رہے ہیں۔ ہماری تو یہی صلاح ہے کہ دیدو۔ تمہارا اُس سے کوئی لاکھ تو ہوتا نہیں۔

سورداس۔ محلہ بھر کی گائیں چرتی ہیں۔ کیا اس سے پُن نہیں ہوتا؟ گئو کی سیوا سے بڑھ کر اور کون پُن کا کام ہے؟

طاہر۔ اپنا پیٹ پالنے کے لئے تو بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ چلے ہو دوسروں کے ساتھ پُن کرنے! جن کی گائیں چرتی ہیں وہ تو تمہاری بات بھی نہیں پوچھتے۔ احسان ماننا تو دور رہا۔ اسی دھرم کے پیچھے تمہاری یہ حالت ہو رہی ہے ورنہ ٹھوکریں نہ کھاتے پھرتے۔

طاہر علی خود بڑے دیندار آدمی تھے۔ لیکن دوسرے مذہبوں کی بُرائی کرنے میں اُن کو ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ دراصل وہ اسلامی مذہب کے سوا اور کسی مذہب کو مذہب نہیں سمجھتے تھے۔

سورداس نے ذرا تُند لہجہ میں کہا "میاں صاحب! دھرم احسان کے لئے نہیں کیا جاتا۔ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینا چاہئیے"۔

طاہر۔ پچھتاؤ گے اور کیا۔ صاحب سے جو کچھ کہو گے وہی کریں گے۔ تمہارے لئے گھر بنوا دیں گے۔ ماہوار وظیفہ دیں گے مٹھوا کو کسی مدرسہ میں پڑھنے کو بٹھا دیں گے۔ اُسے نوکر رکھا دیں گے۔ تمہاری آنکھوں کی دوا کرا دیں گے۔ ممکن ہے تمہاری آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی بن جاؤ گے۔ نہیں تو دھکّے کھاتے رہو گے۔

سورداس پر اور کسی ترغیب کا اثر نہ ہوا لیکن آنکھوں کے علاج کا ذکر سُن کر وہ نرم پڑا۔ بولا "کیا جنم کے اندھوں کی بھی دوا ہو سکتی ہے؟"

طاہر۔ تم جنم کے اندھے ہو گیا؟ جب تو مجبوری ہے۔ لیکن تمہاری آسایش کے اتنے سامان جمع کر دیئے جائیں گے۔ کہ تمہیں آنکھوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

سورداس۔ نہیں۔ میاں صاحب! اس میں بڑی ناموسی ہوگی۔ لوگ چاروں طرف سے دھتکارنے لگیں گے۔

چودھری۔ تمہاری جائداد ہے۔ بیع کرو چاہے پٹہ لکھو۔ دوسرے کو دخل دینے کا کیا اختیار رہے؟

سورداس۔ باپ دادوں کا نام تو نہیں ڈبویا جاتا۔

جہلاء کے پاس دلیلیں نہیں ہوتیں۔ دلائل کا جواب وہ ضد سے دیتے ہیں۔ دلیل قایل ہو سکتی ہے۔ نرم ہو سکتی ہے۔ پر ہٹ کو کون قایل کر سکتا ہے؟

سورداس کی ہٹ سے طاہر علی کو غصہ آگیا۔ بولے "تمہاری تقدیر میں بھیک مانگنا لکھا ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ ان بڑے آدمیوں سے ابھی پالا نہیں پڑا ہے۔ ابھی تمہاری خوشامد کر رہے ہیں۔ معاوضہ دینے پر تیار ہیں۔ لیکن تمہارا مزاج نہیں ملتا۔ اور وہی جب قانونی داؤں پیچ کھیل کر زمین پر قبضہ کر لیں گے۔ دو چار سو روپے برائے نام معاوضہ دے دیں گے۔ تو پھر سیدھے ہو جاؤ گے۔ محلہ والوں پر بھولے بیٹھے ہو پر دیکھ لینا جو کوئی پاس بھی پھٹکے۔ صاحب یہ زمین لیں گے ضرور چاہے ہنس کر دو چاہے رو کر"۔

سورداس نے متکبرانہ انداز سے جواب دیا "خاں صاحب! اگر زمین جائے گی تو اس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی!"

یہ کہہ کر اُس نے لکڑی سنبھالی۔ اور اپنے اڈے پر جا بیٹھا۔

اُدھر دیا گر نے جا کر نایک رام سے یہ حال کہا۔ بجرنگی بھی بیٹھا تھا۔ یہ خبر سُن کر دونوں کے ہوش اُڑ گئے۔ سورداس کے بل پر دو تو اُچھلتے رہے۔ اُس دن طاہر علی سے کیسی باتیں کیں اور آج سورداس ہی نے دھوکا دیا۔ بجرنگی نے متفکر ہو کر کہا "اب کیا کرنا ہوگا پنڈا جی! بتاؤ"۔

نایک رام۔ کرنا کیا ہوگا؟ جیسا کیا ہے ویسا بھوگنا ہوگا۔ جا کر اپنی گھر والی سے پوچھو۔ اُسی نے آج آگ لگائی تھی۔ جانتے تو ہو کہ سورداس مٹھوا پر جان دیتا ہے پھر کیوں بھیرو کی مرمت نہیں کی؟ میں ہوتا تو کبھی بھیرو کو دو چار کھری کھوٹی سنائے بغیر نہ جانے دیتا اور نہیں تو دکھاوے کے لئے سہی۔ اُس بیچارے کو بھی معلوم ہو جاتا کہ میری پیٹھ پر کوئی ہے۔ آج اُس کو بڑا رنج ہوا ہے۔ نہیں تو زمین بیچنے کا اُسے کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔

بجرنگی۔ ارے تو اب کوئی تدبیر سوچو گے۔ یا بیٹھ کر پچھلی باتوں کے نام کو روئیں؟

نایک رام۔ تدبیر یہی ہے کہ آج سورداس آئے تو چل کر اُس کے پیروں پر گرو۔ اُسے دلاسا دو۔ جیسے راضی ہو راضی کرو۔ دادا بھیا کرو۔ مان جائے تو اچھا نہیں تو صاحب سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اُن کا قبضہ نہ ہونے دو۔ جو کوئی زمین کے پاس جائے اُس کو مار کر بھگا دو۔ میں نے تو یہی سوچ رکھا ہے۔ آج سورداس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر دودھیا پلاؤں گا۔ اور مٹھوا کو پیٹ بھر مٹھائیاں کھلاؤنگا

جب نہ ملنے گا تو دیکھا جائے گا۔

بجرنگی۔ ذرا میاں صاحب کے پاس کیوں نہیں چلے چلتے۔ سورداس سے اُس نے نہ جانے کیا کیا باتیں کی ہوں۔ کہیں لکھا پڑھی کرانے کو کہہ آیا ہو تو پھر چاہے کتنی ہی آرزو منت کرو گے وہ اپنی بات نہ ٹالے گا۔

نایک رام۔ میں اُن منشی کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔ اُس کا مزاج اور بھی آسمان پر چڑھ جائے گا۔

بجرنگی۔ نہیں، پنڈا جی۔ میری خاطر سے ذرا چلے چلو۔

نایک رام آخر راضی ہو گئے۔ دونوں آدمی طاہر علی کے پاس پہنچے۔ وہاں اُس وقت سناٹا تھا۔ خریداری کا کام ختم ہو چکا تھا۔ چمار چلے گئے تھے۔ طاہر علی تنہا بیٹھے ہوئے حساب کتاب لکھ رہے تھے۔ میزان میں کچھ فرق پڑتا تھا۔ بار بار جوڑتے تھے پر غلطی پر نگاہ نہ پڑتی تھی۔ دفعتاً نایک رام نے کہا۔ "کہئے منشی جی آج سورداس سے کیا بات چیت ہوئی؟"

طاہر۔ آہا۔ آیئے پنڈا جی! معاف کیجئے گا۔ میں ذرا میزان جوڑنے میں مصروف تھا۔ اِس مونڈھے پر بیٹھئے۔ سورداس سے کوئی بات طے نہ ہوئی۔ اُس کی تو شامت آئی ہے۔ آج تو دھمکی دے کر گیا ہے۔ کہ زمین کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔ غریب آدمی ہے مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ آخر یہی ہوگا کہ صاحب کسی قانون کے رُو سے زمین پر قابض ہو جائیں گے کچھ معاوضہ ملا تو خیر۔ ورنہ اُس کی بھی امید نہیں!

نایک رام۔ جب سورداس راضی نہیں ہے تو صاحب کیا کھا کر یہ زمین

لے لیں گے؟ دیکھو بجز نگی ہوئی نہ وہی بات۔ سو داس ایسا کچا آدمی نہیں ہے۔

طاہر۔ صاحب کو ابھی آپ جانتے نہیں ہیں۔

نایک رام۔ میں صاحب اور صاحب کے باپ دونوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ حاکموں کی خوشامد کی بدولت آج بڑے آدمی بنے پھرتے ہیں۔

طاہر۔ خوشامد ہی کا تو آج کل زمانہ ہے۔ وہ اب اس اراضی کو لئے بغیر نہ مانیں گے۔

نایک رام۔ تو ادھر بھی یہی طے ہے کہ زمین پر کسی کا قبضہ نہ ہونے دیں گے۔ چاہے جان رہے یا جائے۔ اس کے لئے مر مٹیں گے۔ ہمارے ہزاروں جاتری آتے ہیں۔ اسی کھیت میں سب کو ٹھہرا دیتا ہوں۔ زمین نکل گئی تو کیا جاتریوں کو اپنے سر پر ٹھہراؤں گا؟ آپ صاحب سے کہہ دیجئے گا۔ یہاں ان کی دال نہ گلے گی۔ یہاں بھی کچھ دم رکھتے ہیں۔ بارھوں مہینے کھلے خزانے جوا کھیلتے ہیں۔ ایک ایک دن میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ تھانہ دار سے لیکر سپرنٹنڈنٹ تک سب جانتے ہیں۔ پر مجال کیا کہ کوئی دوڑ لے کر آئے۔ عورتیں تک چھپا ڈالے ہیں۔

طاہر۔ تو آپ یہ سب باتیں مجھ سے کیوں کہتے ہیں؟ کیا میں جانتا نہیں ہوں؟ آپ نے سید رضا علی تھانہ دار کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ میں انہیں کا لڑکا ہوں۔ یہاں کون پنڈا ہے جس کو میں نہیں جانتا؟

نایک رام۔ لیجئے گھر ہی بید تو مریئے کیوں؟ پھر تو آپ اپنے گھر ہی

کے آدمی ہیں۔ داروغہ جی کی طرح بھلا کیا کوئی افسر ہوگا۔ کہتے تھے۔
"بیٹا! جو چاہے کرو لیکن میرے پنجے میں نہ آنا" میرے دروازہ پر
پھر جھپتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ بالکل گھر والا معاملہ ہو
گیا تھا۔ کوئی بات بنی بگڑی۔ جا کر سب کی سب سنا دیتا تھا۔ پیٹھ پر ہاتھ
پھیر کر کہتے "بس جاؤ۔ اب ہم دیکھ لیں گے" ایسے آدمی اب کہاں؟ ست
جگی لوگ تھے۔ آپ تو اپنے بھائی ہی ٹھہرے۔ صاحب کو دھتا کیوں نہیں
بتاتے؟ آپ کو نارائن نے علم اور عقل دی ہے۔ بیسیوں بہانے نکال سکتے
ہیں۔ برسات میں پانی رکتا ہے۔ دیمک بہت ہے۔ لونی لگے گی۔ ایسے
ہی اور کتنے بہانے ہیں۔

طاہر۔ پنڈا جی! جب آپ سے بھائی چارا ہو گیا تو کیا پردا ہے؟
صاحب پہلے درجہ کا گھاگ ہے۔ حاکموں سے اُس کا بڑا میل جول ہے
مفت میں زمین لے لے گا۔ ستور داس کو تو چاہے سو دو سو بل بھی رہیں
میرا انعام اکرام غائب ہو جائے گا۔ آپ ستور داس سے معاملہ طے کر
دیجئے۔ تو اُس کا بھی فائدہ ہو۔ میرا بھی اور آپ کا بھی۔

نایک رام۔ آپ کو جو یہاں سے انعام اکرام ملنے والا ہو وہ ہمیں لوگوں
سے لے لیجئے۔ اسی بہانے کچھ آپ کی خدمت کریں گے۔ میں تو داروغہ
جی کو جیسا سمجھتا ہوں۔ ویسا ہی آپ کو بھی سمجھتا ہوں۔

طاہر۔ معاذ اللہ! پنڈا جی! ایسی بات نہ کہئے۔ میں مالک کی نگاہ بچا کر
ایک کوڑی لینا بھی حرام سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی خوشی سے جو کچھ دے دیں گے
میں ہاتھ پھیلا کر لے لوں گا۔ پر اُن سے چھپا کر نہیں۔ خدا اُس راستہ
سے بچائے! والد نے اتنا کمایا۔ پر مرتے وقت گھر میں ایک کوڑی کفن کو

بھی نہ تھی۔

نایک رام۔ ارے یار! میں تمہیں رشوت تھوڑا ہی دینے کہتا ہوں۔ جب ہمارا آپ کا بھائی چارا ہو گیا تو ہمارا کام آپ سے نکلے گا۔ آپ کا کام ہم سے۔ یہ کوئی رشوت نہیں ہے۔

طاہر۔ نہیں پنڈا جی! خدا میری نیت کو پاک رکھے مجھ سے نمک حرامی نہ ہوگی۔ میں جس حال میں ہوں۔ اُسی میں خوش ہوں۔ جب اُس کے کرم کی نگاہ ہوگی تو میری بھلائی کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

نایک رام۔ سنتے ہو بجرنگی! داروغہ جی کی باتیں؟ چلو چپکے سے گھر بیٹھو۔ جو کچھ آگے آئے گا۔ دیکھا جائے گا۔ اب تو صاحب ہی سے نبٹنا ہے۔

بجرنگی کے خیال میں نایک رام نے اُتنی منت سماجت نہ کی تھی جتنی کرنی چاہئے تھی۔ آئے تھے اپنا کام نکالنے کہ ہیکڑی دکھانے۔ عاجزی سے جو کام نکل جاتا ہے وہ ڈینگ مارنے سے نہیں نکلتا۔ نایک رام نے تو لاٹھی کندھے پر رکھی اور چلے۔ بجرنگی نے کہا کہ میں ذرا جانوروں کو دیکھنے جاتا ہوں اور اُدھر ہی سے ہوتا ہوا آؤں گا۔ وہ یوں بڑا اکھڑ آدمی تھا۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا۔ سارا محلہ اُس کے غصہ سے کانپتا تھا لیکن وہ قانونی کارروائیوں سے ڈرتا تھا۔ پولیس اور عدالت کے نام ہی سے اُس کی جان سوکھ جاتی تھی۔ نایک رام کو روز ہی عدالت سے کام رہتا تھا۔ وہ اِن باتوں میں مشاق تھے۔ بجرنگی کو اپنی زندگی میں کبھی گواہی دینے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ نایک رام کے چلے آنے پر طاہر علی بھی گھر چلے گئے۔ پر بجرنگی وہیں آس پاس ٹہلتا رہا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنا دکھڑا سناؤں۔

طاہر علی کے باپ محکمۂ پولیس میں کانسٹبل سے تھانہ داری کے درجہ تک پہنچے تھے۔ مرتے وقت کوئی جائداد تو نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ اُن کی تجہیز و تکفین بھی قرض لے کر کی گئی۔ لیکن طاہر علی کے سر پر دو بیواؤں اور اُن کی اولاد کا بار چھوڑ گئے۔ انہوں نے تین شادیاں کی تھیں پہلی بیوی سے طاہر علی تھے۔ دوسری سے ماہر علی اور ظاہر علی اور تیسری سے جابر علی۔ طاہر علی مستقل مزاج اور عقل مند تھے۔ باپ کی وفات ہونے پر سال بھر تو وہ نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ پھر کہیں مویشی خانہ کی محرری مل گئی۔ کہیں کسی دوا فروش کے ایجنٹ ہو گئے۔ کہیں چُنگی گھر کے منشی کا عہدہ مل گیا۔ اِدھر کچھ عرصہ سے مسٹر جان سیوک کے یہاں مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ اُن کے عادات و اطوار اپنے والد مرحوم سے بالکل نرالے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور دل کے صاف تھے۔ حرام کی آمدنی سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اُن کی ماں تو وفات پا چکی تھیں مگر دونوں سوتیلی مائیں بقیدِ حیات تھیں۔ طاہر علی کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ بیوی کے علاوہ ایک لڑکا تھا۔ صابر علی۔ اور ایک لڑکی نسیمہ۔ اتنا بڑا خاندان تھا۔ اور صرف تیس روپیہ ماہوار آمدنی۔ اس گرانی کے زمانہ میں جب کہ اس سے پانچ گنا آمدنی میں بھی فراغت سے گزر بسر نہ ہوتی تھی۔ اُن کو سخت تکلیف کرنی پڑتی۔ لیکن نیت فاسد نہ ہوتی تھی۔ خدا کا خوف اُن کی خصلت کا خاص جزو تھا۔ گھر میں پہنچے تو ماہر علی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ظاہر اور جابر مٹھائی کے لئے رو رہے تھے۔ اور صابر آنگن میں اُچھل اُچھل کر باجرہ کی روٹیاں کھا رہا تھا۔ طاہر علی تخت پر بیٹھ گئے اور دونوں چھوٹے بھائیوں کو گود میں اُٹھا کر چُپ کرانے لگے۔ اُن

کی بڑی سوتیلی ماں نے جس کا نام زینب تھا۔ دروازہ پر کھڑی ہوکر نایک رام اور بجرنگی کی باتیں سُنی تھیں۔ بجرنگی دس ہی پانچ قدم چلا تھا کہ ماہر علی نے پکارا "یہ سنو جی! او آدمی! ذرا یہاں آنا تمہیں اماں بُلا رہی ہیں"۔

بجرنگی لوٹ پڑا۔ کچھ آس بندھی۔ آکر پھر برآمدہ میں کھڑا ہو گیا۔ زینب ٹاٹ کے پردہ کی آڑ میں کھڑی تھیں۔ پوچھا "کیا بات تھی جی؟"

بجرنگی۔ وہی زمین کی بات چیت تھی۔ صاحب اسے لینے کو کہتے ہیں ہمارا گزر بسر اسی زمین سے ہوتا ہے۔ منشی جی سے کہہ رہا ہوں کسی طرح اس جھگڑے کو مٹا دیجئے۔ بجر نیاج (نذر نیاز) دینے کو بھی تیار ہوں پر منشی جی سنتے ہی نہیں۔

زینب۔ سُنیں گے کیوں نہیں؟ سُنیں گے نا تو غریبوں کی ہائے کس پر پڑے گی؟ تم بھی تو گنوار آدمی ہو۔ اُن سے کیا کہنے گئے؟ ایسی باتیں مردوں سے کہنے کی تھوڑے ہی ہوتی ہیں۔ ہم سے کہتے۔ ہم طے کرا دیتے۔

جابر کی ماں کا نام تھا رقیہ۔ وہ بھی آکر کھڑی ہو گئی۔ دونوں عورتیں سایہ کی طرح ساتھ رہتی تھیں۔ دونوں کے دل دماغ اور خیالات یکساں تھے۔ اُن میں سوکن کا جلاپا نام کو نہ تھا۔ آپس میں بہنوں کی سی محبت تھی۔ بولی "اور کیا بھلا ایسی باتیں مردوں سے کی جاتی ہیں؟"

بجرنگی۔ ماتا جی۔ میں گنوار آدمی اس کا حال کیا جانوں۔ اب آپ ہی طے کرا دیجئے۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچے جئیں گے۔

زینب۔ سچ سچ کہنا۔ یہ معاملہ دب جائے تو کہاں تک دو گے؟

بجرنگی۔ بیگم صاحب۔ پچاس روپے تک دینے کو تیار ہوں۔

زینب۔ تم بھی تو غضب کرتے ہو۔ پچاس ہی میں اتنا بڑا کام نکالنا چاہتے ہو۔

رقیہ۔ (آہستہ سے) بہن! کہیں بدک نہ جائے۔

بجرنگی۔ کیا کروں بیگم صاحب۔ غریب آدمی ہوں۔ لڑکوں کو جو کچھ حکم ہوگا دودھ دہی کھلاتا رہوں گا۔ لیکن نگد (نقد) تو اس سے زیادہ میرا کیا نہ ہوگا۔

رقیہ۔ اچھا تو روپیوں کا انتظام کرو۔ خدا نے چاہا تو سب مل ہو جائیگا۔

زینب۔ (آہستہ سے) رقیہ! تمہاری جلد بازی سے تو میں عاجز آ گئی۔

بجرنگی۔ ہاں جی! یہ کام ہو گیا تو سارا محلہ آپ کا جس گائے گا۔

زینب۔ مگر تم تو پچاس سے آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اتنے تو صاحب ہی دے دیں گے۔ پھر گناہ بے لذت کیوں کیا جائے؟

بجرنگی۔ ہاں جی! آپ سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔ دس پانچ روپے اور چٹا دوں گا۔

زینب۔ تو کب تک روپے آجائیں گے؟

بجرنگی۔ بس دو دن کی مہلت مل جائے۔ تب تک منشی جی سے کہہ دیجئے صاحب سے کہیں سنیں۔

زینب۔ واہ مہتو! تم تو بڑے ہوشیار نکلے۔ مفت ہی میں کام نکالنا چاہتے ہو۔ پہلے روپے لاؤ پھر تمہارا کام نہ ہو تو ہمارا ذمہ۔

بجرنگی دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے خوش خوش چلا گیا۔ تو زینب نے رقیہ سے کہا "تم بےصبر ہو جاتی ہو۔ ابھی چماروں سے دو پیسے فی کھال لینے پر تیار ہو گئیں۔ میں دو آنے لیتی اور وہ خوشی سے دیتے۔

یہی اہیر پُورے سوگن کر جاتا۔ بے صبری سے غرض مند چوکنا ہو جاتا ہے سمجھتا ہے۔ شاید ہم کو بیوقوف بنا رہی ہیں جتنی ہی دیر لگاؤ جتنی ہی بیرخی سے کام لو اُتنا ہی اعتبار بڑھتا ہے۔

رقیہ۔ کیا کروں بہن! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں بہت سختی سے نشانہ خطا نہ کر جائے۔

زینب۔ وہ اہیر روپے ضرور لائے گا۔ طاہر کو آج ہی سے بھرنا شروع کر دو۔ بس عذاب کا خوف دلانا چاہئے۔ انہیں ہتھے چڑھانے کا یہی ڈھنگ ہے۔

رقیہ۔ اور کہیں صاحب نہ مانیں تو؟

زینب۔ تو کون ہمارے اوپر کوئی نالش کرنے جاتا ہے؟

طاہر علی کھانا کھا کر لیٹے تھے۔ کہ زینب نے جا کر کہا۔ "صاحب دوسروں کی زمین کیوں لئے لیتے ہیں؟ بیچارے روتے پھرتے ہیں"۔

طاہر۔ مفت تھوڑا ہی لینا چاہتے ہیں۔ اُس کا معقول معاوضہ دینے پر تیار ہیں۔

زینب۔ یہ تو غریبوں پر ظلم ہے۔

رقیہ۔ ظلم ہی نہیں ہے عذاب ہے۔ بھیا! تم صاحب سے صاف صاف کہہ دو۔ "مجھے اس عذاب میں نہ ڈالئے۔ خدا نے میرے آگے بھی بال بچے دیئے ہیں۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ میں یہ عذاب سر پر نہ لوں گا"۔

زینب۔ گنوار تو ہیں ہی۔ تمہارے ہی سر ہو جائیں۔ تمہیں صاف کہہ دینا چاہئے کہ میں محلہ والوں سے دشمنی نہ مول لوں گا۔ جان جوکھم کی بات

ہے ؏

رقیہ۔ جان جوکھم تو ہے ہی۔ یہ گنوار کسی کے نہیں ہوتے ؏

طاہر۔ کیا آپ نے بھی کچھ افواہ سنی ہے؟

رقیہ۔ ہاں۔ یہ سب چمار آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے کہ صاحب نے
زمین لی تو خون کی ندی بہہ جائے گی۔ میں نے تو جب سے سنا ہے ہوش
اڑے ہوئے ہیں ؏

زینب۔ ہوش اُڑنے کی بات ہی ہے ؏

طاہر۔ مجھے وہ سب ناحق بدنام کر رہے ہیں۔ میں پٹے میں نہ دینے میں
صاحب نے اس اندھے سے زمین کے بارہ میں بات چیت کرنے کا حکم دیا
تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی جو میرا فرض تھا۔ لیکن یہ احمق یہی سمجھ رہے
ہیں کہ میں نے ہی صاحب کو اس زمین کی خریداری پر آمادہ کیا ہے۔
حالانکہ خدا جانتا ہے۔ میں نے کبھی اُن سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ؏

زینب۔ مجھے بدنامی کا خوف تو نہیں ہے۔ ہاں خدا کے قہر سے ڈرتی
ہوں۔ بیکسوں کی آہ کیوں سر پر لو؟

طاہر۔ میرے اوپر کیوں عذاب پڑنے لگا؟

زینب۔ اور کس کے اوپر پڑے گا۔ بیٹا! یہاں تو تمہیں ہو۔ صاحب
تو نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ تو گھس میں آگ لگا کر دور سے تماشہ دیکھیں گے
آئی گئی تو تمہارے سر جائے گی۔ اس پر قبضہ تمہیں کرنا پڑے گا۔ مقدمے
چلیں گے تو پیروی تمہیں کرنی پڑے گی۔ نا بھیا! میں اس آگ میں
نہیں کودنا چاہتی ؏

رقیہ۔ میرے میکے میں ایک کارندہ نے کسی کاشتکار کی زمین نکال لی تھی

دوسرے ہی دن جوان بیٹا اُٹھ گیا۔ کیا اُس نے زمینداری کے حکم سے مگر بلا آئی اُس غریب کے سر۔ دولت مندوں پر عذاب بھی نہیں پڑتا۔ اُس کا وار بھی غریبوں ہی پر ہوتا ہے۔ ہمارے بچے روز ہی نظر اور آسیب کی جھپٹ میں آتے رہتے ہیں پر آج تک کبھی نہیں سُنا کہ کسی انگریز کے بچہ کو نظر لگی ہو۔ اُن پر بلاؤں کا اثر ہی نہیں ہوتا ؎

یہ پتہ کی بات تھی۔ طاہر علی کو بھی اس کا تجربہ تھا۔ اُن کے گھر کے سبھی بچے گنڈے اور تعویذوں سے مڑھے ہوئے تھے۔ اُس پر بھی آئے دن جھاڑ پھونک اور رائی نمک کی ضرورت پڑا ہی کرتی تھی ؎

مذہب بالخصوص خوف پر مبنی ہے۔ خوف کو دور کر دیجئے۔ پھر آپ کی تیرتھ جاترا۔ پوجا پاٹ۔ اشنان دھیان۔ روزہ نماز کسی کا نشان بھی نہ رہے گا۔ مسجدیں خالی نظر آئیں گی اور مندر ویران!

طاہر علی کو خوف نے مغلوب کر دیا۔ آقا کی خدمت گذاری یا فرض شناسی کا خیال تھر ایزادی کا مقابلہ نہ کر سکا ؎

(۵)

چتاری کے راجہ مہندر کمار سنگھ اپنے عین عالم شباب ہی میں اپنی کارگزاری اور خاندانی شرافت کے سبب میونسپلٹی کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ خوب سوچ سمجھ کر کام کرنا اُن کے چال چلن کا خاصہ تھا۔ رئیسوں کی عیش پسندی اور نمود طلبی کا اُن کے مزاج میں شائبہ بھی نہ تھا۔ بہت ہی سادہ لباس پہنتے تھے۔ اور ٹھاٹھ باٹ سے نفرت کرتے تھے۔ شوق تو اُن کو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ گھڑ دوڑ۔ بائیسکوپ۔ تھیٹر۔ رقص و سرود۔ سیر و شکار۔ شطرنج یا تاش سے اُن کو ذرا بھی مس نہ تھا۔ ہاں اگر کچھ رغبت

تھی تو باغبانی سے۔ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ اپنے باغیچہ میں کام کیا کرتے تھے۔ باقی وقت شہر کے معائنہ اور میونسپلٹی کے کاموں کی انجام دہی میں صرف کرتے تھے۔ حکام سے وہ بلاضرورت بہت کم ملتے تھے۔ اُن کے دور انتظام میں شہر کے محض اُنہیں حصوں کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی جہاں حکّام کے بنگلے تھے۔ شہر کی تاریک گلیوں اور تعفن خیز بد رروں کی صفائی وسیع سڑکوں اور دلکش فضاؤں کی صفائی سے کم ضروری نہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر حکّام اُن سے کشیدہ رہتے تھے۔ انہیں ذہبی اور مغرور خیال کرتے تھے لیکن شہر کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی اُن سے غرور یا بیرخی کی شکایت نہ تھی۔ ہر وقت ہر شخص سے وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ ضابطہ کی خلاف ورزی کے لئے انہیں عوام پر جرمانہ کرنے یا مقدمہ چلانے کی بہت کم ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اُن کا اثر داخلاق سخت طریقۂ عمل کو دبائے رکھتا تھا۔ وہ انتہا درجہ کے کم سخن تھے۔ کبرسنی کی خاموشی خیالات کی پختگی کی دلیل ہے۔ اور عالمِ شباب کی خاموشی اُن کی عسرت کی۔ لیکن راجہ صاحب کی کم گوئی اس بات کو غلط ثابت کرتی تھی۔ اُن کے منہ سے جو بات نکلتی تھی اُس میں غور وخوض کی کافی جھلک ہوتی تھی۔ ایک باثروت تعلقہ دار ہونے پر بھی اُن کی طبیعت کا میلان جمہوریت کی جانب تھا۔ ممکن ہے یہ اُن کے سیاسی اصولوں کا نتیجہ ہو کیونکہ اُن کی تعلیم۔ اُن کا اقتدار اُن کے گرد و پیش کے حالات اُن کا مفاد۔ سب اِس میلان کے ناموافق تھے۔ مگر ضبط اور مشق نے اب اس کو اُن کے خیالی دائرہ سے نکال کر اُن کی فطرت میں داخل کر دیا تھا۔ شہر کے انتخابی حلقوں کی درستی میں انہوں نے نمایاں حصّہ

لیا تھا۔ اس لئے شہر کے اکثر روساء اُن سے بدظن رہا کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں۔ راجہ صاحب کی جمہوریت پرستی صرف اُن کے عہدہ کو قائم و برقرار رکھنے کا ذریعہ تھی۔ وہ عرصہ تک اپنی اس عزّت کی جگہ پر متمکن رہنے کے لئے یہ خودنمائی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ اخباروں میں بھی کبھی کبھی اس پر نوٹ شائع ہوتے رہتے تھے۔ لیکن راجہ صاحب اس کی تردید کے لئے عقل اور وقت کا بیجا تصرّف نہ کرتے تھے۔ نیک نام بننا اُن کی زندگی کا خاص مقصد تھا۔ وہ خوب جانتے تھے۔ کہ اس اونچے درجہ پر پہنچنے کے لئے عوام کی بیغرضانہ خدمت کی سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ راجہ صاحب اشنان دھیان سے فارغ ہو کر شہر کے معائنہ کے لئے جا رہے تھے۔ کہ اتنے میں مسٹر جان سیوک کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ جان سیوک کا حکّام سے زیادہ ربط ضبط تھا۔ اُن کے سگریٹ کمپنی کے شعبہ دار بھی زیادہ تر حکّام ہی تھے۔ راجہ صاحب نے کمپنی کا پراسپکٹس دیکھا تھا مگر جان سیوک سے اُن کی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے وہ بدگمانی تھی جس کی بنیاد افواہوں پر ہوتی ہے۔ راجہ صاحب اُنہیں خوشامدی اور زمانہ ساز سمجھتے تھے۔ جان سیوک کو وہ ایک مجسّم راز معلوم ہوتے تھے۔ لیکن راجہ صاحب کل آنندو سے ملنے گئے تھے۔ وہاں صوفیہ سے اُن کی ملاقات ہوگئی تھی۔ اُسی وقت جان سیوک کا بھی کچھ ذکر آ گیا تھا اُس وقت سے مسٹر سیوک کے متعلق اُن کے خیالات میں بہت کچھ تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ کارڈ پاتے ہی باہر نکل آئے اور جان سیوک سے ہاتھ ملا کر اُن کو اپنے دیوان خانہ میں لے گئے۔ جان سیوک کو یہ کسی فقیر

کی کٹی کی طرح معلوم ہوا جہاں سجاوٹ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ چند کرسیوں
اور ایک میز کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ ہاں کاغذات و اخبارات کا ایک
ڈھیر میز پر بے ترتیبی کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔

ہم کسی سے ملتے ہی اپنی قیاسی عقل سے معلوم کر لیتے ہیں کہ ہماری
نسبت اُس کا کیا خیال ہے۔ مسٹر سیوک کو ایک لمحہ تک زبان کھولنے
کی جرات نہ ہوئی۔ تمہید کا کوئی مناسب پہلو نہ سوجھتا تھا۔ اس بحرِ بے پایاں
کو پار کرنے کے لئے ایک زمین ہے اور دوسرا آسمان سے مدد مانگ رہا
تھا۔ راجہ صاحب کو تمہید تو سوجھ گئی تھی (صوفی کے اعلےٰ ایثار اور خدمت
کے بیان سے بڑھ کر اور کون سی تمہید ہوتی ؟) مگر بعض اشخاص کو اپنی
تعریف سُننے سے جس قدر گریز ہوتا ہے اُتنا ہی کسی دوسرے کی تعریف
کرنے سے ہوتا ہے۔ جان سیوک میں یہ بات نہ تھی۔ وہ تعریف یا غیبت
دونوں ہی کر سکتے تھے۔ یکساں کمال کے ساتھ۔ بولے:" آپ سے ملنے کا
عرصہ سے اشتیاق تھا۔ لیکن تعارف نہ ہونے کے سبب حاضر نہ ہو سکتا تھا
اور صاف بات تو یہ ہے (مسکرا کر) آپ کے بارہ میں حکام کے مُنہ سے
ایسی ایسی باتیں سُنتا تھا۔ جو میری خواہش کو عمل میں منتقل نہ ہونے دیتی تھیں
مگر آپ نے انتخابی طریقوں کو آسان بنا کر جس حب الوطنی کا ثبوت دیا
ہے اُن سے حاکموں کے جھوٹے اعتراضات کی قلعی کھول دی ہے "

حکام کے بیجا اعتراضات کا تذکرہ کر کے جان سیوک نے اپنی زبان
کی صفائی ثابت کر دی۔ راجہ صاحب کی ہمدردی حاصل کرنے کے
لئے اس زیادہ آسان کوئی تدبیر نہ تھی۔ راجہ صاحب کو حکام سے یہی
شکایت تھی۔ اسی سبب سے اُن کے انتظامات میں مشکلیں آپڑتی تھیں

تاخیر ہو جاتی تھی۔ اور رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ بولے "یہ میری بدقسمتی ہے کہ حکام مجھ سے اس قدر بدظن رہتے ہیں۔ میری اگر کوئی خطا ہے تو اتنی ہی کہ میں عوام کے لئے بھی صحت اور سہولت کی اتنی ہی ضرورت سمجھتا ہوں جتنی حکام اور رؤسا کے لئے"۔

مسٹر سیوک۔ جناب! ان لوگوں کے دماغ کی کچھ نہ پوچھئے۔ دنیا اُن کی آسایش کے لئے ہے اور کسی کو اُس میں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ہے جو شخص اُن کے آستانے پر جبیں سائی نہ کرے وہ نااہل نامہذب اور باغی ہے اور جو شخص قومیت کا ذرا بھی احساس رکھتا ہو۔ بالخصوص جو یہاں کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا چاہتا ہو وہ بلا شبہ قابل تعزیر اور گردن زدنی ہے۔ حُب الوطنی ان کی نگاہ میں بدترین گناہ ہے۔ آپ نے میرے سگریٹ کے کارخانہ کا دستور العمل ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

مہندر۔ جی ہاں دیکھا تھا۔

جان سیوک۔ پراسپکٹس کا نکلنا تھا کہ حکام کی نگاہیں مجھ سے یکدم پھر گئیں۔ مجھ پر اُن کی نوازش تھی۔ اکثر حکام سے میری دوستی تھی۔ مگر اُسی روز سے میں اُن کی برادری سے خارج کر دیا گیا۔ میرا حقہ پانی بند ہو گیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہندوستانی رؤساء اور حکام نے بھی آنا کانی شروع کر دی۔ اب میں اُن لوگوں کی نگاہوں میں شیطان سے بھی زیادہ مکروہ ہوں۔

اتنی طولانی تمہید کے بعد جان سیوک اپنے مطلب پر آئے۔ بہت کچھ ہچکتے ہوئے اپنا مدعا ظاہر کیا۔ راجہ صاحب قیافہ شناس تھے۔ پیران پارسا کو خوب پہچانتے تھے۔ اُنہیں مغالطہ دینا آسان نہ تھا۔ لیکن موقع

ایسا آپڑا تھا کہ اُن کو اپنے اصولوں کی حفاظت کے لئے تجاہل سے کام لینا پڑا۔ کسی دوسرے موقع پر وہ اس تجویز کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیتے۔ ایک غریب بیکس اندھے کی زمین کو جو اس کی زندگی کا ایک ہی سہارا ہو۔ اس کے قبضہ سے نکال کر ایک سرمایہ دار کو دے دینا اُن کے اصول کے منافی تھا۔ لیکن آج اوّل مرتبہ اُنہیں اپنے اصول کو طاق پہ رکھ دینا پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مس صوفیہ نے ان کے ایک قریبی رشتہ دار کی جان بچائی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ جان سیوک کے ساتھ عمدہ سلوک کرنا کنور بھرت سنگھ کو احسان کے بھاری بوجھ سے سبکدوش کر دینا ہوگا وہ اس تجویز کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ احسان مندی ہم سے وہ سب کچھ کرا لیتی ہے جو اصولی نقطۂ خیال سے مذموم و قابل تحقیر ہے۔ یہ وہ چکی ہے جو ہمارے اصولوں اور قاعدوں کو پیس ڈالتی ہے۔ آدمی جتنا ہی بے لوث ہوتا ہے۔ اُس کے لئے احسان کا بار اُتنا ہی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ راجہ صاحب نے اس معاملہ کو جان سیوک کے حسب منشأ طے کر دینے کا وعدہ کیا اور مسٹر سیوک اپنی کامیابی پر پھُولے ہوئے گھر آئے ۔

بیوی نے پوچھا "کیا طے کر آئے"؟

جان سیوک۔ وہی جو طے کرنے گیا تھا ۔

بیوی۔ شکر ہے مجھے امید نہ تھی ۔

جان سیوک۔ یہ سب صوفی کے احسان کی برکت ہے۔ یہ اُسی کے اِیثار کی طاقت ہے جس نے مہیندر کمار جیسے مغرور اور بے مروّت آدمی کو نیچا دکھا دیا۔ ایسے تپاک سے ملے گویا میں اُن کا ایک پُرانا دوست تھا

یہ مسئلہ واقعی ناقابلِ حل تھا اور اُس کے حل کے لئے میں صوفی کا مرہون منت ہوں ۔

مسٹر سیوک ۔ (تُرش رو ہو کر) تو تم جا کر اُسے لوا لاؤ ۔ میں نے منع تو نہیں کیا ہے ۔ مجھے ایسی باتیں بار بار کیوں سُناتے ہو؟ میں تو اگر پیاسی مرتی بھی ہوں گی ۔ تو اُس سے پانی نہ مانگوں گی ۔ مجھے للّو پتّو نہیں آتی ۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر بھی ۔ اگر وہ خدا سے منحرف ہو کر اپنی ضد پر قایم رہ سکتی ہے تو میں بھی اپنے ایمان پر قایم رہتے ہوئے کیوں اُس کی خوشامد کروں ؟

پربھو سیوک روزانہ ایک بار صوفیہ سے ملنے جایا کرتا تھا ۔ کنور صاحب اور وِنے دونوں کے منکسر مزاجی اور شرافت نے اُس کو گرویدہ بنا لیا تھا ۔ کنور صاحب جوہر شناس تھے ۔ اُنھوں نے اوّل ہی روز ایک ہی نگاہ میں تاڑ لیا کہ یہ نوجوان معمولی دل و دماغ والا نہیں ہے ۔ اُن پر یہ بات بھی مخفی نہ رہی کہ اُس کا فطرتی میلان ادب اور فلسفہ کی طرف ہے ۔ تجارتی کاروبار سے اُسے اُتنی مناسبت ہے جتنی وِنے کو زمینداری سے ۔ اس لئے وہ پربھو سیوک سے بالعموم ادب اور فلسفہ پر گفتگو کیا کرتے تھے ۔ وہ اُس کے فطرتی رجحان کو قومیت کے جذبات سے معمور کر دینا چاہتے تھے ۔ پربھو سیوک کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شخص فنِ شاعری کا ماہر ہے ۔ اُن سے اُسے وہ اُنس ہو گیا تھا ۔ جو شعرا کو اصحابِ ذوق سے ہوا کرتا ہے ۔ اُس نے اُنہیں اپنی کئی نظمیں سُنائی تھیں ۔ اُنکی فیاضانہ داد دہی سے اُس پر ایک نشہ سا چڑھا رہتا تھا ۔ وہ ہر وقت شاعری کے خیالات میں محو رہتا ۔ وہ شک اور مایوسی جو عموماً نومشق ادیبوں کو

اپنے کلام کی اشاعت اور قبولیت کے بابت ہوا کرتی ہے۔ کنور صاحب کی ہمت افزائیوں کے باعث یقین اور حوصلہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہی پربھو سیوک جو ہفتوں تک قلم نہ اٹھاتا تھا۔ اب ایک ایک دن میں کئی کئی نظمیں لکھ ڈالتا۔ اس کے خیالات میں دریا کی سی روانی اور فراوانی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ جان سیوک کو آتے دیکھ کر وہاں گیا کہ دیکھوں کیا خبر لائے ہیں؟ زمین کے ملنے میں جو رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں اُن سے اُسے امید ہو گئی تھی۔ کہ غالباً کچھ دنوں تک اس بندش میں نہ پڑوں جان سیوک کی کامیابی نے اُس امید کو منقطع کر دیا۔ دل کی اس حالت میں ماں کے آخری الفاظ اُسے نہایت ناگوار معلوم ہوئے۔ بولا۔ ماما۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ صوفی وہاں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے اور اُکتا کر خود بخود چلی آئے گی تو آپ غلطی پر ہیں۔ صوفی وہاں اگر برسوں رہے تو بھی وہ لوگ اُس کا گلا نہ چھوڑیں گے۔ میں نے ایسے سیر چشم اور خلیق آدمی نہیں دیکھے۔ ہاں صوفی کی ہمیت یہ گوارا نہ کرے گی کہ وہ عرصہ تک اُن کی مہمان نوازی سے مستفیض ہوتی رہے۔ ان دو ہفتوں میں وہ جتنی کمزور ہو گئی ہے اتنی مہینوں بیمار رہ کر بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اُسے تمام دُنیا کی نعمتیں حاصل ہیں۔ لیکن جس طرح کسی سرد ملک کا پودا گرم ملک میں آ کر ہزاروں کوششوں کے باوجود بھی روز بروز سوکھتا ہی جاتا ہے۔ وہی حالت اُس کی بھی ہو گئی ہے۔ اُس کو ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہاں جاؤں۔ کیا کروں۔ اگر آپ نے اُس کو وہاں سے جلد ہی نہ بلا لیا تو آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ وہ آج کل بدھ اور جین

مذہب کی کتابیں دیکھا کرتی ہے۔ اور مجھے تعجب نہ ہوگا اگر وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے"۔

جان سیوک۔ تم تو روز وہاں جاتے ہو۔ کیوں اپنے ساتھ نہیں لاتے؟

مسز سیوک۔ مجھے اس کا اندیشہ نہیں ہے۔ یسوع کا دشمن میرے یہاں جگہ نہیں پا سکتا۔

پربھو سیوک۔ گرجا نہ جانا ہی اگر یسوع کا دشمن ہونا ہے تو لیجئے آج سے میں بھی گرجا نہ جاؤں گا۔ نکال دیجئے مجھے بھی گھر سے۔

مسز سیوک (رو کر) تو یہاں میرا ہی کیا رکھا ہے؟ اگر میں ہی بس کی گانٹھ ہوں تو میں ہی منہ میں سیاہی لگا کر کیوں نہ نکل جاؤں؟ تم اور صوفی آرام سے رہو۔ میرا بھی خدا مالک ہے۔

جان سیوک۔ پربھو! تم میرے سامنے اپنی ماں کی تحقیر نہیں کر سکتے۔

پربھو سیوک۔ خدا نہ کرے کہ میں اپنی ماں کی تحقیر کروں۔ لیکن میں دکھاوا والے مذہب کے لئے اپنی روح پر یہ جبر نہ ہونے دوں گا آپ لوگوں کی ناراضی کے خوف سے اب تک میں نے اس بارہ میں کبھی زبان نہیں ہلائی۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ اور کسی بات میں تو مذہب کی پرواہ نہیں کی جاتی اور ساری مذہبی محبت کا دکھاوا کے طریقہ پر ہی اظہار کیا جا رہا ہے تو مجھے شک ہوتا ہے کہ اس کا مطلب کچھ اور تو نہیں۔

جان سیوک۔ تم نے کس بات میں مجھے مذہب کے خلاف عمل کرتے دیکھا؟

پربھو سیوک۔ سینکڑوں ہی باتیں ہیں۔ ایک ہو تو کہوں۔

جان سیوک۔ نہیں ایک ہی بتلاؤ ؟

پربھو سیوک۔ اُس بیکس اندھے کی زمین پر قبضہ کرنے کے لئے آپ جن ذرائع سے کام لے رہے ہیں کیا وہ مذہب کے مطابق ہیں؟ مذہب کا خاتمہ وہیں ہو گیا جب اُس نے کہہ دیا کہ میں اپنی زمین کو کسی طرح بھی نہ دوں گا۔ اب قانون حکمت اور دھمکیوں سے اپنا مطلب نکالنا آپ کو مذہب کے موافق معلوم ہوتا ہو تو ہو۔ مجھے تو وہ سراسر لامذہبی اور ناانصافی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

جان سیوک۔ تم اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ میں تم سے حجت نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے جاکر ٹھنڈے ہو آؤ۔ پھر میں تمہیں اس کا جواب دوں گا۔

پربھو سیوک غصہ سے بھرا ہوا اپنے کمرہ میں آیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ یہاں تک تو اس کا ستیا گرہ محض لفظی تھا اب اُس کے عملی ہونے کا موقع آ گیا۔ لیکن عملی کی طاقت اس کے دل میں بالکل نہ تھی۔ اِس جھنجھلاہٹ کی حالت میں وہ کبھی ایک کوٹ پہنتا کبھی اُس کو اُتار کر دوسرا پہنتا۔ کبھی کمرہ کے باہر چلا جاتا۔ کبھی اندر آ جاتا۔ اسی اثنا میں مسٹر جان سیوک آ کر بیٹھ گئے اور متانت آمیز لہجہ میں بولے "پربھو! آج تمہارا جوش دیکھ کر مجھ کو جس قدر رنج ہوا ہے اُس سے کہیں زیادہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے اب تک تمہاری عملی دانائی پر اعتماد تھا۔ لیکن اب وہ اعتماد جاتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ تم زندگی اور مذہب کے تعلق کو خوب سمجھتے ہو لیکن اب معلوم ہوا کہ صوفی اور اپنی ماں کی طرح تم بھی وہم میں مبتلا ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اور مجھ سے اور ہزاروں

اشخاص جو روز گرجا جاتے ہیں بھجن گاتے ہیں اور آنکھیں بند کرکے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ کیا وہ واقعی مذہبی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر اب تک تمہیں نہیں معلوم ہے تو اب معلوم ہو جانا چاہئے کہ مذہب صرف خودغرضی کا نام ہے۔ ممکن ہے تمہیں یسوع پر اعتقاد ہو۔ شاید تم انہیں خدا کا بیٹا یا کم از کم مہاتما سمجھتے ہو۔ پر مجھے تو اس قدر یقین نہیں۔ میرے دل میں ان کے لئے اتنی ہی عقیدت ہے جتنی کسی معمولی فقیر کے لئے۔ اسی طرح فقیر بھی عفو و عطا کے گیت گاتا ہے اور عقبےٰ کی خوشیوں کا راگ الاپتا پھرتا ہے۔ وہ بھی اتنا ہی بے لوث۔ اتنا ہی منکسر مزاج اور اتنا ہی مذہب کا دلدادہ ہے۔ لیکن اس قدر بدظنی ہونے پر بھی میں اتوار کو سو کام چھوڑ کر گرجا ضرور جاتا ہوں۔ نہ جانے سے اپنی جماعت میں بے وقعتی ہوگی۔ اس کا میرے کاروبار پر برا اثر پڑے گا۔ پھر اپنے ہی گھر میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی۔ میں صرف تمہاری ماں کی خاطر سے اپنے اوپر یہ ظلم کرتا ہوں اور تم سے بھی میرا یہی کہنا ہے کہ بیجا ضد سے کام نہ لو۔ تمہاری ماں غصہ کے نہیں بلکہ رحم کے قابل ہے۔ بولو تمہیں کچھ کہنا ہے؟

پربھو سیوک۔ جی نہیں۔

جان سیوک۔ اب تو پھر اتنی شرارت نہ کروگے؟

پربھو سیوک نے مسکرا کر کہا "جی نہیں"

(۶)

مذہبی خوف میں جہاں بہت سی بھلائیاں ہیں وہاں ایک برائی بھی ہے۔ اس میں سادگی ہوتی ہے۔ فریبیوں کا داؤں اس پر آسانی

سے چل جاتا ہے۔ مذہب سے ڈرنے والا آدمی منطقی نہیں ہوتا۔ اُس کی بحثی طاقت شکست پڑ جاتی ہے۔ طاہر علی نے جب سے اپنی دونوں سوتیلی ماؤں کی باتیں سُنی تھیں۔ اُن کا دل بہت زیادہ بیچین ہو رہا تھا۔ بارہا خدا سے دُعا مانگتے تھے۔ آئینی کتب سے اپنے شکوک رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دن تو کسی طرح گزرا۔ شام ہوتے ہی وہ مسٹر جان سیوک کے پاس پہنچے اور نہایت عاجزانہ لہجہ میں بولے "حضور کی خدمت میں اِس وقت ایک خاص عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ارشاد ہو تو کہوں"۔

جان سیوک۔ ہاں ہاں کہئے۔ کوئی نئی بات ہے کیا؟

طاہر۔ حضور اُس اندھے کی زمین لینے کا خیال ترک کر دیں تو عین مناسب ہے۔ ہزاروں دِقّتیں ہیں۔ تنہا سورداس ہی نہیں۔ سارا محلہ مخالفت پر آمادہ ہے۔ خصوصاً نایک رام پنڈا بہت ہی بگڑا ہوا ہے۔ وہ بڑا خوفناک آدمی ہے۔ جانے کتنی بار فوجداریاں کر چکا ہے۔ اگر یہ سب دِقّتیں کسی طرح دور بھی ہو جائیں تو بھی آپ سے یہی استدعا کروں گا کہ اس کے بجائے کسی دوسری زمین کی فکر کیجئے۔

جان سیوک۔ یہ کیوں؟

طاہر۔ حضور! یہ کارِ عذاب ہے۔ صدہا آدمیوں کا کام اُس زمین سے نکلتا ہے۔ سب کی گائیں وہیں چرتی ہیں۔ براتیں ٹھہرتی ہیں۔ پلیگ کے ایام میں لوگ وہیں جھونپڑے ڈالتے ہیں۔ وہ زمین نکل گئی تو سارے محلہ کو تکلیف ہو گی۔ اور لوگ دِل میں ہمیں سینکڑوں بددعائیں دیں گے۔ اس کا عذاب ضرور پڑے گا۔

جان سیوک۔ (ہنس کر) عذاب تو میری گردن پر پڑے گا نا؟ میں اُس کا بوجھ اُٹھا سکتا ہوں۔

طاہر۔ حضور! میں بھی تو آپ ہی کے دامن سے وابستہ ہوں۔ میں اِس عذاب سے کب بچ سکتا ہوں؟ بلکہ محلہ والے تو مجھی کو باغی سمجھتے ہیں۔ حضور تو یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں تو آٹھوں پہر اُن کی آنکھوں کے سامنے رہوں گا۔ ہر وقت اُن کی نظروں میں کھٹکتا رہوں گا۔ عورتیں بھی راہ چلتے دو چار کھری کھوٹی سنا دیا کریں گی۔ عیال دار آدمی ہوں خدا جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے۔ آخر شہر کے مضافات میں اور زمینیں تو مل سکتی ہیں۔

مذہبی خوف مادہ پرستوں کی نظر میں مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ خصوصاً ایک جوان شخص میں اس کا ہونا تو ناقابل عفو سمجھا جاتا ہے۔ جان سیوک نے بناوٹی غصہ دکھلاتے ہوئے کہا "میرے بھی تو بال بچے ہیں۔ جب میں نہیں ڈرتا تو آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اپنے بال بچے پیارے نہیں۔ یا میں خدا سے نہیں ڈرتا؟"

طاہر۔ آپ صاحب اقبال ہیں۔ آپ کو عذاب کا خوف نہیں۔ اقبال مندوں سے عذاب بھی ڈرتا ہے۔ خدا کا قہر غریبوں ہی پر نازل ہوتا ہے۔

جان سیوک۔ اِس نئے مذہبی اصول کے بانی شاید آپ ہی ہونگے کیونکہ میں نے آج تک کبھی نہیں سُنا کہ اقبال مندی سے قہر ایزدی بھی ڈرتا ہے بلکہ ہمارے مذہبی کتب میں تو اہل ثروت کے لئے بہشت کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا ہے۔

طاہر۔ حضور مجھے اس جھگڑے سے دور ہی رکھیں تو بہتر۔

جان سیلوک۔ آج آپ کو اس جھگڑے سے دور رکھوں کل آپ کو یہ خبط ہو کہ جانوروں کو ہلاک کرنے سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ آپ مجھے کھالوں کی خریداری سے دور رکھیں تو میں آپ کو کن کن باتوں سے دور رکھوں گا اور کہاں کہاں قہر ایزدی سے آپ کی حفاظت کروں گا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ آپ کو اپنے ہی سے دور رکھوں۔ میرے یہاں رہ کر آپ کو قہر ایزدی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

مسز سیلوک۔ جب آپ کو قہر ایزدی کا اتنا خوف ہے تو آپ سے ہمارا کام نہیں ہو سکتا۔

طاہر۔ مجھے حضور کی خدمت سے انکار تھوڑا ہی ہے۔ بس تو صرف ....

مسز سیلوک۔ آپ کو ہمارے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ خواہ اس سے آپ کا خدا خوش ہو یا ناخوش۔ ہم اپنے کاموں میں آپ کے خدا کو دست اندازی نہ کرنے دیں گے۔

طاہر علی مایوس ہو گئے۔ دل کو سمجھانے لگے "خدا رحیم ہے۔ کیا وہ دیکھتا نہیں ہے کہ میں کیسی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ میرا اس میں کیا بس ہے۔ اگر مالک کے احکام کی تعمیل نہ کروں تو کنبہ کی پرورش کیسے ہو۔ برسوں تک خاک چھاننے کے بعد تو یہ مستقل ملازمت ملی ہے۔ اسے چھوڑ دوں تو پھر اسی طرح کوچہ گردی اختیار کرنی ہوگی۔ ابھی کچھ اور نہیں ہے تو روٹی دال کا سہارا تو ہے۔ خانہ داری وفکر ضمیر کی آزادی کے لئے مہلک ہے۔

طاہر علی کو لاجواب ہو جانا پڑا۔ بیچارے اپنی بیوی کے سارے گہنے بیچ کر کھا چکے تھے۔ اب ایک چھلا بھی نہ تھا۔ ماہر علی انگریزی پڑھتا

تھا۔ اُس کے لئے اچھے کپڑے بنوانے پڑتے۔ ماہ بماہ فیس دینی پڑتی ظاہر علی اور جابر علی اردو مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ لیکن اُن کی والدہ روزہی جان کھایا کرتی تھی کہ انہیں بھی انگریزی مدرسہ میں بھرتی کرادو۔ اُردو پڑھا کر کیا چپراسگری کرانی ہے؟ انگریزی تھوڑی بھی آجائے گی تو کسی نہ کسی دفتر میں گھس ہی جائیں گے۔ بھائیوں کی ناز برداری پر اُن کی ساری ضرورتیں قربان تھیں۔ پاجامہ میں اتنے پیوند لگ جاتے کہ کپڑے کی اصل شکل ہی چھپ جاتی تھی۔ نئے جوتے پہننا تو شاید ان پانچ برسوں میں انہیں نصیب ہی نہیں ہوا۔ ماہر علی کے پرانے جوتوں پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ خوش نصیبی سے ماہر علی کے پیر بڑے تھے۔ حتی الامکان وہ اپنے بھائیوں کو ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن کبھی ہاتھ تنگ رہنے کے سبب اُن کے لئے نئے کپڑے نہ بنوا سکتے یا فیس دینے میں دیر ہوجاتی۔ یا ناشتہ نہ مل سکتا۔ یا مدرسہ میں کچھ کھانے کے لئے پیسے نہ ملتے تو دونوں مائیں تلخ اور طعن آمیز باتوں سے اُن کو چھید ڈالتی تھیں۔ بیکاری کے ایام میں وہ اکثر اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بیوی اور بچوں کو اپنی سسرال پہنچا دیا کرتے تھے۔ غیرت کے سبب سے ایک آدھ مہینہ کے لئے بلا لیتے اور پھر کسی نہ کسی حیلہ سے رخصت کر دیتے۔ جب سے مسٹر جان سیوک کے یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ جبھی سے گویا اُن کے دن پھر گئے تھے۔ کل کی فکر سر پر سوار نہ رہتی تھی۔ ماہر علی کی عمر پندرہ سال سے تجاوز کرگئی تھی۔ اب ان کی ساری امیدیں اُسی کی ذات سے وابستہ تھیں۔ سوچتے تھے کہ جب ماہر علی میٹرک ہوجائے گا تو صاحب سے سفارش کرکے پولیس میں بھرتی کرادوں گا۔ تنخواہ پچاس روپے ماہوار

سے کیا کم ہو گی۔ ہم دونوں بھائیوں کی آمدنی مل کر اسّی روپے ہو جائے گی۔ جبھی زندگی کا کچھ لطف ملے گا۔ اُس وقت تک طاہر علی بھی ہاتھ پیر سنبھال لے گا۔ پھر تو چین ہی چین ہے۔ بس تین چار برس کی تکلیف اور ہے"۔ بیوی سے اکثر جھگڑا ہو جاتا۔ وہ کہا کرتی "یہ بھائی بند ایک بھی تمہارے کام نہ آئیں گے۔ جوں ہی وقت آیا پر جھاڑ کر نکل جائیں گے۔ تم کھڑے تاکتے رہ جاؤ گے"۔ طاہر علی اِن باتوں پر بیوی سے روٹھ جاتے۔ اُسے گھر میں آگ لگانے والی بس کی گانٹھ کہہ کر رُلاتے۔

اُمیدوں اور فکروں سے اتنا دبا ہوا شخص مسٹر سیوک تلخ کلامی کا کیا جواب دیتا۔ آقا کے قہر نے خدا کے قہر کو مغلوب کر دیا۔ دُکھ بھری آواز میں بولے "حضور کا نمک خوار ہوں۔ آپ کا حکم میرے لئے خدا کے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ کتابوں میں آقا کو خوش رکھنے کا وہی ثواب لکھا ہے جو خدا کو خوش رکھنے کا ہے۔ حضور کی نمک حرامی کر کے خدا کو کیا منہ دکھلاؤں گا"۔

جان سیوک۔ ہاں۔ اب آپ آئے راہِ راست پر۔ جائیے اپنا کام کیجئے۔ مذہب اور تجارت کو ایک ترازو میں تولنا ایک بیوقوفی ہے۔ مذہب مذہب ہے اور تجارت تجارت۔ ان میں کوئی باہمی تعلق نہیں۔ دُنیا میں زندہ رہنے کے لئے تجارت کی ضرورت ہے۔ مذہب کی نہیں۔ مذہب تو تجارت کا سنگار ہے۔ وہ دولت مندوں کے لئے ہی زیبا ہے۔ خدا آپ کو مقدرت دے۔ موقع ملے۔ گھر میں فاضل روپے ہوں تو نماز پڑھئے حج کیجئے مسجد بنوائیے۔ کنواں کُھدوائیے۔ جبھی مذہب ہے۔ خالی پیٹ خدا کا نام لینا گناہ ہے۔

طاہر علی نے جھک کر سلام کیا اور گھر واپس گئے۔

(۷)

شام ہوگئی تھی لیکن پھاگن شروع ہو جانے پر بھی سردی سے ہاتھ پاؤں اکڑتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بدن کی ہڈیوں میں چبھے جاتے تھے۔ جاڑا۔ بارش کی مدد پا کر پھر اپنی بکھری ہوئی طاقتوں کو مجتمع کر رہا تھا۔ اور دل سے کوشاں تھا کہ موجودہ موسم کو پلٹ دے۔ بادل بھی تھے۔ بوندیں بھی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا بھی تھی۔ کہرا بھی تھا۔ ان مختلف طاقتوں کے مقابلہ میں موسم بہار کی ایک نہ چلتی تھی۔ لوگ لحاف میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھے۔ جیسے چوہے بلوں میں سے جھانکتے ہوں۔ دوکان دار انگیٹھیوں کے سامنے بیٹھے ہاتھ سینکتے تھے۔ پیسوں کے سودے نہیں۔ مروت کے سودے بیچتے تھے۔ راہ چلتے لوگ الاؤ پر یوں گرتے تھے۔ جیسے شمع پر پروانے۔ بڑے گھروں کی عورتیں مناتی تھیں۔ مصرانی نہ آئے تو آج کھانا پکائیں۔ چولھے کے سامنے بیٹھنے کا موقع ملے۔ چاء کی دوکانوں پر جمگھٹ رہتا تھا۔ ٹھاکر دین کے پان چھبڑی میں پڑے سڑ رہے تھے۔ پر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ ان کو پھیرے۔ سور داس اپنی جگہ پر تو آ بیٹھا تھا پر ادھر ادھر سے سوکھی ٹہنیاں اکٹھی کر کے جلالی تھیں اور ہاتھ سینک رہا تھا۔ سواریاں آج کہاں؟ ہاں کوئی اِکّا دُکّا مسافر نکل جاتا تھا تو بیٹھے بیٹھے اُس کا کلیان منا لیتا تھا۔ جب سے سید طاہر علی نے اُسے دھمکیاں دی تھیں۔ زمین کے نکل جانے کا خوف اُس پر سوار رہتا تھا۔ سوچتا کیا اِسی دن کے لئے میں نے اِس زمین کی اتنی حفاظت کی تھی؟ میرے دن سدا ایسے ہی تھوڑے رہیں گے۔ کبھی تو بھی خوش ہوں گی۔

اندھوں کی آنکھیں نہ کھلیں مگر نصیب تو کھل سکتے ہیں۔ کون جانے۔ کوئی دانی داتا مل جائے یا میرے ہی پاس دھیرے دھیرے کچھ روپے اکٹھے ہو جائیں۔ بنتے دیر نہیں لگتی۔ یہی خواہش تھی کہ یہاں ایک کنواں اور چھوٹا سا مندر بنوا دیتا تو مرنے کے پیچھے اپنی کچھ نشانی رہتی۔ نہیں تو کون جانے گا۔ کہ اندھا کون تھا؟ پنہاری نے کنواں کھدوایا تھا آج تک اس کا نام چلا جاتا ہے۔ جھگڑ سائیں نے باؤلی بنوائی تھی۔ آج تک جھگڑ کی باؤلی مشہور ہے۔ زمین نکل گئی تو نام ڈوب جائے گا۔ کچھ روپے ملے بھی تو کس کام کے؟ نایک رام اُسے ڈھارس دیتا تھا۔ "تم کچھ ست کرو۔ کون مائی کا لال ہے جو میرے رہتے تمہاری زمین نکال لے؟ لہو کی ندی بہا دوں گا۔ اُس کرنٹے کی کیا مجال؟ گودام میں آگ لگا دوں گا۔ ادھر کا راستہ چھڑا دوں گا وہ ہے کس گمان میں؟ بس تم حامی نہ بھرنا۔" مگر ان الفاظ سے جو تشفی ہوتی تھی وہ بھیرو اور جگدھر کی حاسدانہ بحث سے مٹ جاتی تھی۔ اور وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ جاتا تھا۔

وہ انہیں خیالات میں محو تھا کہ نایک رام کندھے پر لٹھ رکھے اور ایک انگوچھا کندھے پر ڈالے پان کے بیڑے منہ میں بھرے وہاں آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "سورداس! بیٹھے تاپتے ہی رہو گے۔ سانجھ ہو گئی۔ ہوا کھانے والے اب اس ٹھنڈ میں نہ نکلیں گے۔ کھانے بھر کو مل گیا کہ نہیں؟"

سورداس۔ کہاں مہاراج۔ آج تو ایک بھاگوان سے بھی بھینٹ نہ ہوئی۔

نایک رام۔ جو بھاگ میں تھا مل گیا۔ چلو گھر چلیں۔ بہت ٹھنڈ لگتی ہو تو میرا یہ انگوچھا کندھے پر ڈال لو۔ میں تو ادھر آیا تھا کہ کہیں صاحب مل جائیں تو دو دو باتیں کر لوں۔ پھر ایک بار اُن کی اور ہماری بھی ہو جائے؟

سورداس چلنے کو اٹھا ہی تھا کہ دفعتاً ایک گاڑی کی آہٹ سنائی دی
رک گیا۔ آس بندھی۔ ایک لمحہ میں فٹن آپہنچی۔ سورداس نے آگے بڑھ
کر کہا "داتا بھگوان تمہارا کلیان کریں اندھے کی خبر (خبر) لیجئے" ٭
فٹن رک گئی اور چاری کے راجہ صاحب اتر پڑے۔ نایک رام
ان کا پنڈا تھا۔ سال میں دو چار سو روپے ان کی ریاست سے پاتا تھا۔
ان کو آشیرباد دے کر بولا "سرکار ادھر کیسے آنا ہوا؟ آج تو بڑی ٹھنڈ
ہے" ٭

راجہ صاحب۔ یہی سورداس ہے جس کی زمین آگے پڑتی ہے؟ آؤ
تم دونوں آدمی میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا اس زمین کو دیکھنا چاہتا
ہوں ٭

نایک رام۔ سرکار چلیں۔ ہم دونوں پیچھے پیچھے آتے ہیں ٭

راجہ صاحب۔ اجی آکر بیٹھ جاؤ۔ تمہیں آنے میں دیر ہوگی اور میں
نے ابھی سندھیا نہیں کی ہے ٭

سورداس۔ پنڈا جی! تم بیٹھ جاؤ۔ میں دوڑتا ہوا چلوں گا۔ گاڑی کے
ساتھ ہی ساتھ پہنچوں گا ٭

راجہ صاحب۔ نہیں نہیں۔ تمہارے بیٹھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے
تم اس وقت بھکاری سورداس نہیں۔ زمیندار سورداس ہو ٭

نایک رام۔ بیٹھو شور بیٹھو۔ ہمارے سرکار ساکشات دیوتا سروپ
ہیں ٭

سورداس۔ پنڈا جی! میں . . . . .

راجہ صاحب۔ پنڈا جی! تم ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دو۔ یوں نہ بیٹھیں گے ٭

نایک رام نے سورداس کو گود میں اُٹھا کر گدّی پر بٹھا دیا۔ آپ بھی بیٹھے اور فٹن روانہ ہوئی۔ سورداس کو اپنی زندگی میں فٹن میں سوار ہونے کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اُڑا جا رہا ہوں۔ تین چار منٹ میں جب گودام پر گاڑی رُک گئی اور راجہ صاحب اُتر پڑے۔ تو سورداس کو تعجب ہوا کہ اتنی جلد کیونکر آ گئے۔

راجہ صاحب۔ زمین تو بڑے موقع کی ہے۔

سورداس۔ سرکار! باپ دادوں کی نشانی ہے۔

سورداس کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں "کیا صاحب نے اِن کو یہ زمین دیکھنے کے لئے بھیجا ہے؟ سُنا ہے یہ بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔ تو انہوں نے صاحب کو سمجھا کیوں نہ دیا؟ بڑے آدمی سب ایک ہوتے ہیں۔ چاہے ہندو ہو یا مسلمان۔ تبھی تو میرا اتنا آدر کر رہے ہیں۔ جیسے بکرے کی گردن کاٹنے کے پہلے اُسے پیٹ بھر دانہ کھلا دیتے ہیں۔ لیکن میں ان کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔

راجہ صاحب۔ اسامیوں کے ساتھ بندوبست ہے؟

نایک رام۔ نہیں سرکار۔ ایسی ہی پرتی پڑی رہتی ہے۔ سارے محلہ کی گائیں یہیں چرنے آتی ہیں۔ اُٹھا دی جائے تو دو سو سے کم نفع نہ ہو پر یہ کہتا ہے۔ اب بھگوان مجھے یونہی کھانے بھر کو دے دیتے ہیں تو اِسے کیوں اُٹھاؤں؟

راجہ صاحب۔ اچھا تو سورداس دان لیتا ہی نہیں۔ دیتا بھی ہے۔ ایسے لوگوں کے درشن ہی سے پُن ہوتا ہے۔

نایک رام کی نگاہ میں سورداس کی اتنی عزت کبھی نہ ہوئی تھی۔ بولے

"حضور! اس جنم کا کوئی بڑا بھاری مہاتما ہے"۔

راجہ صاحب۔ اُس جنم کا نہیں اِس جنم کا مہاتما ہے۔

سچا سخی شہرت کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ سورداس کو اپنی قربانی اور سخاوت کی اہمیت کا علم ہی نہ تھا۔ شاید ہوتا تو مزاج میں اتنی سادگی اور عاجزی نہ رہتی بلکہ اپنی تعریف کانوں کو اچھی لگتی۔ مہذب نگاہوں میں سخاوت کا یہی بہترین انعام ہے۔ سورداس کا دان زمین یا آسمان کا دان تھا جسے تعریف یا شہرت کی فکر نہیں ہوتی۔ اُس کو راجہ صاحب کی فیاضی میں فریب کا شائبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا کہ راجہ صاحب کا اِن باتوں سے مطلب کیا ہے؟

نایک رام راجہ صاحب کو خوش کرنے کے لئے سورداس کی تعریف کرنے لگے "دھرماوتار! اتنے پر بھی انہیں چین نہیں ہے۔ یہاں دھرم شالہ مندر اور کنواں بنوانے کا ارادہ کر رہے ہیں"۔

راجہ صاحب۔ واہ پھر تو بات ہی بن گئی۔ کیوں سورداس! تم اِس زمین سے نو بیگھے مسٹر جان سیوک کو دے دو۔ اُن سے جو روپے ملیں اُنہیں دھرم کاج میں لگا دو۔ اس طرح تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ اور صاحب کا کام بھی نکل جائے گا۔ دوسروں سے اتنے اچھے دام نہ ملیں گے۔ بولو کتنے روپے دلا دوں۔

نایک رام سورداس کو خاموش دیکھ کر ڈر گئے کہ کہیں یہ انکار کر بیٹھا تو میری بات گئی۔ بولے "سورداس! ہمارے مالک کو جانتے ہو نا؟ چتاری کے مہاراجہ ہیں۔ اسی دربار سے ہماری پرورش ہوتی ہے میونسپلٹی کے سب سے بڑے حاکم ہیں۔ آپ کے حکم بنا کوئی اپنے دروازہ پر کھونٹا

بھی نہیں گاڑ سکتا۔ چاہیں تو سب بِگہ بانوں کو پکڑوا لیں۔ سارے شہر کا پانی بند کر دیں ؂

سورداس۔ جب آپ کا اتنا بڑا اختیار ہے تو صاحب کو کوئی دوسری زمین کیوں نہیں دلا دیتے؟

راجہ صاحب۔ ایسے اچھے موقع پر شہر میں دوسری زمین ملنی مشکل ہے۔ لیکن تمہیں اس کے دینے میں کیا قباحت ہے۔ اس طرح تو نہ جانے کتنے دنوں میں تمہاری آرزوئیں پوری ہوں گی۔ یہ تو بہت اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ روپے لے کر دھرم کاج میں لگا دو ؂

سورداس۔ مہاراج! میں خوشی سے اپنی زمین نہ بیچوں گا ؂

نایک رام۔ سورداس! کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟ کچھ خیال ہے کسی سے باتیں کر رہے ہو؟

سورداس۔ پنڈا جی! سب خیال ہے۔ آنکھیں نہیں ہیں تو کیا بدّھی (عقل) بھی نہیں ہے؟ پر جب میری چیز ہے ہی نہیں تو میں اُس کا بیچنے والا کون ہوں؟

راجہ صاحب۔ یہ زمین تو تمہاری ہی ہے؟

سورداس۔ نہیں سرکار! میری نہیں۔ میرے باپ دادوں کی ہے۔ میری چیز وہی ہے جو میں نے اپنے بانہہ بَل (ہاتھوں کی مشقت) سے پیدا کی ہو۔ یہ زمین مجھے دھروہر (امانت) ملی ہے۔ میں اس کا مالک نہیں ہوں ؂

راجہ صاحب۔ سورداس! تمہاری یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اگر اور زمینداروں کے دل میں ایسے ہی خیالات ہوتے تو آج سیکڑوں گھر اس

طرح تباہ نہ ہوتے۔ صرف عیش و عشرت کے لئے لوگ بڑی بڑی ریاستیں برباد کر دیتے ہیں۔ پنڈا جی! میں نے کونسل میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ زمینداروں کو اپنی جائداد بیچنے کا اختیار نہیں ہے۔ لیکن جو جائداد دھرم کاج کے لئے بیچی جائے اس کو میں بیچنا نہیں کہتا۔

سورداس۔ دھرماوتار! میرا تو اس زمین کے ساتھ اتنا ہی ناتا ہے کہ جب تک جیوں اس کی حفاظت کروں اور مروں تو اسے جیوں کا توں چھوڑ جاؤں۔

راجہ صاحب۔ لیکن یہ تو سوچو کہ تم اپنی زمین کا ایک حصہ صرف اس لئے دوسرے کو دے رہے ہو کہ مندر وغیرہ بنوانے کے لئے روپے مل جائیں۔

نایک رام۔ بولو۔ سورداس! مہاراج کی اس بات کا کیا جواب دیتے ہو؟

سورداس۔ میں سرکار کی باتوں کا جواب دینے جوگ (لایق) ہوں کہ جواب دوں۔ مگر اتنا تو سرکار جانتے ہی ہیں کہ لوگ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑ لیتے ہیں۔ صاحب پہلے تو نہ بولیں گے۔ پھر دھیرے دھیرے احاطہ بنا لیں گے۔ کوئی مندر میں جانے نہ پائے گا۔ اُن سے کون روز روز لڑائی کرے گا؟

نایک رام۔ مہاراج! سورداس نے یہ بات پکی کہی۔ بڑے آدمیوں سے کون لڑتا پھرے گا؟

راجہ صاحب۔ صاحب کیا کریں گے؟ کیا تمہارا مندر کھود کر پھینک دیں گے؟

نایک رام۔ بولو سورداس اب کیا کہتے ہو؟

سورداس۔ سرکار! غریب کی گھروالی گاؤں کی بھاوج ہوتی ہے۔ صاحب کرستان ہیں۔ دھرم شالہ میں تمباکو کا گودام بنائیں گے۔ مندر میں ان کے مجور (مزدور) سوئیں گے۔ کنوئیں پر اُن کے مجوروں کا اڈا ہوگا۔ بہو بیٹیاں پانی بھرنے نہ جا سکیں گی۔ صاحب نہ کریں گے تو صاحب کے لڑکے کریں گے۔ میرے باپ دادوں کا نام ڈوب جائے گا۔ سرکار! مجھے اس دلدل میں نہ پھنسائیے۔

نایک رام۔ دھرماوتار! سورداس کی بات میرے من میں بھی بیٹھتی ہے۔ تھوڑے دنوں میں مندر۔ دھرم شالا۔ کنواں سب صاحب کا ہو جائے گا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔

راجہ صاحب۔ اچھا۔ یہ بھی مانا۔ لیکن ذرا یہ بھی سوچو کہ اس کارخانہ سے لوگوں کا کیا فائدہ ہوگا۔ ہزاروں مزدور، مستری۔ بابو۔ منشی۔ لوہار۔ بڑھئی آکر آباد ہو جائیں گے۔ ایک اچھی بستی ہو جائے گی۔ بنیوں کی نئی نئی دوکانیں کھل جائیں گی۔ آس پاس کے کسانوں کو اپنی ساگ بھاجی لے کر شہر نہ جانا پڑے گا۔ یہیں کھرے دام مل جائیں گے۔ کنجڑے۔ گوالے۔ دھوبی۔ درزی۔ سبھی کو فائدہ ہوگا۔ کیا اس کا ثواب تم کو نہ ہوگا؟

نایک رام۔ اب بولو۔ سورداس! اب تو کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہمارے سرکار کی بھلمنسی ہے کہ تم سے اتنی دلیلیں کر رہے ہیں۔ دوسرا حاکم ہوتا تو ایک حکم نامہ میں ساری زمین تمہارے ہاتھ سے نکل جاتی۔

سورداس۔ اس لئے تو لوگ چاہتے ہیں کہ حاکم دھرماتما ہوں نہیں

تو کیا دیکھتے نہیں ہیں کہ حاکم لوگ بنا ڈام۔ فول۔ شور کے بات نہیں کرتے۔ اُن کے سامنے کھڑے نہ ہونے کا تو ہیاؤ ہی نہیں ہوتا۔ باتیں کون کرتا؟ اس لئے تو مناتے ہیں کہ ہمارے راجوں مہاراجوں کا راج ہوتا جو ہمارا دُکھ درد سُنتے۔ سرکار بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ محلّہ کی رونق ضرور بڑھے گی روزگاری لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہوگا۔ لیکن جہاں یہ رونق ہوگی وہاں تاڑی شراب کا بھی تو پرچار بڑھ جائے گا۔ کسبیاں بھی تو آ کر بس جائیں گی۔ پردیسی آدمی ہماری بہو بیٹیوں کو گھوریں گے۔ کتنا ادھرم ہوگا؟ دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ کر مجوری کی لالچ سے دوڑیں گے۔ یہاں بُری بُری باتیں سیکھیں گے اور اپنے بُرے آچرن (چال چلن) اپنے گانوں میں پھیلائیں گے۔ دیہاتوں کی بیٹیاں بہوئیں مجوری کرنے آئیں گی اور یہاں پیسے کے لوبھ میں اپنا دھرم بگاڑیں گی۔ جو رونق شہروں میں ہے۔ وہی رونق یہاں ہو جائے گی۔ بھگوان نہ کریں یہاں وہ بات ہو۔ سرکار مجھے اس کو کرم اور ادھرم سے بچائیں یہ سارا پاپ میرے سر پڑے گا ؞

نایک رام۔ دین بندھو! سورداس بہت پکّی بات کہتا ہے۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ احمد آباد۔ کان پور آپ کے اکبال (اقبال) سے سبھی جگہ گھوم آیا ہوں۔ ججمان لوگ بُلاتے رہتے ہیں۔ جہاں جہاں کل کارخانے ہیں وہاں یہی حال دیکھا ہے ؞

راجہ صاحب۔ کیا یہ بُرائیاں تیرتھ کے مقاموں میں نہیں ہیں؟

سورداس۔ سرکار اُن کا سدھار بھی تو بڑے آدمیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں بُری باتیں پہلے ہی سے ہیں وہاں سے ہٹانے کے بدلے اُنہیں

اور پھیلانا تو مناسب نہیں ۔

راجہ صاحب ۔ ٹھیک کہتے ہو۔ سورداس! بہت ٹھیک کہتے ہو۔ تم جیتے ۔ میں ہار گیا۔ تمہاری باتوں سے طبیعت خوش ہو گئی۔ کبھی شہر آنا تو میرے یہاں ضرور آنا۔ جس وقت میں نے صاحب سے اس زمین کے طے کرا دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ یہ باتیں میرے دھیان میں نہ آئی تھیں ۔ اب تم خاطر جمع رکھو ۔ میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ سورداس زمین نہیں دیتا ۔ نایک رام! دیکھو۔ سورداس کو کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اب میں چلتا ہوں ۔ یہ لو سورداس! یہ تمہارے اتنی دور آنے کی مزدوری ہے ۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے ایک روپیہ سورداس کے ہاتھ میں رکھا اور چل دیئے ۔ نایک رام نے کہا " سورداس! اب راجہ صاحب بھی تمہاری کھوپڑی کو مان گئے "۔

(۸)

صوفیا کو آندو کے ساتھ رہتے چار مہینے گزر گئے۔ اپنے گھر اور گھر والوں کی یاد آتے ہی اُس کے دل میں ایک آگ سی جل اُٹھتی تھی۔ پربھوسیوک روزانہ ایک بار اُس سے ملنے آیا کرتا۔ پر کبھی اُس سے گھر کے حالات نہ پوچھتی۔ وہ کبھی ہوا کھانے بھی نہ جاتی کہ کہیں ماما سے سامنا نہ ہو جائے ۔ اگرچہ آندو نے اس کے ذاتی حالات کو سب سے مخفی رکھا تھا لیکن قیاس سے سبھی اُس کے واقعی حالات سے واقف ہو گئے تھے۔ اس لئے ہر شخص کو یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو اُس کو ناگوار ہو۔ اندو کو تو اُس سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ زیادہ تر اُسی

کے پاس بیٹھی رہتی۔ اُس کی صحبت سے اندو کو بھی مذہب اور فلسفہ کی کتابوں سے رغبت ہونے لگی تھی ۔

گھر ٹپکتا ہو تو اس کی مرمت کی جاتی ہے۔ اگر جاتے تو اُسے چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ صوفی کو جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ میری ساری باتیں جان گئے تو اس نے پردہ رکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ مذہبی کتب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی۔ پُرانی کدورتیں دل سے مٹنے لگیں۔ ماں کی دل خراش باتوں کا زخم مندمل ہونے لگا۔ وہ تنگ خیالی جو ذاتی جذبات اور خیالات کو نمائش اہمیت دے دیتی ہے۔ اس اطاعت اور اخلاق کے دائرہ میں آکر بیچ معلوم ہونے لگی۔ دل نے کہا یہ ماما کا قصور نہیں بلکہ اُن کی مذہبی تنگ خیالی کا قصور ہے۔ اُن کے خیال کا دائرہ محدود ہے۔ اُن میں آزاد خیالی کا احترام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اُن سے میں ناحق ناراض ہو رہی ہوں یہی ایک کانٹا تھا جو اُس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔ جب وہ نکل گیا تو دل کو سکون ہو گیا۔ اُس کا وقت مذہبی کتب کے مطالعہ اور مذہبی اصولوں کی تحقیقات میں گزرنے لگا۔ انہماک۔ دردِ دل کا بہترین علاج ہے ۔

لیکن اس مطالعہ اور تحقیقات سے اُس کے دل کو قرار آ جاتا ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ طرح طرح کے شکوک ہر روز پیدا ہوتے رہتے تھے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہر مذہب میں اُس کا جُدا جُدا جواب ملتا تھا۔ لیکن ایک بھی ایسا نہیں ملا جس کو دل قبول کرے۔ معجزات کیا ہیں؟ کیا صرف عقیدت مندوں کی فرضی باتیں ہیں۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ عبادت کا مقصد کیا ہے؟ خدا کیوں انسانوں سے اپنی عبادت کرنے کے لئے کہتا ہے؟ اس سے اُس کی منشا کیا ہے؟ کیا وہ اپنی ہی خلقت سے اپنی تعریف

سُن کر خوش ہوتا ہے۔ وہ ان سوالوں پر غور کرنے میں اس قدر محو رہتی کہ کئی کئی روز کمرہ کے باہر نہ نکلتی۔ کھانے پینے کی بھی سُدھ نہ رہتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اندو کا آنا اُسے بُرا معلوم ہوتا۔

ایک روز صبح کے وقت وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اندو آکر بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ اُداس تھا۔ صوفیہ اُس کی جانب متوجہ نہ ہوئی۔ حسب سابق مطالعہ میں مصروف رہی۔ اندو بولی "صوفی! اب یہاں دو چار دن کی اور مہمان ہوں مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟"

صوفی نے سر اُٹھائے بغیر ہی کہا "ہاں!"

اندو۔ تمہارا دل تو اپنی کتابوں میں بہل جائے گا۔ میری یاد بھی نہ آئے گی پر مجھ سے تمہارے بغیر ایک دن بھی نہ رہا جائے گا۔

صوفی نے کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں"۔

اندو۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ سارا دن تنہا پڑے پڑے سوچا کروں گی۔

صوفی نے کتاب کا ورق اُلٹتے ہوئے کہا "ہاں"۔

اب اندو صوفیہ کی اس سرد مہری کو برداشت نہ کر سکی۔ کسی دوسرے وقت وہ ناراض ہو کر چلی جاتی یا اُس کو مطالعہ میں محو دیکھ کر کمرہ میں قدم ہی نہ رکھتی۔ لیکن اس وقت اُس کا ملائم دل جدائی کے درد سے بھرا ہوا تھا۔ اُس میں روٹھنے کے خیال کی گنجائش نہ تھی۔ رو کر بولی "بہن! ایشور کے لئے ذرا کتاب بند کر دو۔ میں چلی جاؤں گی تو پھر خوب پڑھ لینا۔ وہاں سے تمہیں چھیڑنے نہ آؤں گی"۔

صوفی نے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا مراقبہ سے بیدار ہوئی۔ اُس کی

آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ چہرہ اُداس تھا اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بولی "ارے اندو! بات کیا ہے؟ روتی کیوں ہو؟"

اندو۔ تم اپنی کتاب پڑھو۔ تمہیں کسی کے رونے دھونے کی کیا پرواہ ہے؟ ایشور نے نہ جانے کیوں تمہارے جیسا دل مجھ کو نہیں دیا۔

صوفیہ۔ بہن! معاف کرنا! میں ایک بڑی الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ ابھی تک وہ گتھی نہیں سلجھی۔ میں بُت پرستی کو بالکل لغو خیال کرتی تھی۔ میں سمجھتی کہ رشیوں نے صرف جہلا کی روحانی تسکین کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے۔ لیکن اِس کتاب میں بُت پرستی کا جواز ایسے عالمانہ دلائل کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ آج میں مورتی پوجا کی قایل ہو گئی۔ مصنّف نے اس کو سائنٹیفک طریقہ پر ثابت کیا ہے۔ یہاں تک کہ مورتوں کی بناوٹ اور رکھاوٹ کو بھی انہیں طریقوں پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔

اندو۔ میرے لئے بلاوا آ گیا۔ آج کے تیسرے دن چلی جاؤں گی۔

صوفیہ۔ یہ تو تم نے بُری خبر سُنائی۔ پھر میں یہاں کیسے رہوں گی؟

اس جملہ میں ہمدردی نہیں بلکہ خود غرضی تھی۔ لیکن اندو نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ صوفی کے لئے میری جدائی ناقابل برداشت ہو گی۔ بولی "تمہارا جی تو کتابوں میں بہل جائے گا۔ میں البتہ تمہاری یاد میں تڑپا کروں گی۔ سچ جانو تمہاری صورت ایک لمحہ کے لئے بھی خیال سے نہ ہٹے گی۔ یہ موہنی مورت آنکھوں کے سامنے پھرا کرے گی۔ بہن! اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو ایک استدعا کروں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم بھی کچھ دن میرے ساتھ رہو؟ تمہاری صحبت سے میری زندگی بھی سُدھر جائے گی۔ میں اس کے لئے ہمیشہ تمہاری ممنون رہوں گی۔

صوفیہ۔ تمہاری محبت کی اسیر ہوں۔ جہاں چاہو لے چلو۔ چاہوں تو جاؤں گی۔ نہ چاہوں تو جاؤں گی۔ مگر یہ تو بتاؤ تم نے راجہ صاحب سے بھی پوچھ لیا ہے؟

اندو۔ یہ ایسی کون سی بات ہے جس کے لئے ان کی صلاح لینی پڑے۔ مجھ سے برابر کہتے رہتے ہیں کہ تمہارے لئے ایک لیڈی کی ضرورت ہے اکیلے تمہارا جی گھبراتا ہوگا۔ یہ تجویز سن کر خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔

رانی جانہوی تو اندو کے رخصت کی تیاریاں کر رہی تھیں اور اندو صوفیہ کے لئے لیس اور کپڑے لا لا کر رکھتی تھی۔ انواع و اقسام کی پوششوں سے کئی صندوق بھر دیئے۔ وہ اُسے ایسے ٹھاٹھ سے لے جانا چاہتی تھی۔ کہ گھر کی لونڈیاں باندیاں اس کا مناسب احترام کریں۔ پربھو سیوک کو صوفیہ کا اندو کے ساتھ جانا اچھا نہ لگتا تھا۔ اُس کو اب بھی امید تھی کہ ماما کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور وہ صوفی کو گلے لگائیں گی۔ صوفی کے چلے جانے سے مغائرت کا بڑھنا یقینی امر تھا۔ اُس نے صوفیہ کو سمجھایا لیکن وہ اندو کی تجویز کو نامنظور نہ کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے عہد کر لیا کہ اب گھر نہ جاؤں گی۔

تیسرے روز راجہ مہیندر کمار اندو کو رخصت کرانے آئے۔ تو اندو نے اور باتوں کے ساتھ صوفی کو ساتھ لے چلنے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ بولی "میرا جی وہاں اکیلے گھبرایا کرتا ہے۔ مِس صوفیہ کے رہنے سے میرا جی بہل جائے گا"۔

مہیندر۔ کیا مِس سیوک ابھی تک یہیں ہیں؟

اندو۔ بات یہ ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں آزاد خیالی چاہتی ہیں اور

اُن کے گھر والے اس آزاد خیالی کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے گھر نہیں جانا چاہتیں ۔

مہیندر۔ لیکن یہ تو سوچو کہ اُن کے میرے یہاں رہنے سے میری کتنی بدنامی ہوگی۔ مسٹر سیوک کو یہ بات بُری لگے گی اور یہ بالکل غیر مناسب ہے کہ میں اُن کی لڑکی کو اُن کی مرضی کے بغیر اپنے گھر میں رکھوں۔ اس میں سراسر بدنامی ہوگی ۔

اندو۔ مجھے تو اس میں بدنامی کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ کیا سہیلی اپنی سہیلی کے یہاں مہمان نہیں ہوتی؟ صوفی کا مزاج بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ اِدھر اُدھر گھومنے لگے گی ۔

مہیندر۔ وہ دیوی سہی۔ لیکن ایسے کتنے ہی وجوہ ہیں کہ میں ان کا تمہارے ساتھ جانا نامناسب سمجھتا ہوں۔ تم میں یہ بڑا عیب ہے کہ تم کسی کام کو کرنے سے پہلے اُس پر غور کر لینا ٹھیک نہیں سمجھتیں۔ کیا تمہاری رائے میں خاندانی رواج کی مخالفت کرنے میں کوئی بُرائی نہیں؟ اُن کے گھر والے یہی تو چاہتے ہیں کہ وہ ظاہراً طریقہ پر اپنے مذہبی احکام کی پابندی کریں۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں کرسکتیں تو میں یہی کہوں گا کہ اُن کی آزاد خیالی موزونیت کی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گئی ہے ۔

اندو۔ لیکن میں اُن سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میں کئی دن سے انہیں تیاریوں میں مصروف ہوں۔ یہاں اماں جی سے اجازت لے چکی ہوں۔ گھر کے سبھی لوگ نوکر چاکر جانتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ جارہی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں اُن کو نہ لے گئی تو لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ سوچئے اِس میں میری کتنی رسوائی ہوگی۔ میں کسی کو مُنہ دکھانے

کے قابل قدر ہوں گی ۔

مہیندر۔ بدنامی سے بچنے کے لئے سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں مس سیوک سے کہتے شرم آتی ہو تو میں کہہ دوں۔ وہ اتنی نادان نہیں ہیں کہ اتنی موٹی سی بات نہ سمجھیں ۔

اندو۔ مجھے اُن کے ساتھ رہتے رہتے اُن سے اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ اب اُن سے ایک دن بھی علیحدہ رہنا مجھے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تو خیر پرواہ نہیں۔ جانتی ہوں۔ کبھی نہ کبھی اُن سے جدائی ہو ہی گی۔ اس وقت سب سے زیادہ فکر مجھے اپنی سُبکی کی ہے۔ لوگ کہیں گے۔ بات کہہ کر پلٹ گئی۔ صوفی نے پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرے بہت کہنے سُننے پر راضی ہوئی تھی۔ آپ میری خاطر سے اب کے میری یہ استدعا قبول کیجئے۔ پھر میں آپ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کروں گی ۔

مہیندر کمار کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اندو روئی۔ اُس نے منت سماجت کی۔ وہ پیروں پڑی۔ اُس نے وہ سبھی منتر پھونکے جو کبھی بے اثر نہیں ہوتے لیکن شوہر کا پتھر کا دل نہ پسیجا۔ ان کو اپنا نام دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھا ۔

جب مہیندر کمار باہر چلے گئے تو اندو بہت دیر تک حالتِ غم میں بیٹھی رہی۔ بار بار یہی خیال آتا۔ صوفی اپنے دل میں کیا کہے گی؟ میں نے اُس سے کہہ رکھا تھا کہ میرے سوامی میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اب وہ سمجھے گی کہ وہ اس کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ بات بھی ایسی ہی ہے۔ اُنہیں میری کیا پرواہ ہے؟ باتیں ایسی کریں گے گویا ان سے زیادہ فیاض طبع دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے۔ پر وہ سب کوری بکواس ہے

اُنہیں تو یہی منظور ہے کہ یہ دن بھر تنہا بیٹھی اپنے نام کو رویا کرے۔ دل میں جلتے ہوں گے کہ صوفی کے ساتھ اس کے دن بھی آرام سے کٹیں گے۔ مجھے قیدیوں کی طرح رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں ضد کرنا آتا ہے تو ہیں کیا ضد نہیں کر سکتی؟ میں بھی کہے دیتی ہوں آپ صوفی کو نہ چلنے دیں گے تو میں بھی نہ جاؤں گی۔ میرا کر ہی کیا سکتے ہیں! کچھ نہیں۔ دل میں ڈرتے ہیں کہ صوفی کے جانے سے گھر کا خرچ بڑھ جائے گا۔ خسیس تو ہیں ہی۔ اُس خست کو چھپانے کے لئے بدنامی کا بہانہ نکالا ہے؟ دل غمگین ہو کر دوسروں کی نیک نیتی پر شک کرنے لگتا ہے۔

شام کے وقت جانھوی سیر کرنے چلی۔ تو اندو نے اُس سے یہ باتیں کہیں اور اصرار کیا کہ تم بھینا، ر کو سمجھا کر صوفی کو لے جانے پر راضی کر دو۔ جانھوی نے کہا "تمہیں کیوں نہیں مان جاتیں"؟

اندو۔ اماں! میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔ میں ضد نہیں کرتی۔ اگر میں نے پہلے ہی صوفیہ سے نہ کہہ دیا ہوتا تو مجھے ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ پر ساری تیاریاں کر کے اب اس کو نہ لے جاؤں تو وہ اپنے دل میں کیا کہے گی؟ میں اس کو منہ نہیں دکھا سکتی۔ یہ اتنی چھوٹی سی بات ہے کہ اگر میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ ایسی حالت میں آپ کیونکر امید کر سکتی ہیں کہ میں اُن کے ہر حکم کی تعمیل کروں؟

جانھوی۔ وہ تمہارے سوامی ہیں۔ اُن کی سبھی باتیں تمہیں ماننی پڑینگی"۔

اندو۔ خواہ وہ میری ذرا ذرا سی باتیں بھی نہ مانیں؟

جانھوی۔ ہاں اُنہیں اُس کا اختیار ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔ کہ میری نصیحتوں کا تمہارے اوپر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ میں تم کو شوہر پرست ستی

دیکھنا چاہتی ہوں جسے اپنے شوہر کے حکم یا مرضی کے سامنے اپنی عزت یا ذلت کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ اگر وہ تمہیں سر کے بل چلنے کو کہیں تو بھی تمہارا فرض ہے کہ سر کے بل چلو۔ تم اتنے ہی میں گھبرا گئیں ٭

اندو۔ آپ مجھ سے وہ کرنے کے لئے کہتی ہیں جو میرے لئے ناممکن ہے۔

جانہوی۔ چپ رہو۔ میں تمہارے منہ سے ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں صوفی کی آزاد خیالی کا جادو تمہارے اوپر بھی تو نہیں چل گیا؟

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ خوف تھا کہ میرے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل پڑے۔ جس اماں کے دل میں یہ شک اور بھی جگہ پکڑ لے تو بیچاری صوفی کا یہاں رہنا ہی مشکل ہو جائے۔ وہ راستہ بھر یک دم خاموش بیٹھی رہی۔ جب گاڑی پھر مکان پر پہنچی اور وہ اُتر کر اپنے کمرہ کی طرف جانے لگی تو جانہوی نے کہا۔" بیٹی! تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں۔ جھیندر سے اس بارہ میں اب ایک لفظ بھی نہ کہنا نہیں تو مجھے بہت رنج ہوگا"٭

اندو نے ماں کو کچھ اس انداز سے دیکھا جس سے اُس کی خستہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ خوش قسمتی سے مہیندر کمار کھانا کھا کر سیدھے باہر چلے گئے ورنہ اندو کے لئے اپنے خیالات کا روکنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر اس امر کی تحریک ہوتی تھی کہ چل کر صوفیا سے معافی مانگوں۔ صاف صاف کہہ دوں" بہن میرا کچھ بس نہیں ہے۔ میں کہنے کو رانی ہوں مگر در اصل مجھے اُس قدر آزادی بھی نصیب نہیں جس قدر کہ میرے گھر کے مہریوں کو ہے"۔ لیکن یہ سوچ کر رہ جاتی کہ شوہر کی غیبت کرنا میرے مذہبی فرض کے خلاف ہے۔ میں

صوفی کی نگاہوں میں گر جاؤں گی وہ سمجھے گی اس میں ذرا بھی خودداری نہیں ہے۔

نو بجے ونے سنگھ اس سے ملنے آئے۔ وہ دماغی ہیجان کی حالت میں بیٹھی ہوئی اپنے صندوقوں میں سے صوفی کے لئے خریدے ہوئے کپڑے نکال رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ انہیں اس کے پاس کیسے بھیجوں۔ خود جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی ونے سنگھ کو دیکھ کر بولی "کیوں ونے! اگر تمہاری استری اپنی کسی سہیلی کو چند دنوں کے لئے اپنے ساتھ رکھنا چاہے تو تم اُسے منع کر دوگے یا خوش ہوگے"؟

ونے۔ میرے سامنے یہ سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔ اس لئے میں اس خیال سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

اندو۔ یہ سوال تو پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔

ونے۔ بہن! مجھے تمہاری باتوں سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

اندو۔ اس لئے کہ تم اپنے کو دھوکا دے رہے ہو لیکن دراصل تم اُس سے بہت گہرے پانی میں ہو جتنا تم سمجھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا کئی کئی روز تک گھر میں نہ آنا۔ ہر وقت سیوا سمتی کے کاموں میں مشغول رہنا۔ مس صوفیہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا اُس کے سایہ سے بھاگنا۔ اُس ہل چل کو چھپا سکتا ہے جو تمہارے دل میں تیزی کے ساتھ مچی ہوئی ہے؟ لیکن یاد رکھنا کہ اس ہل چل کی آواز ذرا بھی نہ سنائی دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ صوفیہ تمہارا اس قدر احترام کرتی ہے جتنا کوئی ستی اپنے شوہر کا بھی نہ کرتی ہوگی۔ وہ تم پر عقیدت رکھتی ہے۔ تمہارے ضبط ایثار اور خدمت کے جذبات نے اُس کو فریفتہ بنا دیا ہے۔ لیکن اگر میں ٹھیک سمجھتی ہوں تو اُس کی عقیدت

ہیں عشق کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ اگرچہ تمہیں صلاح دینا بے سود ہے۔ کیونکہ تم اس راستہ کی مشکلات سے خوب واقف ہو پھر بھی میں تم سے باصرار کہتی ہوں کہ تم کچھ دن کے لئے کہیں چلے جاؤ۔ تب تک شاید صوفی بھی اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گی۔ ممکن ہے اس وقت کی ہوشیاری سے دو جانداروں کا ستیاناس ہونے سے بچ جائے ۔،

دسلئے۔ بہن! جب تم سب کچھ جانتی ہی ہو تو تم سے کیا چھپاؤں ہاب میں ہوشیار نہیں بن سکتا۔ ان چار پانچ مہینوں میں میں نے جو روحانی تکلیف برداشت کی ہے۔ اُسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ میری عقل بگڑ گئی ہے۔ میں آنکھیں کھلی ہونے پر بھی گڑھے میں گر رہا ہوں۔ جان بوجھ کر زہر کا پیالہ پی رہا ہوں۔ کوئی رکاوٹ۔ کوئی دقت کوئی خوف۔ اب مجھ کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ البتہ میں تمہیں اس کا یقین دلاتا ہوں کہ اس آگ کی ایک چنگاری یا ایک لپٹ بھی صوفی تک نہ پہنچے گی۔ میرا سارا بدن جل جائے۔ ہڈیاں تک خاک ہو جائیں۔ لیکن صوفی کو اُس شعلہ کی چمک تک نہ دکھائی دے گی۔ میں نے بھی یہی تہیتہ کر لیا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اپنی حفاظت کے لئے بلکہ صوفی کی حفاظت کے لئے۔ آہ اس سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ صوفی نے مجھے اُسی آگ میں جل جانے دیا ہوتا۔ میرا پردہ ڈھکا رہ جاتا۔ اگر والدہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ان کی کیا حالت ہو گی۔ اس کے تصور ہی سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بس اب میرے لئے منہ میں سیاہی لگا کر کہیں ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے ۔،

یہ کہہ کر ونے سنگھ ایک دم باہر چلے گئے۔ اندو بیٹھی بیٹھی سوکھتی ہی رہ

گئی۔ وہ اس وقت جوش میں اُس سے بہت زیادہ کہہ گئے تھے جتنا وہ کہنا چاہتے تھے۔ اور دیر تک بیٹھتے تو نہ جانے اور کیا کیا کہہ جاتے۔ اندو کی حالت اس جاندار کی سی تھی۔ جس کے پیر بندھے ہوں اور سامنے اُس کا گھر جل رہا ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ یہ آگ سارے گھر کو جلا دے گی۔ دُنے کے اونچے اونچے منصوبے ماں کی بڑی بڑی خواہشیں باپ کے بڑے بڑے حوصلے سب ملیا میٹ ہو جائیں گے۔ وہ اسی قسم کے رنجیدہ خیالات میں پڑی ہوئی ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح اُٹھی تو دروازہ پر اس کے لئے پالکی تیار کھڑی تھی۔ وہ ماں کے گلے سے لپٹ کر رو ئی۔ باپ کے قدموں کو آنسوؤں سے دھویا اور گھر سے رخصت ہوئی۔ راستہ میں صوفیہ کا کمرہ پڑتا تھا۔ اندو نے اس کمرہ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صوفیہ اُٹھ کر دروازہ پر آئی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ اندو نے عجلت ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھ گئی ۔

(۹)

صوفیا اس وقت اُس حالت میں تھی۔ جب ایک معمولی ہنسی کی بات ایک معمولی آنکھوں کا اشارہ کسی کا اُس کو دیکھ کر مسکرا دینا۔ کسی مہری کا اُس کے حکم کی تعمیل میں ایک لمحہ توقف کرنا۔ ایسی ہزاروں باتیں جو روز ہی گھروں میں ہوتی رہتی ہیں۔ اور جن کی کوئی پرواہ بھی نہیں کرتا اُس کا دل دکھانے کے لئے کافی ہو سکتی تھیں۔ چوٹ کھایا ہوا عضو معمولی سی ٹھیس بھی نہیں سہ سکتا۔ پھر اندو اُس کچھ کہے بغیر ہی چلا جانا کیوں نہ رنجیدہ ہوتا۔ اندو تو چلی گئی مگر وہ بہت دیر تک اپنے کمرہ کے دروازہ پر بت بنی کھڑی سوچتی رہی "یہ تحقیر کیوں؟ میں نے ایسا کون سا قصور کیا

ہے جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے؟ اگر اُس کو یہ منظور نہ تھا کہ مجھے ساتھ لے جاتی تو صاف صاف کہہ دینے میں کیا ہرج تھا؟ میں نے اُس کے ساتھ جانے کے لئے اصرار تو کیا نہ تھا! کیا میں اتنا نہیں جانتی کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ وہ رانی ہے۔ اُس کی اتنی نوازش کیا کم تھی کہ وہ میرے ساتھ ہنس بول لیا کرتی تھی؟ میں اُس کی سہیلی بننے لائق کب تھی؟ کیا مجھے اتنی سمجھ بھی نہ تھی؟ لیکن اس طرح آنکھیں پھیر لینا کون سی شرافت ہے؟ راجہ صاحب نے نہ مانا ہوگا۔ یہ صرف ایک بہانہ ہے۔ راجہ صاحب اتنی سی بات کو کبھی نامنظور نہیں کر سکتے۔ اندو نے خود ہی کچھ سوچا ہوگا۔ وہاں بڑے بڑے آدمی آدیں گے۔ اُن سے اس کا تعارف کیونکر کراؤں گی؟ شاید یہ خیال ہوا ہو کہ کہیں اُس کے سامنے میرا رنگ پھیکا نہ پڑ جائے۔ بس یہی بات ہے۔ اگر میں جاہل اور صورت سیرت سے بے بہرہ ہوتی تو وہ مجھے ضرور ساتھ لے جاتی۔ میری بدرنگی سے اُس کا رنگ اور چمک اُٹھتا۔ میری بدنصیبی!"

یہ ابھی دروازہ پر کھڑی ہی تھی کہ جاہنوی بیٹی کو رخصت کر کے لوٹیں اور صوفی کے کمرہ میں آکر بولیں "بیٹی! میرا قصور معاف کرو۔ میں نے ہی تم کو روک لیا۔ اندو کو بُرا معلوم ہوا پر کروں کیا؟ وہ تو گئی ہی تم بھی چلی جاتیں تو میرا دن کیسے کٹتا؟ ونے بھی راجپوتانہ جانے کو تیار بیٹھے ہیں میری تو موت ہو جاتی۔ تمہارے رہنے سے میرا دل بہلتا ہے کہ سچ کہتی ہوں بیٹی! تم نے میرے اوپر کوئی موہنی منتر پھونک دیا ہے۔"

صوفیہ۔ آپ کی شرافت ہے۔ جو ایسا کہتی ہیں۔ مجھے رنج یہی ہے کہ اندو نے جاتے وقت مجھ سے ہاتھ بھی نہ ملایا۔

جانہوی۔ ایسا اُس نے کیا تو محض ندامت کی وجہ سے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ ایسی سیدھی سادی لڑکی دنیا میں نہ ہوگی۔ مجھے روک کر میں نے اُس کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔ میری بچی کا وہاں ذرا بھی جی نہیں لگتا۔ مہینہ بھر رہ جاتی ہے تو صحت بگڑ جاتی ہے۔ اتنی بڑی ریاست ہے۔ مہیندر سارا بوجھ اُسی کے سر ڈال دیتے ہیں۔ ؟ نہیں تو میونسپلٹی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ بیچاری آمدنی اور خرچ کا حساب لکھتے لکھتے گھبرا جاتی ہے۔ پھر حساب کیسا ؟ ایک ایک پیسہ کا۔ مہیندر کو حساب رکھنے کا خبط ہے۔ ذرا سا بھی فرق پڑا تو اُس کے سر ہو جاتے ہیں اندو کو اختیار ہے۔ جتنا چاہے خرچ کرے مگر حساب ضرور رکھے۔ راجہ صاحب کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ کوئی نوکر ایک پیسہ بھی کھا جائے تو اُس کو برطرف کر دیتے ہیں۔ خواہ اُس نے ساری عمر اُن کی خدمت کی ہو۔ یہاں میں اندو کو کبھی کڑی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتی چاہے وہ گھی کا گھڑا کیوں نہ لڑھکا دے۔ وہاں ذرا ذرا سی بات پر راجہ صاحب کی جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ بچی سے بات نہیں برداشت ہو سکتی۔ جواب تو دیتی نہیں (اور یہی ہندو عورت کا دھرم ہے) پر رونے لگتی ہے۔ وہ دیا کی مورت ہے کوئی اُس کا سب کچھ کھا جائے لیکن وہ جوں ہی اُس کے سامنے آکر رو دیا کہ اُس کا دل پگھل گیا۔ صوفی ! مجھے بھگوان نے دو بچے دیئے اور دونوں ہی کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اندو جتنی نرم دل اور سادہ مزاج ہے۔ ونے اتنا ہی مستقل مزاج اور ہمتی ہے۔ تھکنا تو جانتا ہی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنے کے لئے ہی اُس کا جنم ہوا ہے۔ گھر میں کسی ٹہلنی کو بھی کوئی شکایت ہوئی اور وہ سب کام چھوڑ کر اُس کی

دوا دارو کرنے لگا۔ ایک بار مجھ کو بخار آنے لگا تھا۔ اس لڑکے نے تین ماہ تک دروازہ کا مُنہ نہیں دیکھا۔ ہر وقت میرے ہی پاس بیٹھا رہتا۔ کبھی پنکھا جھلتا۔ کبھی پاؤں سہلاتا۔ کبھی رامائن اور مہابھارت پڑھ کر سُناتا۔ کتنا ہی کہتی۔ بیٹا جاؤ گھومو۔ پھرو۔ آخر یہ لونڈیاں باندیاں کس دن کام آئیں گی۔ ڈاکٹر روز آتے ہی ہیں تم کیوں میرے ساتھ ستی ہوتے ہو۔ لیکن وہ کسی طرح بھی نہ جاتا۔ اب کچھ دنوں سے سیوا سمتی کا انتظام کر رہا ہے۔ کنور صاحب کو جو سیوا سمتی سے اتنی دلچسپی ہے وہ وِنے ہی کی صحبت کی برکت ہے۔ ورنہ آج سے تین سال پیشتر اُن کا سا عیش پسند سارے شہر میں نہ تھا۔ دن میں دو بار حجامت بنتی تھی۔ درجنوں دھوبی اور درزی کپڑے دھونے اور سینے کے لئے نوکر تھے۔ پیرس سے ایک ہوشیار دھوبی کپڑے سنوارنے کے لئے آیا تھا۔ کشمیر اور اٹلی کے باورچی کھانا پکاتے تھے۔ تصویروں کا اتنا شوق تھا کہ کئی بار عمدہ تصاویر خریدنے کے لئے اٹلی تک کا سفر کیا۔ تم اُن دنوں مسوری میں رہی گی سیر کرنے نکلتے تو مسلح سواروں کی ایک جماعت ساتھ چلتی۔ شکار کھیلنے کی مت تھی۔ مہینوں شکار ہی کھیلتے رہتے۔ کبھی کشمیر کبھی بیکانیر کبھی نیپال صرف شکار کھیلنے کی غرض سے جاتے۔ ونے نے اُن کی کایا پلٹ کردی۔ جنم کا بیراگی ہے۔ پہلے جنم میں ضرور کوئی رشی رہا ہوگا ؛

صوفی۔ آپ کے دل میں خدمت اور اعتقاد کے ایسے بلند جذبات کس طرح پیدا ہوئے؟ یہاں تو عمدہ نگارانیاں عیش پرستی ہی میں محو رہتی ہیں ؛

جاہنوی۔ بیٹی! یہ ڈاکٹر گنگولی کی نصیحتوں کے سبب ہوا۔ جب اندر

دو سال کی تھی۔ تب میں بیمار پڑی۔ ڈاکٹر گنگولی میرے معالجہ کی غرض سے آنے ضعف قلب کی شکایت تھی۔ طبیعت گھبرایا کرتی۔ گویا کسی نے جادو کر دیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مہابھارت پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ اس میں میرا جی اس قدر لگا کہ کبھی کبھی آدھی رات تک بیٹھی پڑھا کرتی تھک جاتی تو ڈاکٹر صاحب سے پڑھوا کر سنتی۔ پھر تو بہادروں کی داستانوں کے پڑھنے کا مجھے ایسا چسکا لگا کہ راجپوتوں کی ایسی کوئی داستان نہیں جو میں نے نہ پڑھی ہو۔ اسی وقت سے میرے دل میں قومی محبت کا جذبہ پیدا ہوا ایک نئی خواہش پیدا ہوئی۔ کاش میرے بطن سے بھی کوئی ایسا لڑکا جنم لیتا جو ابھمن۔ درگاداس اور پرتاپ کی طرح قوم کا سر اونچا کرتا۔ میں نے عہد کیا کہ لڑکا ہوا تو اُس کو ملک و قوم کی فلاح کے لئے وقف کر دوں گی۔ میں ان دنوں تپسیا کرتی ہوئی زمین پر سوتی۔ صرف ایک بار روکھا کھانا کھاتی۔ اپنے برتن تک اپنے ہاتھ سے دھوتی تھی۔ ایک وہ دیویاں تھیں جو قوم کی لاج رکھنے کے لئے جان تک دے دیتی تھیں ایک میں بدنصیب ہوں کہ دنیا و عاقبت کے سارے تفکرات سے کنارہ کرتے ہوئے صرف عیش و عشرت میں مبتلا ہوں۔ مجھے اس قومی زوال کو دیکھ کر اپنی عیش پسندی پر شرم آتی تھی۔ خیر ایشور نے میری سُن لی تیسرے سال ونئے کا جنم ہوا۔ میں نے بچپن سے ہی اُس کو سختیاں اُٹھانے کا عادی بنانا شروع کیا۔ نہ کبھی گدوں پر سلاتی۔ نہ کبھی ٹہلوں اور دائیوں کی گود میں جانے دیتی۔ نہ کبھی میوے کھانے کو دیتی۔ دس برس کی عمر تک صرف مذہبی داستانوں کے ذریعہ اُس کو تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد میں نے اُس کو ڈاکٹر گنگولی کے سپرد کر دیا۔ مجھے اُن پر پورا اعتماد تھا اور مجھ کو فخر ہے کہ ونئے کی

تعلیم و تربیت کا بار جس شخص پر رکھا وہ اس کام کے لئے ہر طرح اہل تھا۔ وہ روئے زمین کے بیشتر ملکوں کا سفر کر چکا ہے سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ یورپ کی خاص خاص زبانوں سے بھی وہ بخوبی واقف ہے گانے میں اُس کو اس قدر مشق ہے کہ اچھے اچھے اُستاد اُس کے سامنے مُنہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہمیشہ کمبل بچھا کر زمین پر سوتا ہے۔ اور کمبل ہی اوڑھتا ہے۔ پیدل چلنے میں کئی بار انعام پا چکا ہے۔ ناشتہ کے لئے مٹھی بھر چنے۔ کھانے کے لئے روٹی اور ساگ بس ان کے سوا دُنیا کے اور سارے کھانے اُس کے لئے ممنوع ہیں۔ بیٹی! میں تجھ سے کہاں تک کہوں پورا تیاگی ہے۔ اُس کے تیاگ کا سب سے عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے باپ کو بھی تیاگی بننا پڑا۔ جوان بیٹے کے سامنے بوڑھا باپ نفس پرستی کا غلام بنا رہ سکتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ عیش و عشرت سے اُن کا دل آسودہ ہو گیا اور یہ بہت اچھا ہوا۔ تیاگی لڑکے کا بھوگی باپ یہ واقعی مضحکہ خیز بات ہوتی۔ وہ کھلے دل سے ونے کے نیک کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اُن کی اس رغبت و مصروفیت کے بغیر ونے کو کبھی اس قدر کامیابی نہ حاصل ہوتی۔ سیوا سمتی میں اس وقت ایک سو نوجوان ہیں۔ جن میں کتنے ہی امیر گھرانوں کے ہیں۔ کنور صاحب کی تمنا ہے کہ سمتی کے ممبران کی پوری تعداد پانچ سو تک بڑھا دی جاوے۔ ڈاکٹر گنگولی اس پیرانہ سالی کے باوجود بھی بڑے حوصلہ اور خوشی کے ساتھ سمتی کا کام کرتے ہیں۔ وہی اُس کے منتظم ہیں۔ جب کونسل کے کاموں سے فراغت ملتی ہے تو ہر روز دو ڈھائی گھنٹے نوجوانوں کے سامنے جسمانی علم پر لیکچر دیتے ہیں۔ بچے یہاں کی تعلیم پورے تین سالوں میں ختم ہوتی ہے۔ تب خدمتی کام شروع کیا جاتا

اب کے بیس نوجوان پاس ہوں گے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ وہ دو سال تک ہندوستان کا سفر کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اُن کے ساتھ لوٹا ڈور۔ دھوتی اور کمبل کے سوا اور کسی قسم کا رختِ سفر نہ ہو۔ یہاں تک کہ خرچ کے لئے روپے بھی نہ رکھے جائیں۔ اس سے کئی فایدے ہوں گے۔ نوجوانوں کو مشکلات کا سامنا کرنے کی عادت پڑے گی۔ اُنہیں مُلک کی واقعی حالت کا علم ہوگا۔ نظری زاویہ وسیع ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ چال چلن درست و مضبوط ہوگا۔ استقلال۔ جرأت۔ تدبیر ارادہ وغیرہ اوصاف کی افزونی ہوگی۔ ونے ان لڑکوں کے ساتھ جا رہا ہے اور میں غرور سے پھولی نہیں سماتی کہ میرا لڑکا قومی فلاح و بہبود کے لئے یہ کام کر رہا ہے۔ اور تم سے سچ کہتی ہوں اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے کہ قوم کی بھلائی کے لئے اس کو جان بھی دینا پڑی تو مجھے ذرا بھی رنج نہ ہوگا۔ رنج تب ہوگا جب میں اُس کو دولت و ثروت کے سامنے سر جھکاتے یا صدقِ فرض سے پیچھے قدم رکھتے دیکھوں گی۔ ایشور نہ کرے میں وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رہوں جب نہیں کہہ سکتی کہ اُس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوگی؟ شاید میں ونے کے خون کی پیاسی ہو جاؤں۔ شاید میرے ان کمزور ہاتھوں میں اتنی سکت آ جائے کہ میں اُس کا گلا گھونٹ دوں!

یہ کہتے کہتے رانی کے چہرہ پر ایک عجیب رونق نظر آنے لگی۔ اشک آلود آنکھوں میں خودداری کی سرخی جھلکنے لگی۔ صوفیہ حیرت سے رانی کا مُنہ تاکنے لگی۔ اس نازک جسم میں اس قدر محبت آگیں اور بلند حوصلہ دل چھپا ہوا ہے اس کا اُسے خیال بھی نہ تھا۔

ذرا دیر بعد ہی رانی نے پھر کہا "بیٹی! میں جوش میں تم سے اپنے دل

کی کتنی ہی باتیں کہہ گئی پر کیا کروں تمہارے چہرہ پر ایسی دلکش سادگی ہے جو میرے دل کو اپنی طرف بے اختیار کھینچتی ہے۔ اتنے دنوں میں میں نے تم کو خوب پہچان لیا۔ تم اندو نہیں تم عورت کی شکل میں دنے ہو۔ کنور صاحب تم پر فریفتہ ہوگئے ہیں۔ گھر آتے ہیں تو تمہاری چرچا ضرور کرتے ہیں۔ اگر مذہبی رکاوٹ نہ ہوتی تو دمسکراکر) انھوں نے مسٹر سیوک کے پاس تمہارے کی شادی کا پیغام کبھی کا بھیج دیا ہوتا۔

صوفیہ کا چہرہ شرم سے سُرخ ہوگیا۔ بڑی بڑی پلکیں نیچے کو جھک گئیں اور لبوں پر ایک نہایت خفیف سکون بخش اور دلکش تبسم کی جھلک دکھائی دی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپالیا اور بولی۔ "آپ مجھے گالیاں دے رہی ہیں۔ میں بھاگ جاؤں گی"۔

رانی۔ اچھا شرماؤ مت۔ میں یہ ذکر ہی نہ کروں گی۔ میرا تم سے یہی کہنا ہے کہ اب تمہیں یہاں کسی بات میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔ اندو تمہاری سہیلی تھی۔ تمہارے مزاج سے واقف تھی۔ تمہاری ضروریات کو سمجھتی تھی۔ مجھ میں اتنی تمیز نہیں ہے۔ تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ جس چیز کی ضرورت ہو۔ بلا تامل کہہ دو۔ اپنی مرضی کے موافق کھانا بنوالو۔ جب سیر کرنے کو جی چاہے۔ گاڑی تیار کرالو۔ کسی نوکر کو کہیں بھیجنا چاہو۔ بھیج دو۔ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے کچھ کہنا ہو تو فوراً چلی آؤ۔ پیشتر سے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ کمرہ اگر پسند نہ ہو تو میرے بغل والے کمرہ میں چلو۔ جس میں اندو رہتی تھی۔ وہاں جب میرا جی چاہے گا تم سے باتیں کر لیا کروں گی۔ جب فرصت ملے مجھے ادھر اُدھر کی خبریں سُنا دینا۔ بس یہ سمجھو کہ تم میری پرائیویٹ سکرٹری ہو۔

یہ کہہ کر جاہنوی چلی گئی۔ صوفی کا دل ہلکا ہو گیا۔ اُس کو بڑی فکر تھی کہ اندو کے چلے جانے پر یہاں میں کیسے رہوں گی۔ کون میری بات پوچھے گا۔ ناخواندہ مہمان کی طرح پڑی رہوں گی۔ یہ اندیشہ جاتا رہا۔

اُس دن سے اُس کی اور بھی خاطر و مدارات ہونے لگی۔ لونڈیاں اُس کا مُنہ دیکھتی رہتیں۔ بار بار آکر پوچھ جاتیں "مس صاحب! کوئی کام تو نہیں ہے؟" کوچوان دونوں وقت دریافت کرتا "حکم ہو تو گاڑی تیار کروں"۔ رانی جی بھی دن میں ایک بار ضرور آکر بیٹھ جاتیں۔ صوفی کو اب معلوم ہوا کہ اُن کا دل اِستری جاتی کے ساتھ بھلائی کرنے والے جذبات سے کس قدر معمور تھا۔ اُنھیں ہندوستان کی دیویوں کو اینٹ اور پتھر کے سامنے سَر جُھکاتے دیکھ کر دلی رنج ہوتا تھا۔ وہ اُن کی مادہ پرستی، وہم پرستی اور خود پرستی کو مُلکی زوال کا خاص سبب سمجھتی تھیں۔ اِن امور پر صوفی سے گھنٹوں گفتگو کیا کرتیں۔

اس مہربانی و محبت نے آہستہ آہستہ صوفی کے دل سے مغائرت کے خیالات کو مٹانا شروع کیا۔ اُس کے خیالات و اطوار میں تغیر ہونے لگا۔ لونڈیوں سے کچھ کہتے ہوئے اب ہچک نہ ہوتی۔ مکان کے کسی حصہ میں جاتے ہوئے اب تامل نہ ہوتا۔ لیکن تکلفات میں جوں جوں کمی ہوتی تھی، عیش پسندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس کی فراغت کے اوقات میں ترقی ہونے لگی۔ تفریح سے رغبت پیدا ہوئی۔ کبھی مصورانِ قدیم کی تصاویر دیکھتی۔ کبھی باغ کی سیر کرنے چلی جاتی۔ کبھی پیانو پر جا بیٹھتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی رانی کے ساتھ شطرنج بھی کھیلنے لگی۔ زیورات اور کپڑوں کی طرف سے اب وہ بے پروائی نہ رہی۔ گاؤن کے بدلے ریشمی ساڑیاں پہننے لگی۔

رانی جی کے اصرار سے کبھی کبھی پان بھی کھا لیتی۔ کنگھی چوٹی سے اُنس ہوا۔ فکر بے تعلقی پیدا کرتی ہے۔ بے فکری کا کھیل تماشہ سے میل ہے۔

ایک روز تیسرے پہر وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ گرمی اتنی سخت تھی کہ برقی پنکھوں اور خس کی ٹٹیوں کے ہوتے ہوئے بھی بدن سے پسینہ نکل رہا تھا۔ باہر لو سے جسم جھلسا جاتا تھا۔ دفعتاً پربھو سیلوک آکر بولے "صوفی! ذرا چل کر ایک جھگڑے کا تصفیہ کر دو۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ ونے سنگھ کو اس کے متعلق کئی شک ہیں۔ میں کچھ کہتا ہوں وہ کچھ کہتے ہیں۔ فیصلہ تمہارے اوپر چھوڑا گیا ہے۔ ذرا چلو۔"

صوفی۔ میں شاعرانہ نزاع کا کیا فیصلہ کروں گی۔ عروض سے ذرا بھی واقفیت نہیں اور نہ استعارات کا کوئی علم ہے مجھے بے فائدہ لے جاتے ہو۔

پربھوسیلوک۔ اس نزع کا فیصلہ کرنے کے لئے عروض جاننے کی ضرورت نہیں۔ میرے اور اُن کے معیار میں اختلاف ہے چلو تو۔

صوفی صحن میں آئی تو بدن میں لپٹ سی لگی۔ تیزی کے قدم اٹھاتے ہوئے ونے کے کمرہ میں گئی جو محل کے دوسرے حصّہ میں تھا۔ آج تک وہ یہاں کبھی نہ آئی تھی۔ کمرہ میں کوئی سامان نہ تھا۔ صرف ایک کمبل بچھا ہوا تھا اور زمین ہی پر دس پانچ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ نہ پنکھا نہ خس کی ٹٹی۔ نہ پردے۔ نہ تصویریں۔ پچھوا ہوا سیدھی کمرہ میں آتی تھی۔ کمرہ کی دیواریں جلتے توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہیں ونے سر جھکائے کمبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑے

ہوئے اور کرسی لانے دوڑے ۔

صوفی۔ کہاں جارہے ہیں؟

پربھوسیوک۔ (مسکراکر) تمہارے لئے کرسی لانے ۔

صوفی۔ وہ کرسی لائیں گے اور میں بیٹھوں گی۔ کتنی بھدی بات ہے؟

پربھوسیوک۔ میں روکتا بھی تو وہ نہ ملنتے ۔

صوفی۔ اس کمرہ میں اِن سے کیسے رہا جاتا ہے؟

پربھوسیوک۔ پورے جوگی ہیں میں تو دلی محبّت کے سبب آجایا کرتا ہوں ۔

اتنے میں ونے نے ایک گدّے دار کرسی لاکر صوفی کے لئے رکھ دی۔ صوفی شرم اور تامل سے گڑی جاتی تھی۔ ونے کی ایسی حالت تھی گویا پانی میں بھیگ رہے ہیں۔ صوفی دل میں کہتی تھی "کیسی اعلےٰ زندگی ہے"۔ ونے دل میں کہتے تھے "کیسا بے مثال حسن ہے"۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ آخر ونے کو ایک بات سوجھی۔ پربھوسیوک کی طرف دیکھ کر بولے "ہم اور تم فریق مقدمہ ہیں پس کھڑے رہ سکتے ہیں لیکن حاکم کو اُنچے مقام پر بیٹھنا ہی مناسب ہے"۔

صوفی نے پربھوسیوک کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "کھیل میں لڑکا اپنے کو بھول نہیں جاتا"۔

بالآخر ہر سہ اشخاص کمبل ہی پر بیٹھے۔ پربھوسیوک نے اپنی نظم پڑھ کر سنائی۔ نظم حلاوت میں ڈوبی ہوئی پاکیزہ اور بلند جذبات سے مملو تھی۔ شاعر نے نظم میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ عنوان تھا "ایک ماں کا اپنی بیٹی کو دعا دینا"۔ بیٹی سسرال جارہی ہے۔ ماں اُس

کو گلے لگا کر دعا دیتی ہے۔ "بیٹی تو شوہر پرست ہو۔ تیری گود پھلے۔ اُس
پھول جیسے نازک بچے کھیلیں۔ اُن کے شیریں قہقہوں سے تیرا گھر اور
صحن گونجے۔ تجھ پر پربھو کا کرم ہو۔ تو پتھر بھی چھوئے تو سونا ہو جائے۔ تیرا
شوہر تجھ پر اُسی طرح جنت کا سایہ رکھے جس طرح چھپر دیوار کو اپنے سائے
میں رکھتا ہے"۔

شاعر نے انہیں خیالات میں شادی شدہ زندگی کی ایسی دلکش
تصویر کھینچی تھی کہ اُس میں پھولوں کی روشنی اور محبت کی کثرت تھی۔
کہیں بھی وہ تاریک گھاٹیاں نہ تھیں جن میں ہم گر پڑتے ہیں۔ کہیں
بھی وہ کانٹے نہ تھے جو ہمارے پیروں میں چبھتے ہیں۔ کہیں بھی وہ نقص
نہ تھا جو ہم کو راستہ سے ہٹا دیتا ہے۔ نظم ختم کرکے پربھوسیوک نے
ونے سنگھ سے کہا "اب آپ کو اس کے بارہ میں جو کچھ کہنا ہو کہئے"۔
ونے سنگھ نے تامل کے ساتھ جواب دیا "مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ
چکا"۔

پربھوسیوک۔ پھر سے کہئے۔

ونے سنگھ۔ بار بار وہی باتیں کیا کہوں۔

پربھوسیوک۔ میں آپ کے کہنے کا خلاصہ بیان کر دوں۔

ونے سنگھ۔ میرے دل میں ایک بات آئی کہہ دی۔ آپ بیفائدہ
اُسے اتنا طول دے رہے ہیں۔

پربھوسیوک۔ آخر آپ ان جذبات کو صوفی کے سامنے ظاہر کرتے
ہوئے کیوں شرماتے ہیں؟

ونے سنگھ۔ شرماتا نہیں ہوں لیکن میرا آپ کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں

ہے۔ آپ کو انسانی زندگی کا یہ معیار بہترین معلوم ہوتا ہے مجھے وہ اپنی موجودہ حالت کے خلاف جچتا ہے۔ اِس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔

پربھو سیلوک (ہنس کر) ہاں یہی تو میں آپ سے کہلانا چاہتا ہوں کہ آپ اُس کو موجودہ حالت کے خلاف کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں شادی شدہ زندگی بالکل حقیر ہے اور کیا دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہئے؟

ونے سنگھ۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہئے میرا مطلب صرف یہ تھا کہ ایسی زندگی خود غرضی کے بڑھانے والی ہے۔ اس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں اور اِس انحطاط کی حالت میں جب کہ خود غرضی ہماری رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جب کہ ہم اپنی غرض کے بغیر کوئی بات یا کوئی کام نہیں کرتے یہاں تک کہ ماں بیٹے کے تعلق میں۔ اُستاد شاگرد کے تعلق میں۔ زن شوہر کے تعلق میں خود غرضی کا خاص جزو ہے تو ایسا ہوتے ہوئے کسی بلند پایہ شاعر کے لئے اُس زندگی کی سراہنا کرنا۔ اُس کی تعریفوں کے پل باندھنا زیبا نہیں دیتا۔ ہم اس زندگی سے پیدا ہونے والے سکھوں کے غلام ہو رہے ہیں۔ ہم نے اسی کو اپنی زندگی کا معیار سمجھ رکھا ہے! اِس وقت ہم کو ایسے وفا شعار۔ ایثار نفس اور بےغرض کام کرنے والوں کی ضرورت ہے جو قومی اصلاح کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیں۔ ہمارے شعرا کو ایسے ہی پاک اور بلند جذبات کو محرک کرنا چاہئے۔ ہمارے ملک کی آبادی ضروریات سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ہماری بھارت ماتا افزونی نسل کے بار

کو اب نہیں سنبھال سکتی۔ اسکولوں میں۔ سڑکوں پر گلیوں میں۔ اب اتنے لڑکے نظر آتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا کریں گے۔ ہمارے ملک میں اتنی پیداوار بھی نہیں ہوتی کہ سب کو ایک بار بھی حسب مرضی خوراک مل سکے۔ خوراک کا نہ ملنا ہی ہمارے اخلاقی اور اقتصادی انحطاط کا خاص سبب ہے۔ آپ کی نظم بالکل بے موقع ہے میرے خیال میں اس سے سوسائٹی کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہمارے شعرا کا فرض ہے ایثار کی اہمیت دکھلانا۔ تجرد کی لگن پیدا کرنا۔ دل پر قابو رکھنے کی تلقین کرنا۔ شادی شدہ زندگی تو غلامی کی جڑ ہے اور یہ وقت اُس کی ثناخوانی کے لئے موزون نہیں ہے ٭

پربھو سیلوک۔ آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟

ونے سنگھ۔ ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اتنا ہی کافی ہے ٭

پربھو سیلوک۔ میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ایثار اور قربانی کے معیار کی میں بُرائی نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے لئے سب سے اونچا درجہ ہے اور وہ شخص بلاشبہ قابل تحسین ہے جو اُس کو حاصل کرلے۔ لیکن جس طرح کچھ برت کرنے والوں کے بلا کھائے پئے رہنے سے۔ کھانے اور پانی کی فائدہ رسانی میں کوئی نقص نہیں آتا اسی طرح دو چار جوگیوں کے تارک الدنیا ہو جانے سے شادی شدہ زندگی قابل ترک نہیں ہو جاتی۔ یہ زندگی انسان کی جماعتی زندگی کی جڑ ہے۔ اُس کو ترک کر دیجئے بس ہمارے جماعتی اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور ہماری حالت جانوروں کی سی ہو جائے گی۔ رشیوں نے گرہستی کو بہترین دھرم کہا ہے اور اگر ٹھنڈے دل سے غور

کیجئے تو ظاہر ہو جائے گا کہ رشیوں کا یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ رحم ہمدردی۔ تحمل۔ فیاضی ایثار وغیرہ اعلیٰ اوصاف کی ترقیوں کے جیسے موقع گرہست آشرم میں ملتے ہیں وہ اور کسی آشرم میں نہیں مل سکتے مجھے تو یہاں تک کہنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ انسان کے لئے یہی ایک ایسا دھرم ہے جو فطرتی کہا جا سکتا ہے۔ جن کارناموں نے انسانی قومیت کے چہرہ کو جلد بخشی ہے۔ اُن کا سہرا جوگیوں کے نہیں۔ بلکہ گرہستی زندگی کا سکھ بھوگنے والوں کے سر ہے۔ ہری چندر جوگی نہیں تھے۔ رام چندر جوگی نہیں تھے۔ کرشن تارک الدنیا نہیں تھے۔ نپولین تارک الدنیا نہیں تھا۔ نلسن جوگی نہیں تھا۔ مذہب اور علم کے میدان میں جوگیوں نے ضرور شہرت حاصل کی ہے لیکن میدانِ عمل میں شہرت کا سہرا بھوگیوں کے سر بندھا ہے۔ تاریخ میں ایسا ایک بھی ثبوت نہیں ملتا۔ کہ کسی قوم کی نجات تیاگیوں کے ذریعہ ہوئی ہو۔ آج بھی ہندوستان میں دس لاکھ سے زیادہ تیاگی بستے ہیں پر کون کہہ سکتا ہے کہ اُن سے سوسائٹی کو کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے پوشیدہ طریقہ پر ایسا ہوتا ہو لیکن ظاہرا تو نہیں دکھائی دیتا۔ پھر یہ امید کیونکر کی جا سکتی ہے کہ گرہستی سے بچنے میں قوم کا کوئی خاص فائدہ ہوگا۔ ہاں اگر کم فہمی کو آپ فایدہ سمجھتے ہو تو ضرور فائدہ ہوگا۔"

یہ گفتگو ختم کرکے پربھوسیوک نے صوفیا سے کہا "تم نے فریقین کی باتیں سُن لیں۔ تم اس عدل گستری کی جگہ پر ہو۔ سچ جھوٹ کا فیصلہ کرو"۔

صوفی۔ اس کا فیصلہ تو تم آپ ہی کر سکتے ہو۔ تمہاری سمجھ میں گانا تو

بہت اچھی چیز لگتی ہے؟

پربھوسیلوک۔ ضرور۔

صوفی۔ لیکن اگر کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہو تو وہاں رہنے والوں کو گانے بجانے دیکھ کر تم کیا کہوگے؟

پربھوسیلوک۔ بیوقوف کہوں گا اور کیا۔

صوفی۔ کیوں؟ گانا تو کوئی بُری چیز نہیں؟

پربھوسیلوک۔ تو یہ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم نے اُنہیں ڈگری دے دی۔ میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تم انہیں کی طرف جھکوگی۔

صوفی۔ اگر یہ اندیشہ تھا تو تم نے مجھے پنچ کیوں بنایا تھا۔ تمہاری نظم نہایت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ میں اس کو سراپا دلکش کہنے کو تیار ہوں۔ لیکن تمہارا یہ فرض ہے کہ اپنی اس روحانی طاقت سے برادرانِ وطن کو فائدہ پہنچاؤ۔ زوال کے حسن وعشق کا راگ الاپنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے تم بھی قبول کروگے۔ معمولی شعراء کے لئے کوئی قید نہیں ہے۔ اُن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن تم کو ایشور نے جتنی ہی خاص قدرت عطا کی ہے۔ تمہارے اُن پر ذمہ داری بھی اتنی ہی زیادہ ہے۔

جب صوفیہ چلی گئی تو ونے نے پربھوسیلوک سے کہا۔ ''میں اس فیصلہ کو پہلے ہی معلوم کرچکا تھا۔ تم نادم تو نہ ہوئے ہوگے؟''

پربھوسیلوک۔ اُس نے تمہاری مروت کی ہے۔

ونے۔ بھائی! تم بڑے بے انصاف ہو۔ اس قدر مدلل فیصلہ پر بھی اُن کے سر الزام عاید ہی کردیا۔ میں تو اُن کی پختہ خیالی کا پیشتر ہی سے قائل تھا۔ آج سے معتقد ہو گیا۔ اس فیصلہ نے میری قسمت کا فیصلہ کر

دیا۔ پربھو! مجھے خواب میں بھی یہ امید نہ تھی کہ میں اتنی آسانی سے خواہشات کا غلام بن جاؤں گا۔ میں راستہ سے ہٹ گیا۔ میرا ضبط کسی بنے ہوئے دوست کی طرح امتحان کے اوّل ہی موقع پر میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میں آسمان کے تارے توڑنے جا رہا ہوں وہ پھل کھانے جا رہا ہوں۔ جو میرے لئے ممنوع ہے۔ خوب جانتا ہوں پربھو! کہ میں اپنی زندگی کو مایوسی کی بیدی پر قربان کر رہا ہوں۔ اپنی والدہ محترمہ کے دل پر کلھاڑے چلا رہا ہوں۔ اپنی عزت و آبرو کی کشتی کو ذلت و رسوائی کے سمندر میں ڈبو رہا ہوں۔ اپنی عظمت کی خواہشات کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ لیکن میرا دل اس کے لئے مجھے ملامت نہیں کرتا۔ صوفیہ کسی طرح میری نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں اُس کا ہو چکا اور تمام عمر اُسی کا رہوں گا۔

پربھو۔ وِنے! اگر صوفی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ یہاں ایک منٹ بھی نہ رہے گی۔ کہیں وہ خود کشی نہ کر لے۔ خدا کے لئے ایسا کام نہ کرو۔

وِنے سنگھ۔ نہیں پربھو۔ میں بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر کبھی نہ آؤں گا۔ میرا دل جل کر خاک سیاہ ہو جائے مگر صوفی کو آنچ بھی نہ لگنے پائے گی۔ میں کسی دور مقام میں بیٹھا ہوا اس علم دانائی اور پاکیزگی کی دیوی کی پرستش کیا کروں گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے عشق میں نفسانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ میری زندگی کو با معنی بنانے کے لئے یہ محبت ہی کافی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنی ملکی خدمت کے کام کو ترک کر رہا ہوں۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ میں اب بھی اُسی راستہ پر چلتا رہوں گا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ غیر مجسّم کی جگہ مجسم کی۔ نہ دکھائی

دینے والے کی جگہ دکھائی دینے والے کی پُوجا اور بھگتی کروں گا"

اسی وقت جانھوی نے دفعتًا آ کر کہا "ونے! ذرا اندو کے پاس چلے جاؤ۔ کئی روز سے اُس کا کچھ حال نہیں ملا۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں بیمار تو نہیں ہو گئی۔ خط بھیجنے میں اتنی دیر تو کبھی نہ کرتی تھی"

ونے تیار ہو گئے۔ کرتہ پہنا۔ ہاتھ میں سونٹا لیا اور چل دیئے۔
پربھو سیوک صوفی کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے "ونے سنگھ کی باتیں اس سے کہوں یا نہ کہوں" صوفی نے اُنہیں متفکر دیکھ کر پوچھا۔ "کنور صاحب کچھ کہتے تھے"؟

پربھو سیوک بولے۔ اس بارہ میں تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر تمہارے بارہ میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جن کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا"

صوفی نے لحہ بھر زمین تاکنے کے بعد کہا "میں سمجھتی ہوں پہلے ہی سمجھ جانا چاہیئے تھا۔ مگر میں اس سے پریشان نہیں ہوں۔ یہ جذبہ میرے دل میں اُسی وقت پیدا ہوا جب یہاں آنے کے چوتھے روز میں نے آنکھیں کھولیں اور نیم ہوشی کی حالت میں ایک فرشتہ صورت انسان کو سامنے کھڑا ہوا اور اپنی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا پایا۔ وہ صورت اور وہ نگاہ آج تک میرے دل میں منقوش ہے۔ اور ہمیشہ منقوش رہے گی"

پربھو سیوک۔ صوفی! تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟

صوفی۔ نہیں۔ شرم نہیں آتی۔ شرم کی بات ہی نہیں ہے۔ وہ مجھے اپنے عشق کے قابل سمجھتے ہیں۔ یہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔ ایسے درویش سیرت۔ ایسے ایثار مجسّم ایسے حوصلہ مند شخص کی معشوقہ بننے میں

کوئی شرم نہیں ہے۔ اگر عشق کا تحفہ پا کر کسی نوجوان دوشیزہ کو فخر ہو سکتا ہے تو وہ دوشیزہ میں ہوں۔ یہی برکت تھی جس کے حصول کے لئے میں اتنے دنوں تک صبر و استقلال کی تپسیا کر رہی تھی۔ آج اُسی برکت کا مجھ پر نزول ہوا ہے تو یہ میرے لئے شرم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے ٭

پربھوسیوک ۔ مذہبی تضاد ہوتے ہوئے بھی ؟

صوفیہ ۔ اِس کا خیال وہ لوگ کرتے ہیں جن کا عشق خواہشات نفسانی پر مشتمل ہے۔ عشق اور خواہش میں اُتنا ہی فرق ہے۔ جتنا کہ سونا اور کانچ (شیشہ) میں۔ عشق اعتقاد کے مشابہ ہے۔ دونوں میں صرف کمی بیشی کا فرق ہے۔ اعتقاد میں عزت اور عشق میں خدمت والے جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ عشق کے۔ لئے مذہبی تضاد کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا۔ ایسی رکاوٹ اُس ارادہ کے لئے ہے جس کا نتیجہ شادی ہے نہ کہ اُس عشق کے لئے جس کا نتیجہ قربانی ہے ٭

پربھوسیوک ۔ میں نے تمہیں جتا دیا۔ یہاں سے چلنے کے لئے تیار رہو ٭

صوفیہ ۔ مگر گھر پر کسی سے اُس کی چرچا کرنے کی ضرورت نہیں ٭

پربھوسیوک ۔ اس سے بے فکر رہو ٭

صوفیہ ۔ کچھ طے ہوا۔ یہاں سے اُن کے جانے کا کب قصد ہے ؟

پربھوسیوک ۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ رانی جی کو یہ بات معلوم ہوئی تو دونے کی خبر نہیں۔ مجھے تعجب نہ ہوگا اگر ماما سے اسی کی شکایت کریں ٭

صوفیہ نے غرور سے سر اُٹھا کر کہا " پربھو! کیسی بچوں کی سی باتیں

کرتے ہو عشق بیخوفی کا مترادف ہے عشق کی پرستش کرنے والا دُنیا کے سبھی تفکرات اور بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے"۔

پربھو سیلوک چلے گئے تو صوفیہ نے کتاب بند کر دی اور باغ میں جا کر ہری گھاس پر لیٹ گئی۔ اُس کو آج کھلے ہوئے پھولوں میں آہستہ آہستہ چلنے والی ہوائیں۔ درختوں پر چہکنے والی چڑیوں کی آوازیں۔ آسمان کی سُرخی میں ایک عجیب رونق۔ ایک ناقابلِ بیان خوبصورتی ایک روحانی جلوہ کا سماں نظر آتا تھا۔ وہ عشق کا انمول موتی پا گئی تھی۔

ایک ہفتہ ہو گیا مگر ونے سنگھ نے راجپوتانہ کا سفر نہ کیا۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے دن ٹالتے جاتے تھے۔ کوئی تیاری نہ کرنی تھی۔ پھر بھی تیاریاں پوری نہ ہوتی تھیں۔ اب ونے اور صوفیہ دونوں ہی کو معلوم ہونے لگا کہ عشق کو جب کہ وہ عورت اور مرد دونوں ہی میں ہو۔ خواہشات نفسانی سے مبرا رکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا اُنہوں نے سمجھا تھا۔ صوفی ایک کتاب بغل میں دبا کر علی الصباح باغ میں جا بیٹھتی۔ شام کو بھی کہیں اور جگہ سیر کرنے نہ جا کر وہیں چلی جاتی۔ ونے بھی اُس سے کچھ فاصلہ پر لکھنے پڑھتے کُتّے سے کھیلتے یا کسی دوست سے باتیں کرتے ضرور دکھائی دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتے تھے پر شرم کے سبب کوئی بات چیت کرنے میں پیش قدمی نہ کرتا تھا۔ دونوں ہی حیادار تھے پر دونوں ہی اس خاموش بیانی کا مطلب سمجھتے تھے۔ پہلے اِس زبان کا علم نہ تھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خواہش ایک ہی بیقراری ایک ہی تڑپ۔ ایک ہی آگ تھی۔ خاموش بیانی سے اُنہیں تسکین نہ ہوتی لیکن کسی کو گفتگو کرنے

کی کچھ جرأت نہ ہوتی۔ دونوں اپنے اپنے دلوں میں عشقیہ گفتگو کی نئی نئی باتیں سوچ کر آتے اور وہاں جا کر سب بھول جاتے۔ دونوں ہی عہد کے پکے اور معیار کے پجاری تھے۔ لیکن ایک کا مذہبی کتابوں کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دوسرا سمتی کو اپنے مجوزہ مضامین پر تقریر سنانے کا موقع بھی نہ پاتا تھا۔ دونوں ہی کے لئے عشق کا موتی عشق کا نشہ ثابت ہو رہا تھا۔

ایک روز رات کو کھانا کھانے کے بعد صوفیہ رانی جی کے پاس بیٹھی ہوئی کوئی اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی کہ ونے سنگھ آکر بیٹھ گئے۔ صوفی کی عجیب حالت ہوگئی۔ پڑھتے پڑھتے بھول جاتی کہ کہاں تک پڑھ گئی ہوں اور پڑھی ہوئی سطروں کو دوبارہ پڑھنے لگتی۔ وہ بھی اٹک اٹک کر الفاظ پر نظر نہ جمتی۔ وہ بھول جانا چاہتی تھی کہ کمرہ میں رانی کے علاوہ کوئی اور شخص بیٹھا ہوا ہے مگر ونے کی طرف دیکھے بغیر ہی اُس کو غائبانہ علم سا ہو جاتا تھا کہ اب وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں اور فوراً ہی اُس کا دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ جانہوی نے کئی بار ٹوکا "سوتی تو نہیں ہو؟ کیا بات ہے؟ رک کیوں جاتی ہو؟ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے بیٹی؟" دفعتاً اُن کی نگاہ ونے سنگھ پر پڑی۔ اسی وقت جب وہ عاشقانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جانہوی کا شگفتہ اور مطمئن چہرہ تمتما اٹھا۔ گویا باغ میں آگ لگ گئی۔ تیز نگاہی سے ونے سنگھ کی طرف دیکھ کر بولی "تم کب جا رہے ہو؟"

ونے۔ بہت جلد۔

جانہوی۔ میں بہت جلد کا مطلب یہ سمجھتی ہوں کہ تم کل ہی علی الصباح

روانہ ہو جاؤ گے ؛

ونے۔ ابھی ساتھ جانے والے چند آدمی باہر گئے ہوئے ہیں ؛

جانھوی۔ کوئی ہرج نہیں۔ وہ پیچھے سے چلے جائیں گے۔ نہیں کل ہی جانا ہوگا ؛

ونے۔ جو ارشاد ؛

جانھوی۔ ابھی جا کر سب آدمیوں کو اطلاع دے دو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ طلوعِ آفتاب کے وقت اسٹیشن پر پہنچ جاؤ ؛

ونے۔ اندو سے ملنے جانا ہے ؛

جانھوی۔ کوئی ضرورت نہیں۔ ملنے کا رواج عورتوں کے لئے ہے۔ مردوں کے لئے نہیں۔ جاؤ ؛

ونے کو پھر کچھ کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ آہستہ سے اُٹھے اور چلے گئے ؛

صوفی نے ہمت کر کے کہا "آج کل تو راجپوتانہ میں آگ برستی ہوگی" ؛

جانھوی نے طے شدہ انداز سے کہا "فرض کو کبھی آگ اور پانی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ جاؤ۔ تم بھی سو رہو۔ سویرے اُٹھنا ہے" ؛

صوفی ساری رات بیٹھی رہی۔ ونے سے ایک بار ملنے کے لئے اُس کا دل چھٹ پٹا رہا تھا۔ آہ وہ کل چلے جائیں گے اور میں اُن سے الوداعی ملاقات بھی نہ کر سکوں گی! وہ بار بار کھڑکی سے جھانکتی کہ کہیں ونے کی آہٹ مل جائے۔ چھت پر چڑھ کر دیکھا تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستارے اس کی بیقراری پر ہنس رہے تھے۔ اُس کے دل میں کئی بار

زبردست تحریک ہوئی کہ چھت پر سے نیچے باغ میں کود پڑوں۔ اُن کے کمرہ میں جاؤں اور کہوں میں تمہاری ہوں! آہ اگر مذہب نے میرے اور اُن کے درمیان میں رکاوٹ نہ کھڑی کردی ہوتی تو وہ اتنے متفکر کیوں ہوتے؟ مجھ کو اتنا پس وپیش کیوں ہوتا؟ رانی مجھ سے بیرخی کیوں کرتیں؟ اگر میں راجپوتنی ہوتی تو رانی خوشی سے مجھ کو قبول کرتیں مگر میں یسوع کی مقلد ہونے کی وجہ سے قابل ترک ہوں یسوع اور کرشن میں کتنی یکسانیت ہے۔ لیکن اُن کے مقلدوں میں کتنا اختلاف! کیسی بربرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مذہبی اختلافات نے ہمارے دلوں پر کتنا ظلم کیا ہے۔

جوں جوں رات گزرتی تھی صوفی کا دل فرطِ یاس سے بیٹھا جاتا تھا۔ ہائے! میں یونہی بیٹھی رہوں گی اور سویرا ہو جائے گا۔ وہ چلے جائیں گے۔ کوئی ایسا بھی تو نہیں جس کے ہاتھوں ایک خط لکھ کر بھیج دوں۔ میرے ہی سبب سے تو اُن کو یہ سزا مل رہی ہے۔ ماں کا دل بھی بیرحم ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی میں ہی بدنصیب ہوں پر اب معلوم ہوا ایسی مائیں اور بھی ہیں۔

وہ چھت پر سے اُتری اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی یاس نے نیند کی گود میں پناہ لی۔ لیکن فکر کی نیند حالت گرسنگی کا کھیل ہے سکون سے بری اور لذت سے خالی۔ ذرا ہی دیر سوئی تھی کہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ سورج کا اُجالا کمرہ میں پھیل گیا تھا اور ونے سنگھ اپنے بیس ہمراہیوں کے ساتھ اسٹیشن جانے کو تیار کھڑے تھے۔ باغ میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔

وہ فوراً باغ میں جا پہنچی۔ اور مجمع کو ہٹاتی ہوئی مسافروں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ قومی گیت گایا جا رہا تھا۔ مسافر ننگے سر ننگے پیر۔ ایک ایک کرتہ پہنے۔ ہاتھ میں لاٹھی لئے گردنوں میں ایک ایک جھولی لٹکائے۔ سفر پر جانے کو تیار تھے۔ سب کے سب خوشی اور جوش سے بھرے ہوئے قومیت کے غرور سے بیخود ہو رہے تھے جن کو دیکھ کر تماشائیوں کے دل جذبۂ افتخار سے معمور تھے۔ ایک لمحہ بعد رانی جاہنوی آئیں اور مسافروں کے پیشانیوں پر زعفران کے قشقے لگائے۔ پھر کنور بھرت سنگھ نے آکر اُن کے گلوں میں ہار پہنائے۔ بعد ازاں ڈاکٹر گنگولی نے نہایت منتخب الفاظ میں اُن کو اپنا وعظ سُنایا۔ وعظ سُن کر جانے والے روانہ ہو گئے۔ جے جے کا نعرہ ہزار ہزار گلوں سے نکل کر فضا میں گونجنے لگا۔ عورتوں مردوں کا ایک مجمع اُن کے پیچھے چلا۔ صوفیہ بت بنی ہوئی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے دل میں رہ رہ کر اُمنگ اُٹھتی تھی کہ میں بھی انہیں کے ساتھ چلی جاؤں۔ اور اپنے دُکھی بھائیوں کی خدمت کروں۔ اس کی آنکھیں ونے سنگھ پر لگی ہوئی تھیں۔ دفعتہً ونے کی آنکھیں بھی اُس کی جانب پھریں۔ اُنہیں کتنی مایوسی تھی۔ کتنی باطنی تکلیف۔ کتنی مجبوری۔ کتنی عاجزی۔ وہ سب جانے والوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ صوفیہ ہوش اور بیہوشی کی حالت میں مسافروں کے پیچھے پیچھے چلی۔ اور اسی طرح سڑک پر جا پہنچی۔ پھر چوراہا ملا۔ اس کے بعد کسی راجہ کا عظیم الشان محل۔ پر ابھی تک صوفی کو خبر نہ ہوئی کہ میں ان کے ساتھ چلی جا رہی ہوں۔ اُس کو اس وقت ونے سنگھ کے سوا اور کوئی

نظر ہی نہ آتا تھا۔ کوئی زبردست کشش اُسے کھینچے لئے جارہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن کے سامنے والے چوراہے پر پہنچ گئی۔ دفعتاً اُس کے کانوں میں پربھوسیوک کی آواز پڑی جو بڑی تیزی سے فٹن دوڑائے چلے آرہے تھے۔

پربھوسیوک نے پوچھا: "صوفی! تم کہاں جارہی ہو؟ جوتے تک نہیں۔ صرف زیر پائیاں پہنے ہوئے ہو۔"

صوفیہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آہ۔ میں اس بھیس میں کہاں چلی آئی؟ مجھے سدھ ہی نہ رہی۔ لجاتی ہوئی بولی: "کہیں تو نہیں۔"

پربھوسیوک۔ کیا ان لوگوں کے ساتھ اسٹیشن تک جاؤ گی؟ آؤ! گاڑی پر بیٹھ جاؤ۔ میں بھی وہیں چلتا ہوں۔ مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ جارہے ہیں جلد ہی گاڑی تیار کراکے آپہنچا ورنہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔

صوفی۔ میں اتنی دور نکل آئی اور ذرا بھی خیال نہ آیا کہ کہاں جارہی ہوں۔

پربھوسیوک۔ آکر بیٹھ نہ جاؤ۔ اتنی دور آئی ہو تو اسٹیشن تک اور چلی چلو۔

صوفی۔ میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔ یہیں سے واپس ہوں گی۔

پربھوسیوک۔ میں اسٹیشن سے واپسی پر آؤں گا۔ آج تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔

صوفی۔ میں وہاں نہ جاؤں گی۔

پربھوسیوک۔ بڑے پاپا بہت ناراض ہوں گے۔ آج تم کو اُنھوں نے بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا ہے۔

صوفی۔ جب تک ماما خود آکر مجھے نہ لے جائیں گی اُس وقت تک گھر میں قدم دھروں گی۔

یہ کہہ کر صوفیہ لوٹ پڑی اور پربھو سیوک اسٹیشن کو چل دیئے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر وِنے نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ صوفی نہ تھی۔

پربھو سیوک نے اُن کے کان میں کہا "دھرم سالہ تک یوں ہی رات کے کپڑے پہنے چلی آئی تھی۔ وہاں سے لوٹ گئی۔ جا کر خط ضرور لکھئے گا۔ ورنہ وہ راجپوتانہ جا پہنچے گی"۔

وِنے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "صرف جسم لے کر جا رہا ہوں۔ دل یہی چھوڑے جاتا ہوں!"

(۱۰)

لڑکوں پر محبت کی طرح نفرت کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جب سے مٹھوا اور گھیسو کو معلوم ہوا تھا کہ طاہر علی ہمارا میدان زبردستی لے رہے ہیں۔ اُس وقت سے دونوں اُن کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ چتاری کے راجہ صاحب اور سورداس میں جو باتیں ہوئی تھیں اُن کا اُنہیں علم نہ تھا۔ سورداس کو خود بھی دغدغہ لگا ہوا تھا کہ اگرچہ راجہ صاحب نے اطمینان دلایا ہے مگر جلد ہی یہ مسئلہ پھر چھڑے گا۔ جان سیوک صاحب اتنی آسانی سے گلا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ بجرنگی۔ نایک رام وغیرہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ مٹھوا اور گھیسو یہ باتیں بڑی چاہ سے سنتے اور اُن کی آتشِ غضب اور بھی مشتعل ہوتی۔ گھیسو جب بھینسیں لیکر میدان کی طرف جاتا تو زور زور سے پکارتا "دیکھیں کون ہماری جمین

(زمین) لیتا ہے اُٹھا کر ایسا پٹکوں کہ وہ بھی یاد کرے۔ دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔ کچھ کمیں سمجھ لیا ہے"۔ وہ ذرا تھا بھی کڑ سنے دم کا۔ کشتی لڑتا تھا۔ بجرنگی خود بھی جوانی میں اچھا پہلوان تھا۔ گھیسو کو وہ شہر کے پہلوانوں کی ناک بنا دینا چاہتا تھا جس کے سامنے پنجابی پہلوانوں کو بھی خم ٹھونکنے کی ہمت نہ پڑے۔ دور دور جا کر دنگل مارے۔ لوگ کہیں "یہ بجرنگی کا بیٹا ہے"! وہ ابھی سے گھیسو کو اکھاڑے بھیجتا تھا۔ گھیسو اپنے زعم میں سمجھتا تھا کہ مجھے جو پیچ معلوم ہیں اُن سے جس کو بھی چاہوں گرا دوں۔ مٹھوا کشتی تو نہ لڑتا پر کبھی اکھاڑے میں جا بیٹھتا تھا۔ اُس کو اپنی پہلوانی کی ڈینگ مارنے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ دونوں جب طاہر علی کو کہیں دیکھتے تو سُنا سُنا کر کہتے "دشمن جاتا ہے اس کا منہ کالا"۔ مٹھوا کہتا "بجے حسن کر۔ کانٹا لگے نہ کنکر۔ دشمن کا تنگ کر"۔ گھیسو کہتا "بم بھولا بیری کے پیٹ میں گولا۔ اُس سے کچھ نہ جائے بولا"۔

طاہر علی ان چھوکروں کی چھچھورپن کی باتیں سنتے اور ان سُنی کر جاتے۔ لڑکوں کے منہ کیا لگیں۔ سوچتے۔ کہیں یہ سب گالیاں دے بیٹھیں تو اُن کا کیا بنا لوں گا؟ وہ دونوں سمجھتے ڈر کے مارے نہیں بولتے اور بھی شیر ہو جاتے۔ گھیسو مٹھوا پر اُن پیچوں کی آزمائش کرتا جن سے وہ طاہر علی کو پٹکے گا۔ پہلے یہ ہاتھ پکڑا پھر اپنی طرف کھینچا۔ تب وہ ہاتھ گردن میں ڈال دیا اور اڑنگی لگائی۔ بس چاروں شانے چت مٹھوا فوراً گر پڑتا تھا اور اس کو اس پیچ کے عجیب اثر کا یقین ہو جاتا تھا۔

ایک روز دونوں نے صلاح کی "چل کر میاں جی کے لڑکوں کی خبر لینی چاہئے"۔ میدان میں جا کر ظاہر اور جابر کو کھیلنے کے لئے بلایا۔

اور خوب چپتیں لگائیں۔ جابر چھوٹا تھا۔ اُسے مٹھوا نے دبا لیا۔ ظاہر اور گھیسو کا جوڑ تھا۔ لیکن گھیسو اکھاڑا دیکھے ہوئے تھا۔ کچھ داؤں پیچ جانتا ہی تھا۔ آن کی آن میں ظاہر کو دبا بیٹھا۔ مٹھوا نے جابر کے چٹکیاں کاٹنی شروع کیں۔ بیچارہ رونے لگا۔ گھیسو نے ظاہر کو کئی رگڑے دیئے۔ وہ بھی چوندھیا گیا۔ جب دیکھا کہ یہ تو مار ہی ڈالے گا تو اُس نے بھی پکار مچائی۔ ان دونوں کا رونا سُن کر ننھا سا صابر ایک پتلی سی قمچی لئے اکڑتا ہوا غم زدوں کی مدد کرنے آیا اور گھیسو کو قمچی سے مارنے لگا۔ جب اس مار کا گھیسو پر کچھ اثر نہ ہوا تو اُس نے اِس سے زیادہ چوٹ پہنچانے والا ہتھیار نکالا۔ وہ گھیسو پر تھوکنے لگا۔ گھیسو نے ظاہر کو چھوڑ دیا اور صابر کے دو تین طمانچے لگائے۔ ظاہر موقع پاکر پھر اُٹھا اور اب کے زیادہ ہوشیار ہو کر گھیسو سے لپٹ گیا۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ آخر گھیسو نے اُسے پھر پٹکا اور مشکیں چڑھا دیں۔ ظاہر کو اب رونے کے سوا کوئی اور تدبیر نہ سُوجھی۔ یہی کمزوروں کا آخری ہتھیار ہے۔ تینوں کے رونے کی آواز ماہر علی کے کانوں میں پہنچی وہ اس وقت مدرسہ جانے کو تیار تھے۔ فوراً کتابیں پٹک دیں اور میدان کی طرف دوڑے۔ دیکھا تو ظاہر اور جابر نیچے پڑے ہائے ہائے کر رہے ہیں اور اور صابر الگ رو رہا ہے۔ شرافت کا خون جوش میں آگیا۔ میں سید پولیس کے افسر کا بیٹا۔ چنگی کے محرر کا بھائی۔ انگریزی کے آٹھویں درجہ کا متعلم! یہ جاہل۔ گنوار۔ اہیر کا لونڈا اس کی اتنی مجال کہ میرے بھائیوں کو نیچا دکھائے۔ اُس نے گھیسو کو ایک ٹھوکر لگائی اور مٹھوا کو کئی طمانچے۔ مٹھوا تو رونے لگا مگر گھیسو دل کا مضبوط تھا۔ ظاہر کو چھوڑ کر اُٹھا۔

حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ دو مورچے سر کر چکا تھا۔ خم ٹھونک کر ماہر علی سے بھی لپٹ گیا۔ ماہر کا سفید پاجامہ میلا ہو گیا۔ آج ہی جوتے میں روغن لگایا تھا۔ اُس پر گرد پڑ گئی۔ سنوارے ہوئے بال بکھر گئے۔ غضب ناک ہو کر گھیسو کو ایسی گردنی دی کہ دو قدم پر جا گرا۔ صابر۔ ظاہر سب ہنسنے لگے۔ لڑکوں کی چوٹ بدلہ لینے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے۔ گھیسو اُن کو ہنستے دیکھ کر اور بھی جھنجھلایا۔ پھر اُٹھا اور ماہر سے لپٹ گیا۔ ماہر نے اُس کا گلا پکڑا اور زور سے دبانے لگا۔ گھیسو نے سمجھا اب مرا۔ یہ مارے بغیر نہ چھوڑے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ماہر کے ہاتھ میں دانت جما دیئے۔ تین دانت گڑ گئے۔ خون بہنے لگا۔ ماہر چیخ اُٹھا۔ اُس کا گلا چھوڑ کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔ مگر گھیسو کسی طرح نہ چھوڑتا تھا۔ خون بہتا دیکھ کر تینوں بھائیوں نے پھر رونا شروع کیا۔ زینب اور رقیہ یہ شور و غوغا سن کر دروازہ پر آ گئیں۔ دیکھا تو میدان جنگ خون سے سُرخ ہو رہا ہے۔ گالیاں دیتی ہوئیں طاہر علی کے پاس گئیں۔ زینب نے حقارت آمیز آواز سے کہا "تم یہاں بیٹھے کھالیں نوچ رہے ہو۔ کچھ دین دُنیا کی بھی خبر ہے؟ وہاں وہ اہیر کا لونڈا ہمارے بچّوں کا خون کئے ڈالتا ہے۔ موئے کو پکڑ پاتی تو خون ہی پی لیتی۔"

رقیہ۔ موا آدمی بچہ ہے کہ دیو بچہ۔ ماہر کے ہاتھ میں اتنے زور سے دانت کاٹا ہے کہ خون کے فوارے نکل رہے ہیں۔ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو اسی بات پر موئے کو جیتا گاڑ دیتا۔"

زینب۔ کوئی اپنا ہوتا تو اس وقت مونڈی کاٹے کو کچا ہی چبا جاتا۔"

طاہر علی گھبرا کر میدان کی طرف دوڑے۔ ماہر کے کپڑے خون سے

دیکھے تو جامہ سے باہر ہو گئے۔ گھیسو کے دونوں کان پکڑ کر زور سے ملے اور طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کئے۔ مٹھوا نے دیکھا اب پٹنے کی باری آئی۔ میدان ہمارے ہاتھ سے گیا گالیاں دیتا ہوا بھاگا۔ اِدھر گھیسو نے بھی گالیاں دینا شروع کیا۔ شہر کے لونڈے گالی دینے میں مشاق ہوتے ہیں۔ گھیسو نئی نئی گالیاں اختراع کر رہا تھا اور طاہر علی گالیوں کا جواب طمانچوں سے دے رہے تھے۔ مٹھوا نے جا کر اس معرکہ کی خبر بجرنگی کو دی۔ "یہ سب لوگ مل کر گھیسو کو مار رہے ہیں۔ اُس کے مُنہ سے لہو نکل رہا ہے۔ وہ بھینسیں چرا رہا تھا کہ تینوں لڑکے آکر بھینسوں کو بھگانے لگے۔ گھیسو نے منع کیا۔ تو سب نے مل کر مارا اور بڑے میاں بھی نکل کر مار رہے ہیں۔" بجرنگی یہ خبر سُنتے ہی آگ ہو گیا۔ اس نے طاہر علی کی ماں کو پچاس روپے دیئے تھے۔ اور اس زمین کو اپنی سمجھے بیٹھا تھا۔ لاٹھی اُٹھائی اور دوڑا۔ دیکھا تو طاہر علی گھیسو کے ہاتھ پاؤں بند ہوا رہے ہیں۔ پاگل ہو گیا بولا "بس منشی جی! بھلا چاہتے ہو تو ہٹ جاؤ۔ نہیں تو ساری سیکھی (شیخی) بھلا دوں گا۔ یہاں جیل خانہ کا ڈر نہیں ہے۔ سال دو سال وہیں کاٹ آؤں گا۔ مگر تم کو کسی کام نہ رکھوں گا۔ زمین تمہارے باپ کی نہیں ہے۔ اس لئے تمہیں پچاس روپے دیئے ہیں۔ کیا وہ حرام کے روپے تھے؟ بس ہٹ ہی جاؤ نہیں تو کچا چبا جاؤں گا۔ میرا نام بجرنگی ہے۔"

طاہر علی نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ گھیسو نے باپ کو دیکھتے ہی زور سے چھلانگ ماری اور ایک پتھر اُٹھا کر طاہر علی کی طرف پھینکا۔ وہ سر نیچا نہ کر لیں تو ماتھا پھٹ جائے۔ جب تک گھیسو دوسرا پتھر

اُٹھائے۔ انہوں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور اتنے زور سے اینٹھا کہ وہ "آہ مرا آہ مرا" کہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اب بجرنگی آپے سے باہر ہوگیا۔ جھپٹ کر ایسی لاٹھی ماری کہ طاہر علی تیورا کر گر پڑے۔ کئی چار جواب تک اِسے لڑکوں کا جھگڑا سمجھ کر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ طاہر علی کو گرتے دیکھ کر دوڑے۔ اور بجرنگی کو پکڑ لیا۔ میدان کارزار میں سناٹا چھا گیا۔ ہاں زینب اور رقیہ دروازہ پر کھڑی ہوئیں لفظی تیروں سے برابر کام لے رہی تھیں "موئے کاٹے نے غضب کر دیا اس پر خدا کا قہر نازل ہو۔ اگلا دن دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اُس کی میّت اُٹھے۔ کوئی دوڑتے ہوئے صاحب کے پاس جاکر کیوں اطلاع نہیں دیتا۔ ارے او چمارو! بیٹھے منہ کیا تاکتے ہو؟ جاکر صاحب کو خبر کیوں نہیں دیتے؟ کہنا ابھی چلئے۔ ساتھ لانا۔ کہنا پولیس لیتے چلئے۔ یہاں جان دینے نہیں آئے ہیں"۔

بجرنگی نے طاہر علی کو گرتے دیکھا تو سنبھل گیا۔ دوسرا ہاتھ نہ چھوڑا گھیسو کا ہاتھ پکڑا اور گھر چلا گیا۔ یہاں گھر میں کہرام مچ گیا۔ دو چمار رُو جان سیوک کے بنگلہ کی طرف گئے۔ طاہر علی کو لوگوں نے اٹھایا اور چارپائی پر لاد کر کمرہ میں لائے۔ کندھے پر لاٹھی لگی تھی۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ابھی تک بیہوش تھے۔ چماروں نے فوراً ہلدی پیسی اور اُسے گڑ چونہ میں ملا کر اُن کے کندھے پر لگایا۔ ایک آدمی لپک کر ارنڈ کے پتے توڑ لایا۔ دو آدمی بیٹھ کر چوٹ سینکنے لگے۔ زینب اور رقیہ تو طاہر علی کی مرہم پٹی کرنے لگیں۔ بیچاری کلثوم دروازہ پر کھڑی رو رہی تھی۔ شوہر کی طرف اُس سے دیکھا بھی نہ جاتا تھا۔ گرنے سے اُن کے سر میں چوٹ آگئی تھی

خون بہہ کر ماتھے پر جم گیا تھا۔ بالوں پر لٹیں پڑ گئی تھیں گویا کسی مصور کے بُرش پر رنگ خشک ہو گیا ہو۔ دل میں درد ہو رہا تھا لیکن شوہر کو دیکھتے ہی اُس کو بیہوشی سی ہونے لگتی تھی۔ یہ خیال بھی آرہا تھا کہ یہ سب لوگ اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے؟ اس کو شوہر سے ذرا بھی محبت نہیں۔ کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہے۔ کیا کردں اُن کا چہرہ نہ جانے کیسا ہو گیا ہے۔ وہی چہرہ جس کی کبھی بلائیں لی جاتی تھیں۔ مرنے کے بعد خوف ناک ہو جاتا ہے۔ اُس کی طرف نگاہ کرنے کے لئے کلیجہ کو مضبوط بنانا پڑتا ہے۔ زندگی کی طرح موت کا بھی سب سے زیادہ نمایاں اثر چہرہ ہی پر پڑتا ہے۔ طاہر علی کی دن بھر سینک باندھ ہوئی۔ چماروں نے اس طرح دوڑ دھوپ کی گویا اُن کا کوئی خاص دوست ہو۔ عملی ہمدردی کا ہونا دہقانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ رات کو بھی کئی چمار اُن کے پاس بیٹھے ہوئے سینکتے باندھتے رہے۔ زینب اور رقیہ بار بار کلثوم کو طعنے دیتیں "بہن تمہارا دل بھی غضب کا ہے۔ وہاں شوہر کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ اور تم یہاں مزہ سے بیٹھی ہو۔ ہمارے میاں کے سر میں ذرا سا درد ہوتا تھا تو ہماری جان ناخون میں آجاتی تھی۔ آج کل کی عورتوں کا کلیجہ سچ مچ پتھر کا ہوتا ہے۔" کلثوم کا دل ان تیروں سے چھدا جاتا تھا۔ مگر یہ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تمہیں دونوں کیوں نہیں چلی جاتیں؟ آخر تم بھی تو اُنہیں کی کمائی کھاتی ہو اور مجھ سے زیادہ۔ لیکن اتنا کہتی تو بچ کر کہاں جاتی۔ دونوں اُس کے گلے پڑ جاتیں۔ بیچاری ساری رات جاگتی رہی۔ بار بار دروازہ پر جا کر آہٹ لے آتی تھی۔ کسی طرح رات گئی۔ صبح طاہر علی کی آنکھ کھلی۔ درد سے اب بھی کراہ رہے تھے۔ مگر اب اُن کی حالت اُس قدر

تشویش انگیز تھی۔ تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ کلثوم نے اُن کو چاروں سے باتیں کرتے سُنا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُن کی آواز کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ چاروں نے جوں ہی اُنہیں ہوش میں دیکھا سمجھ گئے کہ اب ہماری ضرورت نہیں رہی۔ اب گھر والوں کی تیمارداری کا وقت آگیا۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب کلثوم نے دل کو مضبوط کیا اور شوہر کے پاس آ بیٹھی
طاہر علی نے اُس کو دیکھا تو کمزور آواز میں بولے "خدا نے مجھے نمک حرامی کی سزا دی ہے۔ جن کے لئے اپنے آقا کا برا چیتا وہی اپنے دشمن ہو گئے"
کلثوم۔ تم یہ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ جب تک زمین کا معاملہ طے نہ ہو جائے گا۔ نت نیا جھگڑا ہوتا ہی رہے گا۔ لوگوں سے دشمنی بڑھتی جائے گی۔ یہاں جان تھوڑا ہی دینی ہے خدا نے جس طرح اتنے دن رزق دیا اُسی طرح آگے بھی دے گا۔ جان تو سلامت رہے گی:
طاہر۔ جان تو سلامت رہے گی مگر گزر کیسے ہوگی؟ کون اتنا دیئے دیتا ہے؟ دیکھتی ہو کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں؟
کلثوم۔ نہ اتنا ملے گا نہ سہی۔ اس کا نصف تو ملے گا۔ دونوں وقت نہ کھائیں گے۔ ایک ہی وقت سہی۔ جان تو آفت میں نہ رہے گی:
طاہر۔ تم ایک وقت کھا کر خوش رہو گی۔ گھر میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ اُن کے دکھڑے روز کون سُنے گا؟ مجھے اپنی جان سے دشمنی تھوڑا ہی ہے پر مجبور ہوں۔ خدا کو جو منظور ہے وہی ہو گا:
کلثوم۔ گھر کے اور لوگوں کے پیچھے کیا جان دے دو گے؟
طاہر۔ کیسی باتیں کرتی ہو؟ آخر وہ لوگ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ اپنے ہی بھائی ہیں یا مائیں ہیں۔ ان کی پرورش میرے سوا اور کون کرے گا؟

کلثوم۔ تم سمجھتے ہو گے وہ لوگ تمہارے محتاج ہیں مگر اُن کو تمہاری رتی برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ جب تک مفت ملے اپنے خزانہ میں کیوں ہاتھ لگائیں۔ میرے بچے پیسے پیسے کو ترستے ہیں اور وہاں مٹھائیوں کی ہانڈیاں آتی ہیں۔ اُن کے لڑکے مزہ میں کھاتے ہیں۔ دیکھتی ہوں اور آنکھیں بند کر لیتی ہوں ؞

طاہر۔ میرا جو فرض ہے اُسے پورا کرتا ہوں۔ اگر ان کے پاس روپے ہیں تو اس کا مجھے کیوں افسوس ہو۔ وہ شوق سے کھائیں اور آرام سے رہیں۔ تمہاری باتوں سے حسد کی بو آتی ہے۔ خدا کے لئے مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو ؞

کلثوم۔ پچھتاؤ گے۔ جب سمجھاتی ہوں۔ مجھی پر ناراض ہونے ہو۔ لیکن دیکھ لینا کوئی بات نہ پوچھے گا ؞

طاہر۔ یہ سب تمہاری نیّت کا قصور ہے ؞

کلثوم۔ ہاں عورت ہوں۔ مجھ میں عقل کہاں ؟ پڑے تو ہو کسی نے جھانکا تک نہیں۔ قلق ہوتا تو یوں چین سے نہ بیٹھی رہتیں ؞

طاہر علی نے کروٹ بدلی تو کندھے میں شدت کا درد محسوس ہوا آہ آہ کر کے چیخ اُٹھے۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔ کلثوم گھبرا کر بولی "کسی کو بھیج کر ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلا لیتے ؟ کہیں ہڈی پر ضرب نہ آگئی ہو" ؞

طاہر۔ ہاں مجھے بھی ایسا ہی اندیشہ ہو رہا ہے مگر ڈاکٹر کو بلاؤں تو اُس کی فیس کے روپے کہاں سے آویں گے ؟

کلثوم۔ تنخواہ تو ابھی ملی تھی۔ کیا اتنی جلد خرچ ہو گئی ؟

طاہر۔ خرچ تو نہیں ہو گئی۔ لیکن فیس کی گنجایش نہیں ہے۔ اب کے

ماہر کی تین ماہ کی فیس دینی ہوگی۔ بارہ روپے تو فیس ہی کے نکل جائیں گے۔ صرف اٹھارہ بچیں گے۔ ابھی تو پورا مہینہ پڑا ہوا ہے۔ کیا خاک کریں گے؟

کلثوم۔ جب دیکھو ماہر کی فیس کا تقاضا سر پر سوار رہتا ہے۔ ابھی دس دن ہوئے فیس دی نہیں گئی؟

طاہر۔ دس دن نہیں ہوئے ایک مہینہ ہوگیا۔

کلثوم۔ فیس اب کے نہ دی جائے گی۔ ڈاکٹر کی فیس اُس فیس سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ پڑھ کر روپے کمائیں گے تو میرا گھر نہ بھریں گے۔ مجھے تو تمہاری ہی ذات کا بھروسہ ہے۔

طاہر۔ (بات بدل کر) اِن موذیوں کی جب تک بخوبی تنبیہ نہ ہو جائے گی۔ شرارت سے باز نہ آئیں گے۔

کلثوم۔ ساری شرارت اسی ماہر کی تھی۔ لڑکوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ وہاں نہ جاتا تو کیوں معاملہ اتنا طول کھینچتا۔ اس پر جو اُس کے لونڈے نے ذرا دانت کاٹ لیا تو آپ بھنا اُٹھے۔

طاہر۔ مجھے تو خون کے چھینٹے دیکھتے ہی جیسے سر پر شیطان سوار ہو گیا۔
اتنے میں گھیسو کی ماں جمنی آ پہنچی۔ زینب نے اُسے دیکھتے ہی فوراً بُلا لیا اور ڈانٹ کر کہا "معلوم ہوتا ہے تیری شامت آگئی ہے"۔

جمنی۔ بیگم صاحب! شامت نہیں آئی ہے۔ بُرے دن آئے ہیں اور کیا کہوں۔ میں کل دہی بیچ کر لوٹی تو یہ حال سُنا۔ سیدھے آپ کی خدمت میں دوڑی۔ پر یہاں بہت سے آدمی جمع تھے۔ لاج کے مارے لوٹ گئی۔ آج دہی بیچنے نہیں گئی۔ بہت ڈرتے ڈرتے آئی ہوں۔ جو کچھ بھول چوک ہوئی اُسے معاف کیجئے نہیں تو اُجڑ جائیں گے۔ کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

زینب۔ اب ہمارے کئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ صاحب بلا مقدمہ چلائے نہ مانیں گے۔ اور وہ نہ چلائیں گے تو ہم چلائیں گے۔ ہم کوئی ڈھنئے جلاہے ہیں؟ یوں سب سے دبتے پھریں تو عزت کیسے رہے؟ میاں کے باپ تھانہ دار تھے۔ سارا علاقہ ان کے نام سے کانپتا تھا۔ بڑے بڑے رئیس ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ اُن کی اولاد کیا اب ایسی گئی گوری ہو گئی کہ چھوٹے چھوٹے آدمی بےعزتی کریں؟ تیرے لونڈے نے ماہر کو اتنے زور سے دانت کاٹا کہ لہولہان ہو گیا۔ پٹی باندھے پڑا ہے۔ تیرے شوہر نے آکر لڑکے کو ڈانٹ دیا ہوتا تو بگڑی بات بن جاتی۔ لیکن اُس نے تو آتے ہی آتے لاٹھی چلادی۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ اتنی رعایت نہیں کر سکتے۔

رقیہ۔ جب پولیس آکر مارتے مارتے کچومر نکال لے گی۔ تب ہوش آئے گا۔ نذر نیاز دینا پڑے گی وہ الگ۔ جبھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

جمنی کو اپنے شوہر کے طبقہ کی عملی واقفیت بھی حاصل تھی۔ ان دھمکیوں سے ذرا بھی نہ ڈری۔ بولی بیگم صاحب یہاں اتنے روپے کہاں دھرے ہیں؟ دودھ پانی کر کے دس پانچ روپے اکٹھے کئے ہیں بس وہیں تک اپنی دوڑ ہے۔ اس روزگار میں اب کیا رکھا ہے؟ روپیہ کا تین پنسیری تو بھوسہ ملتا ہے۔ ایک روپیہ میں ایک بھینس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اُس پر کھلی۔ بنولہ۔ بھوسی۔ چوکر۔ سبھی کچھ چاہئے۔ کسی طرح دن کاٹ رہے ہیں۔ آپ کے بال بچوں کو سال چھ مہینے دودھ پلا دوں گی۔

زینب کچھ نرم ہو گئی۔ کہ یہ اہیرن کتنی گرم ہوتی ہیں کھیل ہے۔ اس کے لئے کسی دوسرے ہی منتر سے کام لینا چاہئے تھا۔ ناک سکوڑ کر نے ہوئی بولی

"تو اپنا دودھ اپنے گھر رکھ۔ یہاں دودھ گھی کے ایسے بھوکے نہیں ہیں۔ یہ زمین اپنی ہوئی جاتی ہے جتنے مویشی چاہوں گی پال لوں گی۔ مگر تجھے کہے دیتی ہوں کہ تو گھر میں کل سے نہ بیٹھنے پائے گی۔ پولیس کی رپٹ تو صاحب کے ہاتھ میں ہے پر ہمیں بھی خدا نے ایسا علم دیا ہے کہ جہاں ایک نقش لکھ کر دم کیا جنّات اپنا کام کرنے لگے۔ جب ہمارے میاں زندہ تھے۔ تو ایک بار پولیس کے ایک بڑے انگریز حاکم سے کچھ حجت ہو گئی۔ بولا ہم تم کو نکال دیں گے۔ میاں نے کہا ہم کو نکال دو گے تم بھی آرام سے نہ بیٹھو گے۔ میاں نے آکر مجھ سے کہا۔ میں نے اسی رات کو سلیمانی نقش لکھ کر دم کیا۔ اس کی میم کا پورا حمل گر گیا۔ دوڑا ہوا آیا۔ خوشامدیں کیں۔ پیروں پر گرا۔ میاں سے قصور معاف کرایا تب میم کی جان بچی۔ کیوں رقیہ تمہیں یاد ہے نا؟

رقیہ۔ یاد کیوں نہیں ہے۔ میں نے ہی تو دعا پڑھی تھی۔ صاحب رات بھر دروازہ پر پکارتا رہا تھا۔

زینب۔ ہم اپنی طرف سے کسی کی برائی نہیں چاہتے۔ لیکن جب جان پر آبنتی ہے۔ تو سبق بھی ایسا دے دیتے ہیں کہ زندگی بھر نہ بھولے۔ ابھی اپنے پیر سے کہہ دیں تو خدا جانے کیا غضب ڈھائیں۔ تمہیں یاد ہے رقیہ؟ ایک اہیر نے انہیں دودھ میں پانی ملا کر دیا تھا۔ ان کی زبان سے اتنا ہی نکلا "جا تجھے خدا سمجھے"۔ اہیر نے گھر آکر دیکھا تو اس کی دو سو روپے کی بھینس مر گئی تھی۔

جمنی نے یہ باتیں سنیں تو ہوش اڑ گئے۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی تھانہ۔ پولیس۔ کچہری اور دربار کی بہ نسبت بھوت پلید سے زیادہ

خوف زدہ رہتی تھی - پاس پڑوس میں بھوتوں کی لیلا دیکھنے کے موقع آئے دن ملتے ہی رہتے تھے - مُلّاؤں کے جنتر منتر کہیں زیادہ لاگو ہوتے ہیں - یہ بھی جانتی تھی، زینب نے اُس کے شیطانی خوف کو تحریک کر کے اپنی کمال ہوشیاری کا ثبوت دیا - جمنی ڈر کر بولی "نہیں بیگم صاحب آپ کو بھی بھگوان نے بال بچے دئے ہیں - ایسا ظلم نہ کیجئے گا - نہیں تو مر جاؤں گی"

زینب - یہ بھی نہ کریں - وہ بھی نہ کریں تو عزت کیسے رہے؟ کل کو تیرا ہیر پھر لٹھ لے کر آ پہنچے تو؟ خدا نے چاہا تو اب وہ لٹھ اُٹھانے لایق رہی نہ جائے گا"

جمنی کانپتی ہوئی پیروں پر گر پڑی اور بولی "بی بی - جو حکم ہو اُس کے لئے حاضر ہوں"

زینب نے چوٹ پر چوٹ لگائی اور جمنی کے بہت رونے گڑگڑانے پر پچیس روپے لے کر جنات سے اُس کو بےخوف کیا، جمنی گھر گئی - روپے لا کر دئے اور پیروں پر گری مگر بجز گی سے یہ بات نہ کہی، وہ چلی گئی تو زینب نے ہنس کر کہا "خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے - اس کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا - تم بے صبر ہو جاتی ہو ورنہ میں نے کچھ نہ کچھ اور اینٹھا ہوتا - سوار کو چاہئے کہ باگ ہمیشہ کڑی رکھے"

دفعتاً صابر نے آ کر زینب سے کہا "آپ کو ابا بلاتے ہیں" زینب وہاں گئی تو طاہر علی کو پڑے کراہتے دیکھا - کلثوم سے بولی "بی بی غضب کا تھا را جگر ہے - ارے بھلے آدمی! جا کر ذرا مونگ کا دلیا پکا دے - غریب نے رات کو کچھ نہیں کھایا - اس وقت بھی مُنہ میں کچھ نہ جائے گا

تو کیا حال ہو گا؟
طاہر۔ نہیں۔ میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ کو اس نے تکلیف دی ہے کہ اگر آپ کے پاس کچھ روپے ہوں تو مجھے قرض کے طور پر دے دیجئے۔ میرے شانوں میں بڑا درد ہے۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھلانا چاہتا ہوں مگر اُس کی فیس کے لئے روپلوں کی ضرورت ہے۔
زینب۔ بیٹا۔ بھلا سوچو تو میرے پاس روپلے کہاں سے آئیں گے؟ تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ مگر تم ڈاکٹر کو بلاتے ہی کیوں ہو؟ تمہیں سیدھے صاحب کے یہاں جانا چاہیئے۔ یہ ہنگامہ انہیں کی بدولت تو ہوا ہے ورنہ یہاں ہم سے کسی سے کیا غرض تھی؟ ایک یکہ منگلوا لو اور صاحب کے یہاں چلے جاؤ۔ وہ ایک رقعہ لکھ دیں گے تو سرکاری شفاخانہ میں خاصی طرح علاج ہو جائے گا۔ تمہیں سوچو۔ ہماری حیثیت ڈاکٹر بلانے کی ہے؟
طاہر علی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ماں کا شکریہ ادا کیا۔ سوچا نہ جانے یہی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ یکہ منگوایا۔ لاٹھی کے سہارے بڑی مشکل سے اُس پر سوار ہوئے اور صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔
مسٹر سیوک راجہ مہیندر کمار سے ملنے کے بعد کمپنی کے حصص بیچنے کے لئے باہر چلے گئے تھے۔ کل وہ راجہ صاحب سے پھر ملے تھے۔ مگر جب اُن کا فیصلہ سُنا۔ تو بہت مایوس ہوئے۔ بہت دیر تک بیٹھے بحث مباحثہ کرتے رہے لیکن راجہ صاحب نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا۔ ناامید ہو کر آئے اور مسز سیوک سے سارا حال کہہ سُنایا۔

مسز سیوک کو ہندوستانیوں سے چڑ تھی۔ اگرچہ اسی ملک کے
آب و گل سے اُن کا جسم بنا تھا۔ لیکن اپنے خیال میں مذہب عیسوی
کو اختیار کر کے وہ اُن بداطواریوں سے نجات پا چکی تھیں جو ہندوستانیوں
کے لئے مخصوص ہیں۔ اُن کے خیال میں خدا نے ہندوستانیوں کو شرافت
ہمدردی۔ نیاضی۔ انسانیت وغیرہ اعلےٰ اوصاف سے بالکل ہی محروم
رکھا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کی معتقد تھیں اور طرزِ معاشرت میں اُسی
کی تقلید کرتی تھیں۔ کھانا پینا وضع قطع بود و باش سب انگریزی
تھی۔ مجبوری صرف اپنے سانولے رنگ سے تھی۔ صابن اور دیگر کیمیائی
اشیاء کے متواتر استعمال سے بھی دلی مراد بر نہ آتی تھی۔ اُن کی زندگی کا
اعلےٰ مقصد یہی تھا کہ ہم عیسائیوں کے درجہ سے نکل کر انگریزوں سے
مل جائیں۔ ہمیں لوگ صاحب سمجھیں۔ ہمارا ربط ضبط انگریزوں سے ہو۔
ہمارے لڑکوں کی شادیاں اینگلو انڈین یا کم از کم اعلےٰ طبقہ والے یوریشین
لوگوں کے یہاں ہوں۔ صوفیہ کی تعلیم و تربیت انگریزی طریقہ پر ہوئی
تھی لیکن وہ ماں کے بہت اصرار کرنے پر بھی انگریزی پارٹیوں اور
دعوتوں میں نہ شریک ہوتی تھی۔ ناچ سے تو اُس کو نفرت ہی تھی۔
لیکن مسز سیوک ان مواقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ یوں کام نہ چلتا
تو خاص کوشش کر کے دعوتی کارڈ منگواتیں تھیں۔ اگر خود اُن کے گھر
پر دعوتیں اور پارٹیاں بہت کم ہوتی تھیں تو اُس کا سبب تھی ایشور سیوک
کی کنجوسی۔

یہ حال سُن کر مسز سیوک نے کہا۔ دیکھ لی ہندوستانیوں کی شرافت؟
پھولے نہ سماتے تھے۔ اب تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کس قدر بدعہد اور

نا اہل ہیں؟ ایک اندھے فقیر کے مقابلہ میں تمہاری یہ قدر ہے! جا نہماری تو ان لوگوں کے کھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ اُن بڑے بڑے آدمیوں کا حال ہے جو اپنی قوم کے رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ جن کی فیاضی پر لوگوں کو ناز ہے! میں نے ایک بار مسٹر کلارک سے یہ ذکر کیا تھا اُنہوں نے تحصیلداروں کو حکم دے دیا کہ اپنے اپنے علاقہ میں تمباکو کی پیداوار بڑھاؤ۔ یہ صوفی کے آگ میں کودنے کا انعام ہے۔ ذرا سا میونسپلٹی کا اختیار کیا مل گیا سبھوں کے دماغ پھر گئے۔ مسٹر کلارک کہتے تھے کہ اگر راجہ صاحب زمین کا معاملہ نہ طے کریں گے تو میں اُسے ضابطہ سے آپ کو دلادوں گا"۔

مسٹر جوزف کلارک حاکم ضلع تھے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں سے یہاں آئے تھے۔ مسز سیوک نے اُن سے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا۔ دراصل اُنہوں نے کلارک کو صوفی کے لئے منتخب کیا تھا۔ دو ایک دفعہ اُنہیں اپنے گھر بھی بلا چکی تھیں۔ گھر چھوڑ دینے کے پیشتر صوفی کی اُن سے دو تین بار ملاقات بھی ہو چکی تھی مگر وہ اُن کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوئی تھی۔ تو بھی مسز سیوک ابھی اس بارہ میں نا امید نہیں ہو چکی تھیں۔ کلارک سے کہتی رہتی تھیں کہ صوفی مہمانی کرنے گئی ہے۔ اسی طرح موقع پاکر اُن کی آتش عشق کو مشتعل کرتی رہتی تھیں۔

جان سیوک نے نادم ہو کر کہا "میں کیا جانتا تھا کہ یہ حضرت بھی دغا دیں گے۔ یہاں اُن کی بڑی شہرت ہے۔ اپنے قول کے پکے سمجھے جاتے ہیں۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ اب کوئی دوسری تدبیر سوچنی پڑے گی"۔

مسز سیوک "میں مسٹر کلارک سے کہوں گی۔ پادری صاحب سے بھی

سفارش کراؤں گی ۔

جان سیوک۔ مسٹر کلارک کو میونسپلٹی کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے ۔

جان سیوک اسی اندیشہ میں غرق تھے۔ کہ اُن کو ہنگامہ کی خبر ملی۔ سناٹے میں آ گئے۔ پولیس میں رپورٹ کی۔ دوسرے روز گودام جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ طاہر علی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ پہنچے۔ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ یکہ کے ہچکولوں نے اَدھ مؤا سا کر دیا تھا ۔

مسز سیوک نے انگریزی میں کہا۔ "کیسی صورت بنا لی ہے گویا مصیبت کا پہاڑ پھٹ پڑا ہے "۔

جان سیوک۔ کہئے منشی جی معلوم ہوتا ہے آپ کے سخت چوٹ آئی۔ مجھے اس کا بے حد افسوس ہے ۔

طاہر۔ حضور کچھ نہ پوچھئے۔ کم بختوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی ۔

جان سیوک۔ اور انھیں مفسدوں کی آپ مجھ سے سفارش کر رہے تھے !

طاہر۔ حضور، اپنی خطا کی خوب سزا پا چکا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری گردن کی ہڈی پر ضرب آ گئی ہے ۔

جان سیوک۔ یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ ہڈی ٹوٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ یہاں کسی طرح نہ آ سکتے تھے۔ چوٹ ضرور آئی ہے مگر دو چار روز مالش کر لینے سے صحت ہو جائے گی۔ آخر یہ مار پیٹ ہوئی کیوں ؟

طاہر۔ حضور! یہ سب اُسی شیطان بجرنگی اہیر کی حرکت ہے۔

جان سیوک۔ مگر مضروب ہو جانے ہی سے آپ جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔ میں اس کو آپ کی نادانی اور بے احتیاطی سمجھتا ہوں۔ آپ ایسے لوگوں سے اُلجھے ہی کیوں؟ آپ کو معلوم ہے۔ اس میں میری کتنی بدنامی ہے؟

طاہر۔ میری طرف سے تو کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔

جان سیوک۔ ضرور ہوئی ورنہ دیہاتوں کے آدمی کسی سے چھیڑ کر لڑنے نہیں آتے۔ آپ کو اس طرح رہنا چاہئے کہ لوگوں پر آپ کا رعب ہے۔ یہ نہیں کہ چھوٹے آدمیوں کو آپ سے مار پیٹ کرنے کی ہمت ہو۔

مسز سیوک۔ کچھ نہیں۔ یہ سب اُن کی کمزوری ہے۔ کوئی راہ چلتے کسی کو نہیں مارتا۔

ایشور سیوک کرسی پر پڑے پڑے بولے "خدا کے بیٹے! مجھے اپنے سایہ میں لے۔ سچے دل سے اُس کی بندگی نہ کرنے کی یہی سزا ہے"۔

طاہر علی کو یہ باتیں زخم پر نمک کی طرح معلوم ہوئیں۔ ایسا غصہ آیا کہ اسی وقت کہہ دوں جہنم میں جائے تمہاری نوکری۔ لیکن جان سیوک کو اُن کی خستہ حالی سے فائدہ اُٹھانے کی ایک تدبیر سوجھ گئی۔ فٹن تیار کرائی اور طاہر علی کو لئے ہوئے راجہ مہیندر کمار کے مکان پر جا پہنچے۔ راجہ صاحب شہر کا گشت لگا کر مکان پر پہنچے ہی تھے۔ کہ جان سیوک کا کارڈ ملا۔ کچھ جھنجھلائے۔ لیکن مروت دامن گیر ہوئی۔ باہر نکل آئے۔ مسٹر سیوک نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی

مگر پانڈے پورمالوں نے اتنا فساد برپا کر رکھا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کے سوا کس کا دامن پکڑوں۔ کل سب نے مل کر گودام پر حملہ کر دیا۔ شاید آگ لگا دینا چاہتے تھے۔ مگر آگ تو نہ لگا سکے۔ ہاں یہ میرے ایجنٹ ہیں۔ بس سب کے سب اِن پر ٹوٹ پڑے۔ اِن کو اور اُن کے بھائیوں کو مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ اتنے پر بھی اُن کو تسکین نہ ہوئی۔ زنانہ مکان میں گھس گئے اور اگر عورتیں اندر سے دروازہ نہ بند کر لیں تو اُن کی آبرو ریزی میں کوئی شک نہ تھا۔ ان کو تو ایسی چوٹیں لگی ہیں کہ شاید مہینوں تک چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوں۔ کندھے کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہے"۔

مہیندر کمار سنگھ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُن کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر طیش میں آجاتے تھے۔ غضب ناک ہو کر بولے "سب زنانہ میں گھس گئے"؟

جان سیوک۔ کواڑ توڑنا چاہتے تھے مگر چماروں نے دھمکایا تو ہٹ گئے۔

مہیندر کمار۔ کمینے! عورتوں پر ظلم کرنا چاہتے تھے!

جان سیوک۔ یہی تو اِس ڈرامہ (ناٹک) کا سب سے زیادہ شرمناک حصّہ ہے۔

مہیندر کمار۔ شرم ناک نہیں۔ صاحب! قابل نفرین کہئے۔

جان سیوک۔ اب یہ بیچارے کہتے ہیں کہ یا تو میرا استعفا لیجئے یا گودام کی حفاظت کے لئے چوکیداروں کا بندوبست کیجئے۔ عورتیں اس قدر خوف زدہ ہیں کہ وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتیں۔ یہ ساری بِپتا

اُسی اندھے کی بدولت ہو رہی ہیں۔
مہیندر رکمار۔ مجھے تو وہ بہت ہی غریب اور سیدھا سا آدمی معلوم ہوتا ہے مگر سے پوچھتا ہوا! میں نے اُسی کی بیچارگی پر ترس کھا کر تہیہ کیا تھا کہ آپ کے لئے کوئی دوسری زمین تلاش کروں لیکن جب اُن لوگوں نے شرارت پر کمر باندھی ہے اور آپ کو وہاں سے جبراً ہٹانا چاہتے ہیں تو اس کی سزا اُنہیں ضرور ملے گی۔
جان سیوک۔ بس یہی بات ہے۔ وہ لوگ مجھے وہاں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ اگر رعایت کی گئی تو میرے گودام میں ضرور آگ لگا دیں گے۔
مہیندر رکمار۔ میں خوب سمجھ رہا ہوں۔ یوں میں خود جمہوریت کا دلدادہ ہوں اور اُس کے اصول کے دل و جان سے حمایت کرتا ہوں۔ لیکن جمہوریت کے نام پر مُلک میں جو بدامنی پھیلی ہوئی ہے اُس کا میں ایک زبردست مخالف ہوں۔ ایسی جمہوریت سے تو سرمایہ داری یا شخصی اقتدار وغیرہ سبھی بہتر ہیں۔ آپ مطمئن رہئے۔
اسی طرح کچھ دیر اور باتیں کر کے اور راجہ صاحب کو خوب بھر کر جان سیوک رخصت ہوئے۔ راستہ میں طاہر علی سوچنے لگے۔ صاحب کو میری ہی بدحالی سے اپنا کام نکالنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا۔ کیا ایسے صاحب ثروت۔ باعزت ذہین اور ذی علم لوگ ایسے خود غرض ہوتے ہیں؟
جان سیوک نے قیافہ سے اُن کے خیالات کو معلوم کر لیا۔ بولے۔ "آپ سوچ رہے ہوں گے۔ میں نے اس قدر مبالغہ اور رنگ آمیزی کیوں کی؟ صرف سانحہ کا واقعی حال ہی کیوں نہ بیان کیا؟ لیکن سوچئے۔

کہ کیا ایسی صورت میں مجھے یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ؟ دنیا میں کسی کام کا اچھا یا بُرا ہونا محض کامیابی پر محمول ہے۔ ایک شخص حکومت سے بغاوت کرتا ہے۔ اگر حکام نے اُس پر تشدد کرنے کا موقع پالیا تو وہ باغی کہا جاتا ہے اور سزا سے موت پاتا ہے۔ اگر اُس کا مقصد پورا ہو گیا تو وہ اپنے ملک کا نجات دہندہ اور فاتح سمجھا جاتا ہے اور اس کی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ کامیابی میں عیوب کے مٹا دینے کی عجیب قوت ہے۔ آپ جانتے ہیں دو سال پہلے مصطفےٰ کمال کیا تھا ؟ باغی ! ملک اُس کے خون کا پیاسا تھا۔ آج وہ اپنی قوم کا روحِ رواں ہے۔ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ کامیاب ہوا۔ لینن کئی سال قبل اپنی جان کے خوف سے امریکہ بھاگ گیا تھا۔ آج وہ جمہور روس کا پریزیڈنٹ ہے۔ یہ محض اس لئے کہ اُسکی بغاوت کامیاب ہوئی۔ میں نے راجہ صاحب کو طرفدار بنا لیا پھر مبالغہ کا عیب کہاں رہا ؟"

اتنے میں فٹن بنگلہ پر آپہنچی۔ ایشور سیوک نے آتے ہی آتے پوچھا۔ "کہو کیا کر آئے ؟"

جان سیوک نے فخر سے کہا "راجہ کو اپنا مرید بنا لیا۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی تو ضرور کرنی پڑی پر اُس کا اثر بہت اچھا ہوا"

ایشور سیوک۔ خدا تجھ پر رحم کی نگاہ رکھے۔ بیٹا ! رنگ آمیزی بغیر بھی دنیا کا کوئی کام چلتا ہے ؟ کامیابی کی یہی کنجی ہے اور تجارتی کامیابی کے لئے تو اس کا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ آپ کے پاس اچھی سے اچھی چیز ہے۔ جب تک آپ اُس کی تعریف نہیں کرتے کوئی گاہک کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ اپنے عمدہ مال کو لاجواب نایاب وغیرہ کہنا بیجا نہیں۔ اپنی

دولت آب حیات، اکسیر زندگی بخش، تیر بہدف جو بھی چاہیں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔ کسی واعظ سے پوچھو، کسی وکیل سے پوچھو، کسی مضمون نگار سے پوچھو۔ سبھی ایک آواز سے یہی کہیں گے کہ تمکّن، امیری اور کامیابی مترادف ہیں۔ یہ وہم ہے کہ مصیبت ہی کو نیکی کی کسوٹی سمجھا جاتا ہے۔ اب تو نہیں یقین ہوگیا کہ وہ زمین مل جائیگی؟

جان سیوک۔ جی ہاں، اب کوئی شبہ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر انھوں نے پربھو سیوک کو پکارا۔ اور حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔ بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ذرا پانڈے پور کیوں نہیں چلے جاتے۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو میں کہاں تک تمہاری مدد کرتا رہوں گا۔

پربھو سیوک۔ مجھے جانے میں کوئی عذر نہیں مگر اس وقت مجھے صوفی کے پاس جانا ہے۔

جان سیوک۔ پانڈے پور سے لوٹتے ہوئے صوفی کے پاس بہت آسانی سے جا سکتے ہو۔

پربھو سیوک۔ میں صوفی سے ملنا زیادہ ضروری خیال کرتا ہوں۔

جان سیوک۔ تمہارے روز روز ملنے سے کیا فائدہ جب تم آج تک اسے یہاں لانے میں کامیاب نہ ہو سکے؟

پربھو سیوک کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے نکلتے رہ گئے۔ "ماما نے جو آگ لگا دی ہے وہ میرے بجھاتے نہیں بجھ سکتی"۔ وہ فوراً اپنے کمرہ میں گئے۔ کپڑے پہنے اور اسی وقت طاہر علی کے ساتھ پانڈے پور جانے کو تیار ہوگئے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ زمین سے آگ کی لپٹ نکل رہی

اور سورداس میں بھی ہنگامہ آمائی ہوئی۔ بڑھیا دوپہر کو نہائی تھی۔ سوبھاگی اُس کی دھوتی دھونا بھول گئی۔ گرمی کا موسم تھا ہی۔ رات کو پھر بڑھیا کو پھر گرمی معلوم ہوئی۔ گرمیوں میں روز دو مرتبہ نہاتی تھی اور جاڑوں میں دو مہینے میں ایک مرتبہ۔ جب وہ نہا کر دھوتی مانگنے لگی تو سوبھاگی کو یاد آئی۔ بیچ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ ہاتھ جوڑ کر بولی " اماں! آج دھوتی دھونے کو بھول گئی۔ تم ذرا دیر میری دھوتی پہن لو۔ میں ابھی سے دھو کر ابھی سکھائے دیتی ہوں "۔

بڑھیا اس قدر متحمل مزاج نہ تھی۔ اُس نے بہو کو ہزاروں گالیاں دیں اور گیلی دھوتی پہنے بیٹھی رہی۔ اتنے میں بھیرو دکان سے آیا۔ اور سوبھاگی سے بولا " جلدی کھانا لا۔ آج سنگت ہونے والی ہے۔ آؤ اماں! تم بھی کھا لو "۔

بڑھیا بولی۔ نہا کر گیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہوں۔ اب اپنے ہاتھوں دھوتی دھو لیا کروں گی۔

بھیرو۔ کیا اس نے دھوتی نہیں دھوئی؟

بڑھیا۔ وہ اب میری دھوتی کیوں دھونے لگی؟ گھر کی مالکن ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ ایک روٹی کھانے کو دے دیتی ہے۔

سوبھاگی نے بہت کچھ معذرت کی پر بھیرو نے ایک نہ سنی۔ ڈنڈا لے کر مارنے دوڑا۔ سوبھاگی بھاگی اور آ کر سورداس کے گھر میں گھس گئی۔ پیچھے پیچھے بھیرو بھی وہیں پہنچا۔ جھونپڑے میں گھسا اور چاہتا تھا کہ سوبھاگی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے کہ سورداس اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا " کیا بات ہے بھیرو! اسے کیوں مار رہے ہو؟ "

بھیرو گرم ہوکر بولا "دروازہ سے ہٹ جاؤ نہیں تو پہلے تمہاری ہی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ ساری بگلا بھگتی نکل جائے گی۔ بہت دنوں سے تمہارا رنگ دیکھ رہا ہوں۔ آج ساری کسر نکال لوں گا"۔

سورداس۔ تم نے میرا کیا رنگ دیکھا؟ بس یہی نا کہ میں نے سو بھاگی کو گھر سے نکال نہیں دیا؟

بھیرو۔ بس اب چپ ہی رہنا۔ ایسے پاپی نہ ہوتے تو بھگوان نے آنکھیں کیوں پھوڑ دی ہوتیں؟ بھلا چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ جاؤ۔

سورداس۔ میرے گھر میں تم اُسے نہ مارنے پاؤ گے۔ یہاں سے چلی جائے تو جتنا چاہے مار لینا۔

بھیرو۔ ہٹتا ہے آگے سے کہ نہیں؟

سورداس۔ میں اپنے گھر میں یہ اودھم نہ مچانے دوں گا۔

بھیرو نے غصہ میں آکر سورداس کو دھکّا دیا۔ بیچارہ بے سہارے کھڑا تھا گر پڑا۔ پر پھر اُٹھا اور بھیرو کی کمر پکڑ کر بولا "اب چپکے سے چلے جاؤ نہیں تو اچھا نہ ہوگا"۔

سورداس تھا تو دُبلا پتلا پر اُس کی ہڈیاں لوہے کی تھیں۔ بادل بوندی۔ سردی گرمی جھیلتے جھیلتے اُس کے اعضا سخت اور مضبوط ہو گئے تھے۔ بھیرو کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا کوئی آہنی شکنجہ ہے۔ بہت زور مارتا تھا مگر شکنجہ ذرا ڈھیلا نہ ہوتا تھا۔ سو بھاگی نے موقع پایا تو بھاگی۔ اب بھیرو زور زور سے گالیاں دینے لگا۔ محلہ والے یہ شور سُن کر آ پہنچے۔

نایک رام نے مذاقاً کہا "کیوں سورداس۔ اچھی صورت دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں کیا؟ مجھے ہی ہیں؟"

سور داس - پنڈا جی تمہیں دل لگی سوجھی ہے اور یہاں منہ میں کالکھ لگائی جا رہی ہے۔ اندھا تھا اپاہج تھا۔ بھکاری تھا۔ نیچ تھا۔ پر چوری بدمعاشی کے الجام (الزام) سے تو بچا ہوا تھا۔ آج وہ الجام بھی لگ گیا۔

بجرنگی - آدمی جیسا آپ ہوتا ہے ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتا ہے ٭

بھیرو - تم کہاں کے بڑے سادھو ہو؟ ابھی آج ہی لاٹھی چلا کر آئے ہو۔ میں دو سال سے دیکھ رہا ہوں۔ میری گھر والی اس سے آ کر اکیلے میں گھنٹوں باتیں کرتی ہے۔ جگدھر نے بھی اُس کو یہاں سے رات میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ آج ابھی اُسی کے پیچھے مجھ سے یہ لڑنے پر تیار تھا ٭

نایک رام - شبہ ہونے کی بات ہی ہے۔ اندھا آدمی دیوتا تھوڑا ہی ہوتا ہے اور پھر دیوتا لوگ بھی تو کام دیو کے بان سے نہیں بچے۔ سور داس تو پھر بھی آدمی ہے اور ابھی عمر ہی کیا ہے ٭

ٹھاکر دین - مہاراج! کیوں اندھے کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ چلو کچھ بھجن کیرتنا ہو ٭

نایک رام - تمہیں بھجن کی سوجھتی ہے یہاں ایک بھلے آدمی کی عزت کا معاملہ آ پڑا ہے۔ بھیرو ہماری ایک بات مانو تو کہیں۔ تم سو بھاگی کو مارتے بہت ہو اس سے اُس کا دل تم سے نہیں ملتا۔ ابھی دوسرے دن باری آتی ہے۔ اب مہینہ میں دو بار سے زیادہ نہ آنے پاوے ٭

بھیرو دیکھ رہا تھا کہ مجھے لوگ بنا رہے ہیں۔ بگڑ کر بولا۔ اپنی عورت ہے مارتے پیٹتے ہیں تو کسی کا ساجھا ہے؟ جو گھوڑے پر کبھی سوار ہی نہیں ہوا وہ دوسرے کو سوار ہونا کیا سکھائے گا؟ وہ کیا جانے

عورت کیسے قابو میں رہتی ہے؟

یہ طنز نایک رام پر تھا۔ جس کی شادی ہنوز نہیں ہوئی تھی گھر میں دولت تھی۔ ججمانوں کی بدولت کسی بات کی فکر نہ تھی پھر بھی نہ جانے کیوں اُس کی شادی ابھی تک نہ ہوئی تھی۔ وہ ہزار پانچسو روپے سے غم کھانے کو تیار رہتا لیکن کہیں ڈول نہ لگتا تھا۔ بھیرو نے سمجھا تھا نایک رام دل میں کٹ جائیں گے مگر وہ چھنٹا ہوا شہری گُنڈا ایسے طنزوں کو کب خیال میں لاتا تھا۔ بولا۔ "کہو بجرنگی! اس کا کچھ جواب دو۔ عورت کیسے بس میں رہتی ہے؟"

بجرنگی۔ ما پیٹ سے ننھا سا لڑکا تو بس میں آتا ہی نہیں۔ عورت کیا بس میں آئے گی؟

بھیرو۔ بس میں کرانے عورت کا باپ۔ عورت کس کھیت کی مولی ہے مار سے تو بھوت بھاگتا ہے۔

بجرنگی۔ تو عورت بھی بھاگ جائے گی مگر قابو میں نہ آئے گی۔

نایک رام۔ بہت اچھی کہی بجرنگی۔ بہت پکی کہی۔ واہ واہ۔ مار سے بھوت بھاگتا ہے تو عورت بھی بھاگ جائے گی۔ اب تو کٹ گئی تمہاری بات۔

بھیرو۔ بات کیا کٹ جائے گی دل لگی ہے؟ چُونے کو جتنا ہی کوٹو اتنا ہی چمٹتا ہے۔

جگدھر۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ عورت اپنی طبیعت سے بس میں آتی ہے اور کسی طرح نہیں۔

نایک رام۔ کیوں بجرنگی۔ نہیں ہے کوئی جواب؟

ٹھاکردین۔ پنڈا جی۔ تم دونوں کو لڑا کر تبھی آرام لوگے۔ بیچارے اپاہج آدمی کے پیچھے پڑے ہو۔

نایک رام۔ تم سورداس کو کیا سمجھتے ہو؟ یہ دیکھنے ہی میں اتنے دُبلے ہیں۔ ابھی ہاتھ ملاؤ تو معلوم ہو۔ بھیرو! اگر انہیں پچھاڑ دو تو پانچ روپے انعام دوں۔

بھیرو۔ نکل جاؤ گے۔

نایک رام۔ نکلنے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ یہ دیکھو ٹھاکردین کے ہاتھ میں رکھے دیتا ہوں۔

جگدھر۔ کیا تاکتے ہو بھیرو؟ لے پڑو۔

سورداس۔ میں نہیں لڑتا۔

نایک رام۔ سورداس دیکھو نام ہنسائی مت کراؤ۔ مرد ہو کر لڑنے سے ڈرتے ہو۔ ہار ہی جاؤ گے یا اور کچھ؟

سورداس۔ لیکن بھائی میں داؤں پیچ نہیں جانتا۔ پیچھے سے یہ نہ کہنا کہ ہاتھ کیوں پکڑا۔ میں جیسے چاہوں گا لڑوں گا۔

جگدھر۔ ہاں ہاں تم جیسے چاہنا ویسے لڑنا۔

سورداس۔ اچھا تو آؤ۔ کون آتا ہے؟

نایک رام۔ اندھے آدمی کا جیوٹ دیکھنا۔ چلو بھیرو۔ آؤ میدان میں۔

بھیرو۔ اندھے سے کیا لڑوں!

نایک رام۔ بس اسی پر اتنا اکڑتے تھے؟

جگدھر۔ نکل آؤ بھیرو۔ ایک جھپٹ میں تو مار لوگے۔

بھیرو۔ تمہیں کیوں نہیں لڑ جاتے؟ تمہیں انعام لے لینا۔

جگدھر کو روپیوں کی ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ کنبہ بڑا ہونے کے سبب کسی طرح پورا نہ پڑتا تھا۔ گھر میں ایک نہ ایک چیز گھٹی ہی رہتی تھی۔ روپیہ کمانے کی کسی تدبیر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔ بولا "کیوں سورداس! ہم سے لڑوگے؟"

سورداس۔ تمہیں آجاؤ۔ کوئی سہی۔

جگدھر۔ کیوں پنڈا جی انعام دوگے نا؟

نایک رام۔ انعام تو بھیرو کے لئے تھا۔ لیکن کوئی ہرج نہیں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ ایک ہی جھپٹ میں گرا دو۔

جگدھر نے دھوتی اوپر چڑھا لی اور سورداس سے لپٹ گیا۔ سورداس نے اُس کی ایک ٹانگ پکڑ لی۔ اور اتنے زور سے کھینچا کہ جگدھر دھم سے گر پڑا۔ چاروں طرف سے تالیاں بجنے لگیں۔ بجرنگی بولا "واہ سورداس واہ"۔ نایک رام نے دوڑ کر اُس کی پیٹھ ٹھونکی۔

بھیرو۔ مجھے تو کہتے تھے ایک ہی جھپٹ میں گرا دوگے۔ اب تم کیسے گر گئے؟

جگدھر۔ سورداس نے ٹانگ پکڑ لی نہیں تو کیا گرا دیتا۔ وہ اڑنگا مارتا کہ چاروں شانے چت گرجاتا۔

نایک رام۔ اچھا تو ایک بازی اور ہو جائے۔

جگدھر۔ ہاں ہاں۔ اب کی دیکھنا۔

دونوں سورماؤں نے پھر زور آزمائی شروع کی۔ سورداس نے اب کے جگدھر کا ہاتھ پکڑ کر اتنے زور سے اینٹھا کہ وہ آہ آہ کرتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ سورداس نے فوراً اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور گردن پکڑ کر دونوں

ہاتھوں سے ایسا دبوچا کہ جگدھر کی آنکھیں نکل آئیں۔ نایک رام نے
دوڑ کر سورداس کو ہٹا دیا۔ بجرنگی نے جگدھر کو اٹھا کر بٹھایا اور ہوا کرنے
لگا۔ بھیرو نے بگڑ کر کہا "یہ کوئی کشتی ہے کہ جہاں پکڑ پایا وہیں دھر
دبایا۔ یہ تو گنواروں کی لڑائی ہے کشتی تھوڑا ہی ہے"۔

نایک رام۔ یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔

جگدھر سنبھل کر اٹھ بیٹھا اور چپکے سے سرک گیا۔ بھیرو بھی اس
کے پیچھے چلتا ہوا۔ ان کے جانے کے بعد وہاں خوب قہقہے پڑے۔ اور
سورداس کو خوب شاباشی دی گئی۔ سب کو تعجب تھا کہ سورداس
جیسا نحیف شخص جگدھر جیسے موٹے تازے آدمی کو کس طرح دبا بیٹھا۔
ٹھاکر دین جادو منتر کا قایل تھا بولا "سورداس پر ضرور کسی دیوتا کا سایہ
ہے۔ ہم کو بھی بتاؤ۔ سورداس! کون سا منتر جگایا تھا؟"

سورداس۔ سو منتروں کا منتر ہے ہمت۔ یہ روپے جگدھر کو دے
دینا نہیں تو میری بھلائی نہیں ہے۔

ٹھاکر دین۔ روپے کیوں دے دوں؟ کوئی لوٹ ہے؟ تم نے باجی
(بازی) ماری ہے۔ تمہیں کو ملیں گے۔

نایک رام۔ اچھا سورداس! ایمان سے بتا دو۔ سوبھاگی کو کس منتر
سے بس میں کیا؟ اب تو یہاں سب لوگ اپنے ہی ہیں۔ کوئی دوسرا
نہیں ہے۔ میں بھی کہیں کا نیا لگاؤں۔

سورداس نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "پنڈا جی۔ اگر تم بھی مجھ سے
ایسی باتیں کرو گے تو میں منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں گا۔ میں پرائی
عورت کو اپنی ماں۔ بہن یا بیٹی سمجھتا ہوں۔ جس دن میرا من اتنا چنچل

ہو جائے گا۔ اُس دن تم مجھے جیتا نہ دیکھو گے" یہ کہہ کر سورداس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ذرا دیر میں آواز سنبھال کر بولا" بھیرو ورنہ اُس کو مارتا ہے۔ بیچاری کبھی کبھی میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ میرا قصور اتنا ہی ہے کہ میں اُس کو دُھتکار نہیں دیتا۔ اس کے لئے چاہے کوئی مجھ کو بدنام کرے چاہے جو الزام لگائے۔ میرا جو دھرم تھا وہ میں نے کیا۔ بدنامی کے ڈر سے جو آدمی دھرم سے منہ پھیر لے وہ آدمی نہیں ہے"۔

بجرنگی۔ تمہیں ہٹ جانا تھا۔ اُس کی عورت تھی۔ مارتا چاہے پیٹتا تم سے مطلب؟

سورداس۔ بھیّا! آنکھوں دیکھ کر نہیں رہا جاتا۔ یہ تو سنسار کا بیوہار ہے۔ پر اتنی سی بات پر کوئی اتنا بڑا کلنک تو نہیں لگا دیتا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ آج مجھے جتنا دُکھ ہو رہا ہے اُتنا دادا کے مرنے پر بھی نہ ہوا تھا۔ میں اپاہج دوسروں کے ٹکڑے کھانے والا اور مجھ پر یہ کلنک! (رونے لگا)۔

نایک رام۔ تو روتے کیا ہو۔ بھلے آدمی! اندھے ہو تو کیا مرد نہیں ہو؟ مجھ پر تو کوئی ایسا کلنک لگاتا تو میں اور خوش ہوتا۔ یہ ہزاروں آدمی جو تیرتھ کے گنگا نہانے جاتے ہیں۔ وہاں نظر بازی کے سوا اور کیا کرتے ہیں؟ مندروں میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ میلوں ٹھیلوں میں بھی یہی بہار رہتی ہے۔ یہی تو مردوں کا کام ہے۔ اب سرکار کے راج میں لاٹھی تلوار کا تو کہیں نام نہیں رہا۔ ساری مردی اسی نظر بازی میں رہ گئی ہے اس کی کیا چنتا (فکر) چلو بھگوان کا بھجن کرو۔ سب دُکھ دور ہو جائے گا۔

بجرنگی کو اندیشہ تھا" آج کی مار پیٹ کا نہ جانے کیا پھل ہو۔ کل

پولیس دروازہ پر آ جائے گی۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔" نایک رام نے تشفی کی: "بھلے آدمی! پولیس سے کیا ڈرتے ہو؟ کہو تھانہ دار کو بلا کر نچاؤں۔ کہو انسپکٹر کو بلا کر پچھاڑوں۔ بیفکر رہو۔ کچھ نہ ہونے پائے گا۔ تمہارا بال بھی بانکا ہو جائے تو میرا ذمہ۔"

ہر سہ اشخاص یہاں سے چلے۔ دیاگر پہلے ہی سے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کئی گاڑی بان اور بنئے بھی آ بیٹھے تھے۔ ذرا دیر میں بھجن کی تانیں اُٹھنے لگیں۔ سورداس اپنے تفکرات بھول گیا۔ مست ہو کر گانے لگا۔ کبھی وجد میں آکر ناچتا۔ اُچھلنے کودنے لگتا۔ کبھی روتا اور کبھی ہنستا۔ محفل برخاست ہوئی تو سب لوگ خوش تھے۔ دل صاف تھے۔ کدورت مٹ گئی تھی۔ گویا کسی دلکش فضا کی سیر کر کے آئے ہوں۔ سورداس تو مندر کے چبوترے ہی پر لیٹا۔ باقی لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد سورداس کو انہیں تفکرات نے پھیر آ گھیرا۔ "میں کیا جانتا تھا کہ بھیرو کے دل میں میری طرف سے اتنا میل ہے نہیں تو سوبھاگی کو اپنے جھونپڑے میں آنے ہی کیوں دیتا۔ جو سُنے گا وہی مجھ پر تھوکے گا۔ لوگوں کو ایسی باتوں پر کتنی جلد ہی یقین ہو جاتا ہے۔ محلہ میں کوئی اپنے دروازہ پر کھڑا نہ ہونے دے گا۔ اُونہہ! بھگوان تو سب کے من کی بات جانتے ہیں۔ آدمی کا دھرم ہے کہ جب کسی کو دکھ میں دیکھے تو اُسے تسلی دے۔ اگر اپنا دھرم پالنے میں بھی کلنک لگتا ہے تو بھلے ہی لگے۔ اس کے لئے کہاں تک روؤں؟ کبھی نہ کبھی تو لوگوں کو میرے دل کا حال معلوم ہی ہو جائے گا۔"

مگر جگدھر اور بھیرو دونوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جگدھر کہتا تھا: "میں نے تو سمجھا تھا کہ پانچ روپے سہج ہی مل جائینگے

نہیں تو کیا کُتّے نے کاٹا تھا کہ اُس سے بھڑنے جاتا۔ آدمی کا ہیکلو ہے۔ لوہا ہے"۔

بھیرو۔ میں اُس کی طاقت آزما چکا ہوں۔ ٹھاکر دین سچ کہتا ہے۔ اُسے کسی دیوتا کا اِشت ہے۔

جگدھر۔ اِشت وِشت کچھ نہیں۔ یہ سب بیفکری ہے۔ ہم تم گرہست کے جنجال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نمک تیل۔ لکڑی کی فکر سر پر سوار رہتی ہے۔ گھاٹے نفع کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ اُس کو کون فکر ہے؟ مزہ سے جو کچھ مل جاتا ہے کھاتا ہے اور میٹھی نیند سوتا ہے۔ ہم کو تم کو روٹی دال بھی دونوں بکھت (وقت) نصیب نہیں ہوتی۔ اُسے کیا کمی ہے؟ کسی نے چاول دئے۔ کہیں سے مٹھائی پا گیا۔ کبھی دودھ بجرنگی کے گھر سے مل ہی جاتا ہے۔ بل تو کھانے سے ہوتا ہے۔

بھیرو۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ نشہ کھانے سے بل کا ناس ہو جاتا ہے۔

جگدھر۔ کیسی اُلٹی باتیں کرتے ہو۔ ایسا ہوتا تو فوج میں گوروں کو برانڈی کیوں پلائی جاتی؟ انگریز سبھی شراب پیتے ہیں تو کیا کمزور ہوتے ہیں؟

بھیرو۔ آج سوبھاگی آئے گی تو گلا گھونٹ دوں گا۔

جگدھر۔ کسی کے گھر میں چھپی بیٹھی ہوگی۔

بھیرو۔ اندھے نے میری آبرو بگاڑ دی۔ برادری میں یہ بات پھیلے گی تو حقہ بند ہو جائے گا۔ بھوج دینا پڑے گا۔

جگدھر۔ تمہیں تو ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو۔ یہ نہیں ٹکنی کھائی تھی۔ تو چپکے سے گھر چلے آتے۔ سوبھاگی گھر آتی تو اُس سے سمجھ لیتے۔ تم

لگے وہیں دُہائی دینے ؛

بھیرو۔ اِس اندھے کو میں ایسا کپٹی نہ سمجھتا تھا نہیں تو اب تک کبھی اُس کو مزہ چکھا چکا ہوتا۔ اب اُس چڑیل کو گھر میں نہ رکھوں گا۔ چمار کے ہاتھوں یہ بے آبروئی!

جگدھر۔ اب اس سے بڑی اور کیا بدنامی ہوگی؟ گلا کاٹنے کا کام کیا ہے ؛

بھیرو۔ بس یہی جی میں آتا ہے کہ چل کر ایک گنڈاسہ مار کر کام تمام کر دوں۔ لیکن نہیں۔ میں اُسے گھلا گھلا کر ماروں گا۔ سو بھاگی کا دُکھ نہیں ہے۔ سارا طوفان اِسی حبشی اندھے کا کھڑا کیا ہوا ہے ؛

جگدھر۔ دُکھ دونوں کا ہے ؛

بھیرو۔ لیکن چھیڑ چھاڑ تو پہلے مرد ہی کرتا ہے۔ اُس سے تو اب مجھے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ جہاں چاہے جائے۔ جیسے چاہے رہے۔ مجھے تو اب اِسی اندھے سے بھگتنا ہے۔ صورت سے کیسا گریب (غریب) جان پڑتا ہے جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔ اور من میں اتنا کپٹ بھرا ہُوا ہے۔ بھیک مانگتے دن جاتے ہیں اس پر بھی ابھاگی کی آنکھیں نہیں کھلتیں جگدھر! اس نے میرا سر نیچا کر دیا۔ میں دوسروں پر ہنسا کرتا تھا۔ اب دنیا مجھ پر ہنسے گی۔ مجھے سب سے بڑا ملال تو یہ ہے کہ ابھاگن گئی بھی تو چمار کے ساتھ گئی۔ اگر کسی ایسے آدمی کے ساتھ جاتی جو جات پات میں دیکھنے سُننے میں۔ دھن دولت میں مجھ سے بڑھ کر ہوتا تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔ جو سُنے گا اپنے من میں یہی کہے گا کہ میں اس اندھے سے بھی گیا بیتا ہوں ؛

جگدھر۔ عورتوں کا سو بھاؤ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہیں تو کہاں تم اور کہاں وہ اندھا۔ منہ پر مکھیاں بھنکا کرتی ہیں معلوم ہوتا ہے۔ جوتے کھا کر آیا ہے ؞

بھیرو۔ اور بھیا کتنا بڑا ہے۔ بھیک مانگتا ہے۔ اندھا ہے ؞ جب دیکھو ہنستا ہی رہتا ہے۔ میں نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا ؞

جگدھر۔ گھر میں روپے گڑے ہیں۔ روئے اُس کی بلا۔ بھیک تو دکھانے کو مانگتا ہے ؞

بھیرو۔ اب روئے گا۔ ایسا رُلاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا ؞

یوں باتیں کرتے کرتے دونوں اپنے اپنے گھر گئے۔ رات کو دو بجے ہوں گے کہ یکایک سورداس کی جھونپڑی سے آگ کا شعلہ بلند ہوا۔ لوگ اپنے اپنے دروازوں پر سورہے تھے۔ حالتِ خواب میں بھی باطنی حواس بیدار رہتے ہیں۔ دم کے دم میں سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ آسمان پر سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ شعلے لپک لپک کر آسمان کی طرف دوڑنے لگے۔ کبھی اُن کی صورت کسی مندر کے سنہرے کلس کی سی ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ ہوا کے جھونکوں سے اس طرح کانپنے لگتے تھے جیسے پانی میں چاند کا عکس۔ آگ بجھانے کی تدبیر کی جا رہی تھی۔ لیکن جھونپڑے کی آگ آتشِ حسد کی طرح کبھی نہیں بجھتی۔ کوئی پانی لا رہا تھا۔ کوئی یوں ہی شور مچا رہا تھا۔ لیکن زیادہ تر لوگ خاموش کھڑے مایوسانہ نظروں سے یہ آگ کا جلنا دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی عزیز یا دوست کی چتا کی آگ ہو۔ دفعتاً سورداس دوڑا ہوا آیا اور چپ چاپ آگ کی روشنی میں کھڑا ہو گیا۔ بجرنگی نے پوچھا۔ "یہ آگ کیسے لگی۔ سورداس؟ "چولھے

ہیں تو آگ نہیں چھوڑ دی تھی؟
سورداس۔ جھونپڑے میں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟
بجرنگی۔ اب تو اندر باہر سب ایک ہو گیا۔ دیواریں جل رہی ہیں۔
سورداس۔ کسی طرح بھی نہیں جا سکتا؟
بجرنگی۔ کیسے جاؤ گے؟ دیکھتے نہیں ہو۔ یہاں تک لپٹیں آ رہی ہیں؟
جگدھر۔ سورداس! کیا آج چولھا نہیں ٹھنڈا کیا تھا؟
نایک رام۔ چولھا ٹھنڈا کیا ہوتا تو دشمنوں کا کلیجا کیسے ٹھنڈا ہوتا؟
جگدھر۔ پنڈا جی! میرا لڑکا کام نہ آئے۔ اگر مجھے کچھ بھی معلوم ہو۔ تم مجھ پر ناحق شبہ کرتے ہو۔
نایک رام۔ میں جانتا ہوں جس نے آگ لگائی ہے۔ بگاڑ نہ دوں تو کہنا۔
ٹھاکردین۔ تم کیا بگاڑو گے؟ بھگوان آپ ہی بگاڑ دیں گے۔ اسی طرح جب میرے گھر میں چوری ہوئی تھی تو سب سواہا ہو گیا تھا۔
جگدھر۔ جس کے من میں اتنی کھوٹ ہو۔ بھگوان اُس کا ستیاناس کر دیں۔
سورداس۔ اب تو لپٹ نہیں آتی؟
بجرنگی۔ ہاں پھوس جل گیا ہے اب دھرن جل رہی ہے۔
سورداس۔ اب تو اندر جا سکتا ہوں؟
نایک رام۔ اندر تو جا سکتے ہو پر باہر نہیں نکل سکتے۔ اب چلو آرام سے سو رہو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ پچھتانے سے کیا ہو گا؟
سورداس۔ ہاں سو رہوں گا۔ جلدی کیا ہے؟

تھوڑی دیر میں بکھی پکھی آگ بھی بجھ گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اور کسی کے گھر میں آگ نہیں لگی۔ سب لوگ اس سانحہ پر رائے زنی کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ سناٹا چھا گیا۔ لیکن سودو اس اب بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے جھونپڑے کے جل جانے کا غم نہ تھا۔ برتن وغیرہ کے بھی جل جانے کا غم نہ تھا۔ غم تھا اُس پوٹلی کا جو اُس کی عمر بھر کی کمائی تھی جس پر اُس کی زندگی کی ساری تمناؤں کا انحصار تھا۔ جو اس کی ساری تکلیفوں اور التجاؤں کا ماحصل تھی۔ یہ چھوٹی سی پوٹلی اُس کی اُس کے بزرگوں کی۔ اُس کے نام لیوا لوگوں کی نجات کا ذریعہ تھی۔ یہی اُس کے لوک اور پرلوک۔ دین و دنیا کی امیدوں کی شمع فروزاں تھی۔ اُس نے سوچا۔ پوٹلی کے ساتھ روپے تھوڑے ہی جل ہو گئے ہوں گے۔ اگر روپے پگھل بھی گئے ہوں گے۔ تو چاندی کہاں جائے گی؟ کیا جانتا تھا کہ آج یہ آفت آنے والی ہے نہیں تو یہیں نہ سوتا۔ پہلے تو کوئی جھونپڑی کے پاس آتا ہی نا۔ اور اگر آگ لگاتا۔ تو پوٹلی کو پہلے ہی نکال لیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں روپیوں کو رکھنا ہی نہ چاہئے تھا۔ پر رکھتا کہاں؟ محلہ میں ایسا کون ہے جسے رکھنے کو دیتا؟ ہائے پورے پانچ سو روپے تھے! کچھ پیسے اوپر ہو گئے تھے۔ کیا اسی دن کے لئے پیسے پیسے بٹور رہا تھا؟ کھا لیا ہوتا تو کچھ تسکین ہوتی۔ کیا سوچتا تھا اور کیا ہوا۔ گیا جی جا کر پتروں کو پنڈ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اب اُن سے کیسے گلا چھوٹے گا؟ سوچتا تھا کہیں متھوا کی سگائی ٹھہر جائے تو کر ڈالوں۔ بہو گھر میں آ جائے تو ایک روٹی کھانے کو ملے۔ اپنے ہاتھوں ٹھونک ٹھونک کر کھاتے ایک جگ بیت گیا۔ بڑی بھول ہوئی۔ چاہئے تھا کہ جیسے جیسے

نہ میں رو پے آتے ایک ایک کام پورا کرتا جاتا۔ بہت پاؤں پھیلانے
یہی پھل ہے۔"

اس وقت تک راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ سورداس اٹکل سے دروازہ
طرف سے جھونپڑی میں گھسا۔ پر دو تین قدم کے بعد دفعتاً پاؤں
مو بل میں پڑ گیا۔ اوپر راکھ تھی لیکن نیچے آگ۔ سورداس نے فوراً
ؤں کھینچ لیا اور اپنی لکڑی سے راکھ کو اُلٹنے پلٹنے لگا کہ نیچے کی آگ
جلد راکھ ہو جائے۔ آدھ گھنٹہ میں اُس نے ساری آگ نیچے سے اوپر
دی اور پھر ڈرتے ڈرتے راکھ میں پیر رکھا۔ راکھ گرم تھی مگر ناقابل
داشت نہ تھی۔ اُس نے ٹھیک اسی مقام کی سیدھ میں راکھ کو ٹٹولنا
روع کیا جہاں چھپر میں پوٹلی رکھی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔
س کو یقین تھا کہ روپے ملیں یا نہ ملیں پر چاندی تو کہیں گئی ہی نہیں
ہے۔ یکا یک وہ اُچھل پڑا۔ کوئی بھاری چیز ہاتھ لگی اُسے اٹھا لیا۔ پر
ٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اینٹ کا ٹکڑا ہے۔ پھر ٹٹولنے لگا۔ جیسے
وئی شخص پانی میں مچھلیاں ٹٹولے۔ کوئی چیز ہاتھ نہ لگی۔ پھر تو اس
نے مایوسانہ عجلت اور اضطراب کے ساتھ ساری راکھ چھان ڈالی۔ ایک
یک مٹھی راکھ ہاتھ میں لے کر دیکھی۔ لوٹا ملا۔ توا ملا پر پوٹلی نہ ملی۔ اس کا
پیر جو اب تک سیڑھی پر تھا پھسل گیا اور اب وہ اتھاہ گہرائی میں
جا پڑا۔ اُس کے منہ سے دفعتاً ایک چیخ نکل گئی۔ وہ وہیں راکھ پر بیٹھ گیا
اور زار و قطار رونے لگا۔ یہ پھوس کی راکھ نہ تھی۔ اس کی تمناؤں کی
راکھ تھی۔ اپنی بے بسی پر اُس کو اتنا رنج کبھی نہ ہوا تھا۔

تڑکا ہو گیا۔ سورداس اب راکھ کے ڈھیر کو سمیٹ کر ایک جگہ جمع

کر رہا تھا۔ اُمید سے زیادہ سخت جان اور کوئی چیز دنیا میں نہیں ہوتی؟
اسی وقت جگدھر آ کر بولا "سورداس سچ کہنا تمہیں مجھ پر تو شبہ نہیں ہے؟"

سورداس کو شبہ تو تھا پر اُس نے اِسے چھپا کر کہا "تمہارے اوپر کیوں شبہ کروں گا۔ تم سے میری کون سی عداوت تھی؟"
جگدھر۔ محلہ والے تمہیں بھڑکائیں گے۔ پر میں بھگوان کو ساکھی بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتا ؛
سورداس۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ کون جانے کسی نے لگا دی یا کسی کی چلم سے اُڑ کر لگ گئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چولھے میں آگ رہ گئی ہو۔ بِنا جانے بُوجھے کس پر سُبھا کروں؟
جگدھر۔ اِسی سے تمہیں جتا دیا کہ کہیں سُبھے میں میں بھی نہ مارا جاؤں؟
سورداس۔ تمہاری طرف سے میرا دل صاف ہے ؛

جگدھر کو بھیرو کی باتوں سے اب یقین ہو گیا کہ یہ اُسی کی شرارت ہے۔ اُس نے سورداس کو رُلانے کی بات کہی تھی۔ اُس دھمکی کو اس طرح پورا کیا۔ وہ یہاں سے سیدھا بھیرو کے پاس گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا تاڑی پی رہا تھا۔ لیکن چہرہ سے پریشانی اور بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ جگدھر کو دیکھتے ہی بولا "کچھ سُنا۔ لوگ کیا بات چیت کر رہے ہیں؟"
جگدھر۔ سب لوگ تمہارے اوپر سُبھا (شبہ) کرتے ہیں۔ نایک رام کی دھمکی تو تم نے اپنے کانوں سُنی ؛
بھیرو۔ مجھے ایسی دھمکیوں کی پرواہ نہیں ہے۔ ثبوت کیا ہے کہ میں نے

آگ لگائی؟

جگدھر۔ سچ کہو۔ تمہیں نے لگائی؟

بھیرو۔ ہاں چپکے سے ایک دیاسلائی لگا دی ÷

جگدھر۔ میں کچھ کچھ پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ پر یہ تم نے بُرا کیا۔ جھونپڑی جلانے سے کیا ملا؟ دو چار دن میں پھر دوسری جھونپڑی تیار ہو جائیگی؟

بھیرو۔ کچھ ہو۔ دل کی آگ تو ٹھنڈی ہوگئی۔ یہ دیکھو!

یہ کہہ کر اُس نے ایک تھیلی دکھائی جس کا رنگ دھوئیں سے سیاہ ہو گیا تھا ÷ جگدھر نے پوچھا "اس میں کیا ہے؟ ارے! اس میں تو روپے بھرے ہوئے ہیں"÷

بھیرو۔ یہ سو بھاگی کو بہکا لے جانے کا جریبانہ (جرمانہ) ہے ÷

جگدھر۔ سچ بتاؤ۔ یہ روپے کہاں ملے؟

بھیرو۔ اُسی جھونپڑی میں بڑے جتن سے دھرن کی آڑ میں رکھے ہوئے تھے ÷ پاجی روز راہگیروں کو ٹھگ ٹھگ کر پیسے لاتا تھا۔ اور اسی تھیلی میں رکھتا تھا۔ میں نے گِنے ہیں۔ پانچ سو روپے سے اوپر ہیں۔ نہ جانے کیسے اتنے روپے جمع ہو گئے۔ بچہ کو انہیں روپوں کی گرمی تھی۔ اب گرمی نکل گئی۔ اب دیکھوں کس بل پر اُچھلتے ہیں۔ برادری کو بھوج دینے کا سامان ہو گیا نہیں تو اِس بکھت (وقت) اتنے روپے کہاں ملتے؟ آج کل تو دیکھتے ہو۔ بلّم ٹیرُوں کے مارے بکری کتنی مندی ہے ÷

جگدھر۔ میری تو صلاح ہے کہ روپے اُس کو لوٹا دو۔ بڑی مسکّت (مشقت) کی کمائی ہے ہضم نہ ہوگی ÷

جگدھر دل کا کھوٹا نہیں تھا۔ پر اس وقت اس نے یہ صلاح

نیک نیتی سے نہیں حسد سے دی تھی۔ اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ بھیرو کے ہاتھ اتنے روپے لگ جائیں۔ بھیرو نصف روپے اُسے دے دیتا تو شاید اُس کو تسکین ہو جاتی۔ مگر بھیرو سے یہ امید نہ کی جا سکتی تھی۔ بے پروائی سے بولا "مجھے اچھی طرح ہجم (ہضم) ہو جائے گی۔ ہاتھ میں آتے ہوئے روپے کو لوٹا نہیں سکتا۔ اُس نے بھیک ہی مانگ کر تو جمع کیا ہے۔ گیہوں تو نہیں تولا تھا؟"

جگدھر۔ پولیس سب کھا جائے گی۔

بھیرو۔ سور داس پولیس میں نہ جائے گا۔ رو دھو کر چپ ہو رہیگا۔

جگدھر۔ گریب (غریب) کی ہائے بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔

بھیرو۔ وہ گریب ہے! اندھا ہونے ہی تے گریب ہو گیا؟ جو آدمی دوسروں کی عورتوں پر ڈورے ڈالے جس کے پاس سیکڑوں روپے جمع ہوں۔ جو دوسروں کو روپے اُدھار دیتا ہو۔ وہ گریب ہے؟ گریب جو کہو تو ہم تم ہیں۔ گھر بھر میں ڈھونڈ آؤ۔ ایک پورا روپیہ نہ نکلے گا۔ ایسے پاپیوں کو گریب نہیں کہتے۔ اب بھی میرے دل کا کانٹا نہیں نکلا۔ جب تک اُسے روتے نہ دیکھوں گا؟ یہ کانٹا نہ نکلے گا جس نے میری آبرو بگاڑ دی اُس کے ساتھ جو چاہے کروں۔ مجھے پاپ نہیں لگ سکتا۔

جگدھر کا دل آج خوانچہ لے کر گلیوں کا چکر لگانے میں نہ تھا۔ چھاتی پر سانپ لوٹ رہا تھا "اِسے دم کی دم میں اتنے روپے مل گئے۔ اب موج اُڑائے گا۔ تقدیر اس طرح کھلتی ہے۔ یہاں کبھی پڑا ہوا پیسہ بھی نہ ملا۔ پاپ پُن کی کوئی بات نہیں۔ میں ہی کون دن بھر پُن کیا کرتا ہوں۔

دمڑی - چھدام - کوڑیوں کے لئے ٹھینی مارتا ہوں۔ باٹ کھوٹے رکھتا ہوں
تیل کی مٹھائی کو گھی کی کہہ کر بیچتا ہوں - ایمان گنوانے پر بھی ہاتھ کچھ نہیں
آتا - جانتا ہوں یہ برا کام ہے۔ پر بال بچوں کو پالنا بھی تو ضروری ہے
اس نے ایمان کھو دیا تو کچھ لے کر کھویا - گناہ سے لذت نہیں رہا۔ اب وہ
تین دکانوں کا اور ٹھیکہ لے لے گا۔ ایسا ہی کوئی مال میرے ہاتھ بھی پڑ
جاتا تو جنم سپھل ہو جاتا۔"

جگدھر کے دل میں حسد نے جگہ کی۔ وہ بھیرو کے گھر سے لوٹا تو دیکھا
کہ سورداس راکھ بٹور کر اسے آٹا کی طرح گوندھ رہا ہے۔ سارا جسم راکھ
سے ڈھنکا ہوا ہے اور پسینہ خوب بہہ رہا ہے۔ بولا "سورداس! کیا
ڈھونڈتے ہو؟"

سورداس - کچھ نہیں - یہاں رکھتا ہی کیا تھا۔ یہی لوٹا تو ادیکھ رہا تھا۔

جگدھر - اور وہ تھیلی کس کی ہے جو بھیرو کے پاس ہے؟

سورداس چونکا - کیا اسی لئے بھیرو آیا تھا۔ ضرور یہی بات ہے۔
گھر میں آگ لگانے سے پہلے روپے نکال لئے ہوں گے۔

لیکن اندھے بھکاری کے لئے مفلسی اتنی شرم کی بات نہیں ہے
جتنی دولت مندی۔ سورداس جگدھر سے اپنے مالی نقصان کو پوشیدہ
رکھنا چاہتا تھا۔ وہ گیا کرنا چاہتا تھا۔ مٹھوا کا بیاہ کرنا چاہتا۔ کنواں بنوانا
چاہتا تھا۔ مگر اس انداز سے کہ لوگوں کو تعجب ہو کہ اس کے پاس روپے
کہاں سے آئے اور لوگ یہی سمجھیں کہ بھگوان ہی محتاجوں کی مدد کرتے ہیں
بھکاریوں کے لئے دولت کا جمع کرنا گناہ گاری سے کم ذلت کی بات
نہیں ہے۔ بولا "میرے پاس تھیلی ویلی کہاں؟ ہوگی کسی کی تھیلی ہوتی

بھیک کیوں مانگتا؟

جگدھر۔ مجھ سے اڑتے ہو۔ بھیرو مجھ سے خود کہہ رہا تھا کہ جھونپڑے میں دھرن کے اوپر یہ تھیلی ملی۔ پانچسو روپے سے کچھ بیسی ہے۔

سورداس۔ وہ تم سے ہنسی کرتا ہوگا۔ ساڑھے پانچ روپے تو کبھی اکٹھے ہی نہیں ہوئے۔ ساڑھے پانچ سو کہاں سے آتے؟

اتنے میں سوبھاگی وہاں آپہنچی۔ رات بھر مندر کے پیچھے امرود کے باغ میں چھپی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آگ بھیرو نے لگائی ہے۔ بھیرو نے اس پر جو تہمت لگائی تھی۔ اس کی اسے خاص فکر نہ تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہ آئے گا۔ لیکن میری خاطر سورداس یوں تباہ ہوا۔ اس کا اسے بھی ملال تھا۔ وہ اس وقت اس کی تشفی کرنے آئی تھی۔ جگدھر کو وہاں کھڑے دیکھا تو جھجکتی۔ خوف ہوا کہ کہیں یہ مجھے پکڑ نہ لے۔ جگدھر کو یہ بھیرو ہی کا دوسرا اوتار سمجھتی تھی۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ اب بھیرو کے گھر نہ جاؤں گی۔ الگ رہوں گی۔ محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کروں گی۔ یہاں کون لڑکے رو رہے ہیں۔ ایک میرا ہی پیٹ اسے بھاری ہے نا؟ اب اکیلے ٹھونکے اور کھائے اور بڑھیا کے پاؤں دھو دھو کر پیئے۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنے دن ہوئے کبھی اس نے اپنی طبیعت سے دھیلے کا سیندور بھی لے کر نہ دیا ہوگا تو میں ہی کیوں اس کے لئے مروں؟

وہ پیچھے لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ جگدھر نے پکارا۔ "سوبھاگی! کہاں جاتی ہے؟ دیکھی اپنے خصم کی کرتوت۔ بیچارے سورداس کو کہیں کا نہ رکھا۔"

سو بھاگی نے سمجھا کہ مجھے جھانسہ دے رہا ہے۔ میرے پیٹ کی تھاہ لینے کے لئے یہ جال پھینکا ہے۔ طنز سے بولی "اُس کے گرو تو تمہیں ہی ہو۔ تمہیں نے منتر دیا ہوگا"۔

جگدھر۔ ہاں یہی میرا کام ہے۔ چوری ڈاکہ نہ سکھاؤں تو روٹیاں کیونکر چلیں؟

سبھاگی نے پھر طنز سے کہا "کیا رات تاڑی پینے کو نہیں ملی۔ کیا؟"

جگدھر۔ تاڑی کے بدلے کیا اپنا ایمان بیچ دوں گا؟ جب تک سمجھا تھا بھلا آدمی ہے۔ ساتھ بیٹھتا تھا۔ ہنستا بولتا تھا۔ تاڑی بھی پی لیتا تھا۔ کچھ تاڑی کے لالچ سے نہیں جاتا تھا (کیا کہنا ہے آپ ایسے ہی دھرماتما تو ہیں!) لیکن آج سے جو کبھی اُس کے ساتھ بیٹھتے دیکھنا تو کان پکڑ لینا۔ جو آدمی دوسروں کے گھر میں آگ لگائے غریبوں کے روپے چُرا لے جائے۔ وہ اگر میرا بیٹا بھی ہو تو اس کی صورت نہ دیکھوں۔ سورداس نے نہ جانے کتنے جتن سے پانچ سو روپے اکٹھے کئے تھے۔ وہ سب اُڑا لے گیا۔ کہتا ہوں۔ لوٹا دو تو لڑنے پر تیار ہوتا ہے!

سورداس۔ پھر وہی رٹ لگائے جاتے ہو۔ کہہ تو دیا کہ میرے پاس روپے نہیں تھے کسی اور جگہ سے مار لایا ہوگا۔ میرے پاس پانچ سو روپے ہوتے تو چین کی بنسی نہ بجاتا۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ کیوں پسارتا؟

جگدھر۔ سورداس! اگر تم بھری گنگا میں کہو کہ میرے روپے نہیں

ہیں تو میں نہ مانوں گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ تھیلی دیکھی ہے۔ بھیرو نے اپنے مُنہ سے کہا ہے کہ یہ تھیلی جھونپڑے میں دھرن کے اوپر ملی۔ تمہاری بات کیسے مان لیں ؟

سبھاگی۔ تم نے تھیلی دیکھی ہے ؟

جگدھر۔ ہاں دیکھی نہیں تو کیا جھوٹ بولتا ہوں ؟

سبھاگی۔ سورداس سچ سچ بتا دو۔ روپے تمہارے ہیں ؟

سورداس۔ پاگل ہو گئی ہے کیا ؟ ان کی باتوں میں آجاتی ہے۔ بھلا میرے پاس روپے کہاں سے آتے ؟

جگدھر۔ اِن سے پوچھو۔ روپے نہ تھے تو اس وقت راکھ بٹور کر کیا ڈھونڈ رہے تھے ؟

سُبھاگی نے سورداس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا اُس کی حالت اُس مریض کی سی تھی جو اپنے عزیزوں کی تسکین کے لئے اپنی ناقابل برداشت تکلیف کے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ جگدھر کے قریب آ کر بولی "روپے ضرور تھے۔ اُس کا چہرہ کہے دیتا ہے"

جگدھر۔ میں نے تھیلی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے "

سبھاگی۔ اب چاہے وہ مجھے مارے یا نکالے پر رہوں گی اُسی کے گھر میں۔ کہاں کہاں تھیلی کو چھپائے گا ؟ کبھی تو میرے ہاتھ لگے گی میرے ہی کارن اِن پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ میں نے ہی اُجاڑا ہے۔ میں ہی بساؤں گی۔ جب تک اس کے روپے نہ دلا دوں گی۔ مجھے چین نہ آئیگا یہ کہہ کر وہ سورداس سے بولی " تو اب رہو گے کہاں ؟"

سورداس نے یہ بات نہ سُنی۔ وہ سوچ رہا تھا "روپے میں لے

ہی تو کمائے تھے۔ کیا پھر نہیں کما سکتا؟ یہی ہوگا نا! کہ جو کام اس سال ہوتا وہ کچھ دنوں بعد ہوگا۔ میرے روپے تھے ہی نہیں۔ شاید اُس جنم میں میں نے بھیرو کے روپے چرائے ہوں گے۔ یہ اُسی کا ڈنڈ ملا ہے۔ مگر بیچاری سبھاگی کا اب کیا حال ہوگا؟ بھیرو اسے اپنے گھر میں کبھی نہ رکھے گا۔ بیچاری کہاں ماری ماری پھرے گی؟ یہ کلنک بھی میرے سر لگنا تھا کہیں کا نہ رہا۔ دھن گیا۔ گھر گیا۔ آبرو گئی۔ جو دھرتی بچ رہی ہے وہ بھی نہ جانے بچے گی کہ نہیں۔ اندھا ہونا ہی کیا تھوڑی بپت تھی کہ نت نئی چپت اور پڑتی رہتی ہے۔ جس کے جی میں آتا ہے۔ چار کھری کھوٹی سنا دیتا ہے"۔

اِن دُکھ دینے والے خیالات سے متاثر ہو کر وہ رونے لگا۔ سُبھاگی جگدھر کے ساتھ بھیرو کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اور یہاں سورداس تنہا بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔

دفعتاً وہ چونک پڑا۔ کسی طرف سے آواز آئی "تم کھیل میں روتے ہو؟"

مٹھوا گھیسو کے گھر سے روتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ شاید گھیسو نے مارا تھا۔ اس پر گھیسو اُس کو چڑا رہا تھا "تم کھیل میں روتے ہو!"

سورداس کہاں تو حسرت و یاس۔ رنج و حرماں کے گہرے دریا میں غوطے کھا رہا تھا۔ کہاں یہ بات سنتے ہی اس کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا کسی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کنارے پر کھڑا کر دیا۔ "واہ میں تو کھیل میں روتا ہوں! کتنی بُری بات ہے! لڑکے بھی کھیل میں رونا بُرا خیال کرتے ہیں۔ رونے والے کو چڑاتے ہیں۔ اور میں کھیل میں روتا ہوں

سچے کھلاڑی کبھی روتے نہیں۔ بازی پر بازی ہارتے ہیں۔ چوٹ پر چوٹ کھاتے ہیں۔ دھکے پر دھکے سہتے ہیں پر میدان میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اُن کے تیوروں پر بل نہیں پڑتے۔ ہمت اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دل میں کدورت کا شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو کسی سے جلتے ہیں۔ نہ چڑتے ہیں۔ کھیل میں رونا کیسا؟ کھیل تو ہنسنے کے لئے دل بہلانے کے لئے ہے۔ رونے کے لئے نہیں ۔

سورداس اُٹھ کھڑا ہوا اور فاتحانہ تکبر کے نشہ میں راکھ کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے اُڑانے لگا ۔

ہم جوش کی حالت میں مقررہ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ ضبط کہاں ہے جو دشمن پر فتح پانیکے بعد تلوار کو میان میں کرلے ۔

ایک لمحہ میں مٹھوا گھیسو اور محلہ کے بیسوں لڑکے آکر اس راکھ کے ڈھیر کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور اپنے بے انتہا سوالات سے سورداس کو پریشان کردیا۔ اس کو راکھ اُڑاتے دیکھ کر ان سب کو بھی ایک مشغلہ ہاتھ آیا۔ راکھ کی بارش ہونے لگی۔ ذرا دیر میں ساری راکھ بکھر گئی اور زمین پر صرف سیاہ نشانات رہ گئے ۔

مٹھوا نے پوچھا "دادا اب ہم رہیں گے کہاں؟"

سورداس۔ دوسرا گھر بنائیں گے ۔

مٹھوا۔ اور جو کوئی پھر آگ لگا دے ؟

سورداس۔ تو پھر بنائیں گے ۔

مٹھوا۔ اور جو پھر لگا دے ؟

سورداس۔ تو ہم پھر بنائیں گے ۔

مٹھوا۔ اور جو کوئی ہجار (ہزار) بار لگا دے ؟

سورداس۔ تو ہم ہزار بار بنائیں گے !

لڑکوں کو گنتی سے خاص دل چسپی ہوتی ہے۔ مٹھوا نے پھر پوچھا "اور جو کوئی سو لاکھ بار لگا دے ؟" سورداس نے اسی طفلانہ سادگی سے جواب دیا "تو ہم بھی سو لاکھ بار بنائیں گے" ×

جب وہاں راکھ کی ایک چٹکی بھی نہ رہی تو سب لڑکے کسی دوسرے مشغلہ کی تلاش میں دوڑے۔ آفتاب کی روشنی خوب پھیل گئی تھی۔ سورداس نے بھی لکڑی سنبھالی اور سڑک کی طرف چلا۔ اُدھر جگدھر یہاں سے نایک رام کے پاس گیا۔ اور وہاں بھی یہ سب حال کہہ سنایا۔ پنڈا نے کہا "میں بھیرو کے باپ سے روپے وصول کر دوں گا۔ جاتا کہاں ہے ؟ اُس کی ہڈیوں سے روپے نکال کر دم لوں گا۔ اندھا اپنے مُنہ سے کچھ کہے یا نہ کہے" ×

جگدھر وہاں سے بجرنگی دیا گر۔ ٹھاکر دین وغیرہ محلّے کے سب چھوٹے بڑے آدمیوں سے ملا اور یہ قصّہ بیان کیا۔ جب ضرورت واقعی بات میں نمک مرچ بھی لگاتا جاتا تھا۔ سارا محلّہ بھیرو کا دشمن ہو گیا ×

سورداس تو سڑک کے کنارے راہگیروں کے جان و مال کی خیر منا رہا تھا۔ یہاں محلّہ والوں نے اُس کی جھونپڑی بنانی شروع کی۔ کسی نے پھوس دیا۔ کسی نے بانس دئے۔ کسی نے دھرن دی۔ کئی آدمی جھونپڑی بنانے میں لگ گئے۔ جگدھر ہی اِس جماعت کا خاص مشیر تھا۔ اپنی زندگی میں شاید ہی اُس نے اتنا حوصلہ دکھلایا ہو۔ جسد میں صرف

سیاہی نہیں ہوتی بلکہ کچھ سفیدی بھی ہوا کرتی ہے۔ شام تک جھونپڑا تیار ہوگیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور مضبوط۔ جھنی نے مٹی کے دو گھڑے اور دو تین ہانڈیاں لاکر رکھ دیں۔ ایک چولھا بھی بنادیا۔ سب نے صلاح کر رکھی تھی کہ سورداس کو جھونپڑی کے بننے کی ذرا بھی خبر نہ ہو۔ جب وہ شام کو آئے تو گھر کو دیکھ کر متعجب ہو جائے اور پوچھنے لگے۔ کس نے بنایا؟ اس وقت سب لوگ کہیں کہ آپ ہی آپ تیار ہوگیا:۔

(۱۳)

پربھو سیوک طاہر علی کے ساتھ چلے تو باپ پر جھلائے ہوئے تھے۔ یہ مجھے کولھو کا بیل بنانا چاہتے ہیں۔ آٹھوں پہر تمباکو کے نشے میں ڈوبا پڑا رہوں۔ حکام کے آستانوں پر سجدے کروں۔ حصص فروخت کرتا پھروں۔ اخبار میں اشتہارات چھپواؤں۔ بس مجسم سگریٹ کی ڈبیہ بن جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں دولت کمانے کی مشین نہیں ہوں۔ انسان ہوں۔ زر کی ہوس نے ابھی تک میرے جذبات کو فنا نہیں کیا۔ اگر میں اپنی خداداد طباعی سے کام نہ لوں تو یہ میری احسان فراموشی ہوگی۔ قدرت نے مجھے دولت کمانے کے لئے بنایا ہی نہیں ورنہ وہ مجھ کو یہ جذبات کیوں عطا کرتی؟ کہتے تو ہیں کہ اب مجھے دنیوں کی کیا فکر تھوڑے دنوں کا مہمان ہوں۔ گویا یہ سب تیاریاں میرے لئے ہو رہی ہیں! لیکن ابھی کہہ دوں کہ آپ میرے لئے یہ تکلیف نہ اٹھایئے۔ میں جس حالت میں ہوں اسی میں خوش ہوں تو کہرام برپا ہو جائے۔ اچھی بلا گلے پڑی۔ جاکر دیہاتیوں پر رعب جمایئے۔ ان کو دھمکایئے۔ انہیں گالیاں سنایئے۔ کیوں؟ ان سب نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔ کوئی ان کی

جائداد پر جبراً قبضہ کرے گا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو ہی جائیں گے۔ اپنے حقوق کے تحفظ کا اُن کے پاس اور کون سا ذریعہ ہے؟ آج میرے گھر پر کوئی قبضہ کرنا چاہئے تو میں کبھی چپ چاپ نہ بیٹھوں گا۔ صبر تو نا امیدی کی انتہائی حالت کا نام ہے۔ جب تک ہم بالکل مجبور نہیں ہو جاتے۔ صبر نہیں کرتے۔ ان میاں جی کو بھی ذرا سی چوٹ آ گئی تو فریاد لے کر پہنچے۔ خوشامدی ہے۔ تملق سے اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان کو بھی غریبوں پر رعب جمانے کی دُھن سوار ہو گی۔ مل کر نہیں رہتے بنتی۔ پاپا کی بھی یہی خواہش ہے۔ خدا کرے سب کے سب بگڑ کھڑے ہوں۔ گودام میں آگ لگا دیں۔ اور ان حضرت کی ایسی خبر لیں کہ وہاں سے بھاگتے ہی بنے؟ طاہر علی سے خفا ہو کر بولے "کیا بات ہوئی کہ سب کے سب بگڑ کھڑے ہوئے؟"

طاہر۔ حضور! بالکل بے سبب۔ میں تو خود ہی ان سبھوں سے اپنی جان بچاتا رہتا ہوں:۔

پربھو سیوک۔ معمول کے لئے علّت کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک فلسفیانہ راز ہے۔ کیوں؟

طاہر۔ (بات نہ سمجھ کر) جی ہاں اور کیا:۔

پربھو سیوک۔ جی ہاں اور کیا کے کیا معنے؟ کیا آپ بات بھی نہیں سمجھتے؟ یا بہرے پن کا مرض ہے؟ میں کہتا ہوں۔ بلا چنگاری کے آگ نہیں لگ سکتی۔ آپ فرماتے ہیں۔ جی ہاں اور کیا۔ آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟

طاہر (خائف ہو کر) حضور! مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ مگر بدقسمتی سے

پاس نہ ہو سکا۔ پھر بھی جو کام میں کر سکتا ہوں۔ اُس کو ٹل پاس کر دے تو جرمانہ کیئے دوں۔ عرصہ تک چنگی میں محرر رہ چکا ہوں ؛

پربھو سیوک۔ تو پھر آپ کی علمیت و فضیلت پر کیسے شک ہو سکتا ہے؟ آپ کے کہنے پر مجھے مان لینا چاہئے کہ آپ خاموش بیٹھے ہوئے کتب بینی میں محو تھے یا شاید یاد الہی میں غرق تھے۔ ورمخالفوں کی ایک مسلح جماعت پہنچ کر آپ پر حملے کرنے لگی ؛

طاہر۔ حضور تو خود ہی چل رہے ہیں۔ میں کیا عرض کروں تحقیقات کر لیجئے گا ؛

پربھو سیوک۔ آفتاب کو بتلانے کے لئے چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دہقانی عموماً امن پسند ہوتے ہیں۔ جب تک انہیں بھڑکایا نہ جائے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے۔ آپ کی طرح انہیں یاد الہی سے روٹیاں نہیں ملتیں۔ سارا دن سر کھپاتے ہیں جب روٹیاں میسر آتی ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ پر جو کچھ بیتی اُس کا سبب بھی نہیں بتلا سکتے۔ اس کے معنے اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ یا تو آپ کو خداوند تعالےٰ نے بہت موٹی عقل دی ہے یا آپ اپنا رعب جمانے کے لئے لوگوں پر بیجا باؤ ڈالتے ہیں ؛

طاہر۔ حضور لڑائی کی ابتدا تو لڑکوں سے ہوئی۔ محلہ کے کئی لڑکے میرے لڑکوں کو مار رہے تھے۔ میں نے جا کر ان سبھوں کی گوشمالی کر دی۔ بس اتنی ذرا سی بات پر لوگ چڑھ آئے ؛

پربھو سیوک۔ خیر شکر ہے۔ آپ کے ساتھ خدا نے اس قدر بے انصافی نہیں کی۔ جتنا میں سمجھتا تھا۔ آپ کے اور محلہ کے لڑکوں میں مار پیٹ

ہو رہی تھی آپ نے اپنے لڑکوں کے رونے کی آواز سنی اور آپ کا خون جوش میں آیا۔ دہقانوں کے لڑکوں میں اتنی جرأت کہ وہ آپ کے لڑکوں کو ماریں؟ غضب خدا کا۔ آپ کی شرافت اس کی متحمل نہ ہو سکی۔ آپ نے مصلحت دور اندیشی۔ دانائی سب کو سمیٹ کر طاق پر رکھ دیا۔ اور ان گستاخ لڑکوں کو مارنے دوڑے۔ تو اگر آپ جیسے مہذب شخص کو لڑکوں کی طفلانہ جنگوں میں مداخلت کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی آپ کی تقلید کریں تو آپ کو شکایت نہ ہونی چاہئیے۔ آپ کو دنیا میں اتنے عرصہ تک رہنے پر یہ تجربہ ہو جانا چاہئیے تھا کہ لڑکوں کے بیچ میں بوڑھوں کو نہ پڑنا چاہئیے۔ اس کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو یہ تجربہ نہ تھا تو اب اس سبق کے لئے آپ کو خوش ہونا چاہئیے جس کے ذریعہ آپ کو ایک نہایت ضروری اور اہم تجربہ حاصل ہوا۔ اس کے لئے فریاد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

فٹن اُڑی جاتی تھی اور اس کے ساتھ طاہر علی کے ہوش بھی اُڑے جاتے تھے۔ دل میں کہہ رہے تھے "میں سمجھتا تھا کہ ان حضرت میں زیادہ انسانیت ہو گی پر دیکھتا ہوں تو یہ اپنے پدر بزرگوار سے بھی دو اُنگل اونچے ہیں۔ نہ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ یہ طعنے برداشت نہیں ہو سکتے۔ کچھ مفت تنخواہ نہیں دیتے۔ کام کرتا ہوں۔ اجرت لیتا ہوں۔ کنایتہً مجھے رذیل۔ احمق۔ جاہل۔ سب کچھ بنا ڈالا۔ ابھی عمر میں مجھ سے کتنے چھوٹے ہیں۔ ماہر سے دو چار سال بڑے ہوں گے مگر مجھے اس طرح آڑے ہاتھوں لے رہے ہیں۔ گویا میں نادان بچہ ہوں۔ دولت زیادہ ہونے سے کیا عقل بھی زیادہ ہو جاتی ہے؟ آرام سے

زندگی بسر ہوتی ہے جبھی یہ باتیں سوجھ رہی ہیں۔ روٹیوں کے لئے ٹھوکریں کھانی پڑتیں تو معلوم ہو جاتا کہ تجربہ کیا چیز ہے۔ آقا کوئی بات اعتراض کے قابل دیکھے تو سمجھانے کا اُس کو حق ہے۔ اُس کی مجھے شکایت نہیں مگر جو کچھ ہو نرمی اور ہمدردی کے ساتھ۔ یہ نہیں نہ بسرا گننے لگو۔ کلیجہ کو چھلنی بنا ڈالو۔"

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ پانڈے پور آ پہنچا۔ سورداس آج بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اور روز سواریوں کے نکل جانے کے بعد دوڑتا تھا۔ آج آگے ہی سے اُن کا خیر مقدم کرتا تھا۔ فٹن دیکھتے ہی دوڑا۔ پربھوسیوک نے فٹن روک دی اور تند لہجہ میں بولے "کیوں سورداس! مانگتے ہو بھیک بنتے ہو سادھو اور کام کرتے ہو بدمعاشو کا؟ تجھے فوجداری کرنے کا حوصلہ ہوا ہے؟"

سورداس۔ کیسی فوجداری حضور؟ میں اندھا اپاہج بھلا کیا فوجداری کروں گا؟

پربھوسیوک۔ تمہیں نے تو محلہ والوں کو ساتھ لے کر میرے منشی پر حملہ کیا تھا اور گودام میں آگ لگا دینے کو تیار تھے؟

سورداس۔ سرکار! بھگوان کی قسم پر کہتا ہوں۔ میں تمہیں تھا آپ لوگوں کا منگتا ہوں۔ جان و مال کا کلیان مناتا ہوں۔ میں کیا فوجداری کروں گا؟

پربھوسیوک۔ کیوں منشی جی۔ یہی شخص سرغنہ تھا نہ؟

طاہر۔ نہیں حضور۔ اشارہ اسی کا تھا پر یہ وہاں نہ تھا۔

پربھوسیوک۔ میں اِن چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم جانتے ہوگے

اِن دھمکیوں سے یہ لوگ ڈر جائیں گے مگر ایک ایک سے چکّی نہ پسوائی تو کہنا کہ کوئی کہتا تھا۔ صاحب کو تم نے کیا سمجھا ہے؟ اگر حاکموں سے جھوٹوں بھی کہہ دیں تو سارا محلّہ بندھ جائے۔ میں تمہیں جتائے دیتا ہوں۔

نٹن آگے بڑھی تو جگدھر مِلا۔ خوانچہ ہتھیلی پر رکھے ایک ہاتھ سے مکھیاں اُڑاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ پربھو سیوک کو دیکھتے ہی سلام کرکے کھڑا ہو گیا۔ پربھو سیوک نے پوچھا "تم بھی کل نوج داری کرنے والوں میں سے تھے؟"

جگدھر۔ سرکار! ہیں ٹکے کا آدمی کیا کھا کر بھوجا۔ ی کروں گا اور بیچارے سورداس کی کیا مجال ہے کہ سرکار کے سامنے اکڑ دکھائے۔ اپنی ہی مصیبت میں پڑا ہوا ہے۔ کسی نے رات کو بیچارہ کی جھونپڑی میں آگ لگا دی۔ برتن بھانڈا سب جل گیا۔ نہ جانے کس کس جتن سے کچھ روپے جُٹائے تھے وہ بھی لٹ گئے۔ گریب نے ساری رات رو رو کر کاٹی ہے۔ آج ہم لوگوں نے اُس کا جھونپڑا بنایا ہے۔ ابھی چھٹی ملی ہے۔ تو خوانچہ لے کر نکلا ہوں۔ حکم ہو تو کچھ کھلاؤں۔ کچا لو خوب چٹ پٹے ہیں؟

پربھو سیوک کا جی للچا گیا۔ خوانچہ اُتارنے کو کہا اور کچالو۔ دہی بڑے اور پکوڑیاں کھانے لگے۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں بہت لذیذ معلوم ہوئیں۔ کہا "سورداس نے تو یہ بات مجھ سے نہیں کہی۔"

جگدھر۔ وہ کبھی نہ کہے گا۔ کوئی گلا بھی کاٹ ڈالے تو شکایت نہ کریگا

پربھو سیوک۔ تب تو واقعی کوئی مہاتما ہے۔ کچھ پتہ نہ چلا کس نے جھونپڑے میں آگ لگائی تھی؟

جگدھر۔ سب معلوم ہوگیا ہجور! پر کیا کیا جائے؟ کتنا کہا گیا کہ اس پر تھانہ میں رپٹ کر دے پر وہ کہتا ہے کہ کون کسی کو پھنسائے۔ جو کچھ بھاگ میں لکھا تھا وہ ہوا۔ ہجور ساری کرتوت اسی بھیرو تاڑی والے کی ہے۔

پربھوسیوک۔ کیسے معلوم ہوا؟ کسی نے اسے آگ لگاتے دیکھا؟

جگدھر۔ ہجور! وہ خود مجھ سے کہہ رہا تھا۔ روپیوں کی تھیلی لاکر دکھائی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا؟

پربھوسیوک۔ بھیرو کے منہ پر کہو گے؟

جگدھر۔ نہیں سرکار۔ خون ہو جائے گا۔

دفعتاً بھیرو سر پر تاڑی کا گھڑا رکھے آتا ہوا نظر آیا۔ جگدھر نے فوراً خوانچہ اٹھایا اور بلا پیسے لئے قدم بڑھاتا دوسری طرف چل دیا۔ بھیرو نے سامنے آکر سلام کیا۔ پربھوسیوک نے آنکھیں دکھا کر پوچھا "تو ہی بھیرو تاڑی والا ہے نہ؟"

بھیرو۔ (کانپتے ہوئے) ہاں ہجور۔ میرا ہی نام بھیرو ہے؟

پربھوسیوک۔ تو یہاں لوگوں کے گھروں میں آگ لگاتا پھرتا ہے؟

بھیرو۔ ہجور! جوانی کی کسم کھاتا ہوں کسی نے ہجور سے جھوٹ کہہ دیا ہے۔

پربھوسیوک۔ تو کل میرے گودام پر فوجداری کرنے میں شریک تھا؟

بھیرو۔ ہجور کا تابعدار ہوں۔ آپ سے پھوجداری کروں گا؟ کسی جی سے پوچھئے۔ جھوٹ کہتا ہوں یا سچ۔ سرکار نہ جانے کیوں سارا محلہ مجھ سے

دشمنی کرتا ہے۔ اپنے گھر میں ایک روٹی کھاتا ہوں وہ بھی لوگوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ جوا ندھا ہے۔ بجورا ایک ہی بدمعاش ہے۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں پر بُری نگاہ رکھتا ہے۔ مانگ مانگ کر روپے جوڑے ہیں۔ لین دین کرتا ہے۔ سارا محلہ اس کے کہنے میں ہے۔ اُسی کے چیلے بجرنگی اہیر نے پھوجداری کی ہے۔ مال مست ہے۔ گائیں بھینسیں لگتی ہیں۔ پانی ملا ملا کر دودھ بیچتا ہے۔ اُس کے سوا کس کا گردہ ہے کہ بجور سے پھوجداری کرے۔

پربھوسیوک۔ اچھا اِس اندھے کے پاس روپے بھی ہیں؟

بھیرو۔ ہجور! بنا روپیوں کے اتنی گرمی اور کیسے ہوگی؟ جب پیٹ بھرتا ہے تبھی تو بہو بیٹیوں پر نگاہ ڈالنے کی سوجھتی ہے۔

پربھوسیوک۔ بیکار کیا بکتا ہے؟ اندھا آدمی کیا بُری نگاہ ڈالے گا۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت سیدھا سادہ آدمی ہے۔

بھیرو۔ آپ کا کتا آپ کو تھوڑا ہی کاٹتا ہے آپ تو اُس کی پیٹھ سہلاتے ہیں۔ پر جنہیں کاٹنے دوڑتا ہے وہ تو اُس کو اتنا سیدھا نہ سمجھیں گے۔

اتنے میں بھیرو کی دوکان آ گئی۔ کئی گاہک اُس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی دوکان میں چلا گیا۔ اُس وقت پربھوسیوک نے طاہر علی سے کہا ”آپ کہتے ہیں۔ سارا محلہ مجھے مل کر مار لے آیا تھا۔ مجھے اس پر یقین نہیں آتا۔ جہاں لوگوں میں اتنی نااتفاقی اور ناچاقی ہے وہاں اس قدر اتفاق ہونا غیر ممکن ہے۔ دو آدمی ملے۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس باہمی ناچاقی سے حسب مرضی فائدہ اُٹھاتا۔ ان کو آپس میں لڑا کر دور سے تماشہ

دیکھتا مجھے تو ان لوگوں پر غصہ کی بجائے رحم آتا ہے "۔

بجرنگی کا گھر ملا۔ تیسرا پہر ہو گیا تھا۔ وہ بھینسوں کی ناند میں پانی ڈال رہا تھا۔ فٹن پر طاہر علی کے ساتھ پربھو سیوک کو بیٹھے دیکھا تو سمجھ گیا۔ میاں جی اپنے مالک کو لے کر رعب جمانے آئے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس طرح میں دب جاؤں گا۔ صاحب امیر ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ مجھے کایل (زقایل) کردیں تو ابھی جو جرمانہ (جرمانہ) لگادیں اسے دینے کو تیار ہوں۔ لیکن جب میرا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ قصور سولہوں آنے میاں ہی کا ہے۔ تو میں کیوں دبوں؟ نیائے سے دبالیں پد (عہدہ) سے دبالیں پربھکی سے دبنے والے کوئی اور ہونگے۔

طاہر علی نے اشارہ کیا۔ یہی بجرنگی ہے۔ پربھو سیوک نے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا "کیوں بے۔ کل کے ہنگامے میں تو بھی شریک تھا؟"

بجرنگی۔ شریک کس کے ساتھ تھا؟ میں اکیلا تھا۔

پربھو سیوک۔ تیرے ساتھ سورداس اور محلہ کے دوسرے لوگ نہ تھے؟ جھوٹ بولتا ہے؟

بجرنگی۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ کسی کا دبیل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ نہ سورداس تھا اور نہ محلہ کا دوسرا آدمی۔ میں اکیلا تھا۔

گھیسو نے ہانک لگائی "پادڑی! پادڑی!"

مٹھوا بولا "پادڑی آیا۔ پادڑی آیا"

دونوں اپنے ہمجولیوں کو یہ خوشخبری سنانے دوڑے۔ پادڑی گائے گا۔ تصویریں دکھائے گا۔ کتابیں دے گا۔ مٹھائیاں اور پیسے

بانٹے گا۔" لڑکوں نے سُنا تو وہ بھی اِس لوٹ کا مال بٹلنے کو دوڑے۔ ایک لمحہ میں وہاں بیسیوں لڑکے جمع ہو گئے۔ شہر کے دورافتادہ محلوں میں انگریزی لباس والا آدمی پادری کا مترادف ہے۔ نایک رام بھنگ پی کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پادری کا نام سنتے ہی اُٹھے۔ اُن کی بے سُری تانوں میں اُنہیں خاص مزہ ملتا تھا۔ ٹھاکر دین نے بھی دوکان چھوڑ دی۔ اُنہیں پادریوں سے مذہبی مباحثہ کرنے کی عادت تھی۔ اپنی مذہبی واقفیت کے اظہار کے ایسے عمدہ موقعوں کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ دیا گر بھی آپہنچے۔ لیکن جب لوگ نشان کے پاس پہنچے اُس وقت بھید کھلا۔ پربھو سیوک بجرنگی سے کہہ رہے تھے" تمہاری شامت نہ آئے ورنہ صاحب تم کو تباہ کر دیں گے۔ کسی کام کے نہ رہو گے۔ تمہاری اتنی مجال!"

بجرنگی اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ نایک رام نے آگے بڑھ کر کہا" اس پر آپ کیوں بگڑتے ہیں؟ فوجداری میں نے کی ہے۔ جو کہنا ہو مجھ سے کہئے"۔

پربھو سیوک نے متحیر ہو کر پوچھا" تمہارا کیا نام ہے؟"

نایک رام کو کچھ تو راجہ مہیندر کمار کی نوازش کچھ بھنگ کی ترنگ اور کچھ اپنی طاقت کے زعم نے گستاخ بنا دیا تھا۔ لاٹھی سیدھی کرتا ہوا بولا" لٹھ مار پانڈے!"

اس جواب میں شیخی کی جگہ ظرافت کی فراوانی تھی۔ پربھو سیوک کا مصنوعی غصہ ہوا ہو گیا۔ ہنس کر بولے" تب تو یہاں ٹھہرنے میں خیریت نہیں ہے"۔

نایک رام اکھڑ آدمی تھا۔ پرتھوسیوک کے مطلب کو نہ سمجھ سکا۔ اُسے خیال ہوا کہ یہ میری ہنسی اُڑا رہے ہیں گویا کہہ رہے ہیں کہ تمہاری بکواس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم زمین لیں گے اور ضرور لیں گے۔ ذرا بگڑ کر بولا "آپ ہنستے کیا ہیں؟ کیا سمجھ رکھا ہے کہ اندھے کی جمین (زمین) سہج ہی مل جائے گی؟ اس دھوکے میں نہ رہیئے گا"۔

پرتھوسیوک کو بھی اب غصّہ آیا۔ پہلے اُنھوں نے سمجھا تھا کہ نایک رام مذاق کر رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ واقعی لڑنے پر آمادہ ہے۔ بولے "اس دھوکے میں نہیں ہوں مشکلات کو خوب جانتا ہوں۔ اب تک بھروسہ تھا کہ سمجھوتے سے ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔ اسی لئے آیا تھا۔ لیکن تمہاری خواہش کچھ اور ہو تو وہی سہی۔ اب تک میں تمہیں کمزور سمجھتا تھا اور کمزوروں پر اپنی طاقت کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آج جانا کہ تم زبردست ہو۔ تمہیں اپنی طاقت پر غرور ہے۔ اس لئے اب ہم بھی تم کو اپنی طاقت دکھائیں تو اس میں کوئی ناانصافی نہیں ہے"۔

اِن الفاظ میں نیک نیتی جھلک رہی تھی۔ ٹھاکردین نے کہا۔ "ہجور! پنڈا جی کی باتوں کا خیال نہ کریں۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے جو کچھ منہ میں آیا بک ڈالتے ہیں۔ ہم لوگ آپ کے تابعدار ہیں"۔

نایک رام۔ آپ دوسروں کے بل پر کودتے ہوں گے۔ یہاں اپنے ہاتھوں کے بل کا بھروسہ رکھتے ہیں۔ آپ لوگوں کے دل میں جو ارمان ہو نکال ڈالئے۔ پھر نہ کہنا کہ دھوکے میں وار کیا (آہستہ سے) ایک ہی ہاتھ میں ساری کرستانی نکل جائے گی۔

پربھوسیوک۔ کیا کہا؟ ذرا زور سے کیوں نہیں کہتے؟
نایک رام۔ (کچھ ڈر کر) کہہ تو رہا ہوں۔ جو ارمان ہوں نکال ڈالیئے۔
پربھوسیوک۔ نہیں۔ تم نے کچھ اور کہا ہے۔
نایک رام۔ جو کچھ کہا ہے وہی پھر کہہ رہا ہوں۔ کسی کا ڈر نہیں ہے۔
پربھوسیوک۔ تم نے گالی دی ہے؟

یہ کہتے ہوئے پربھوسیوک فٹن سے نیچے اتر پڑے۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ نتھنے پھڑک اٹھے۔ سارا جسم تھرتھرانے لگا۔ ایڑیاں اس طرح اچھل رہی تھیں۔ گویا کسی ابلتی ہوئی ہانڈی کا ڈھکنا ہیں چہرہ کی حالت تبدیل ہوگئی۔ اُن کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ فٹن سے اُترتے ہی وہ جھپٹ کر نایک رام کے گلے پر پہنچ گئے۔ اُس کے ہاتھ سے لاٹھی چھین کر پھینک دی اور متواتر کئی بینت لگائے۔ نایک رام دونوں ہاتھوں سے واروں کو روکتا ہوا پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے اوسان خطا ہوگئے ہیں۔ وہ یہ جانتا تھا کہ شریف لوگ مار کھا کر چاہے چپ ہو جائیں پر گالی نہیں برداشت کر سکتے۔ کچھ پشیمانی کچھ حملہ کی تیزی۔ کچھ انجام کا خوف۔ اِن باتوں نے اُس کو وار کرنے کی مہلت نہ دی۔ لگاتار واروں سے وہ چوندھیا سا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پربھوسیوک اس کے جوڑ کے نہ تھے۔ مگر اس میں وہ پاک ہمت وہ حق بجانب ہونے کی بات نہ تھی جس کو تعداد اور اسلحہ اور طاقت کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اور لوگ بھی بدحواس سے کھڑے تھے کسی نے بیچ بچاؤ تک نہ

گیا۔ بجرنگی نایک رام کے پسینہ کی جگہ خون بہانے والوں میں تھا۔ دونوں ساتھ کھیلے اور ایک ہی اکھاڑے میں لڑے تھے ٹھاکردین اور کچھ نہ کرسکتا تھا تو پربھو سیوک کے سامنے کھڑا ہوسکتا تھا۔ لیکن دونوں کے دونوں گم سُم سے تاکتے رہے۔ یہ سب کچھ پلک مارنے میں ہوگیا۔

پربھو سیوک ابھی تک بیت مارتے جاتے تھے۔ جب دیکھا کہ چھڑی سے کوئی اثر نہیں ہورہا۔ تو ٹھوکر لگانی شروع کی۔ یہ چوٹ کارگر ہوئی۔ دو ہی تین ٹھوکریں پڑی تھیں کہ نایک رام ران میں چوٹ کھاکر گر گیا۔ اُس کے گرتے ہی بجرنگی نے دوڑ کر پربھو سیوک کو ہٹا دیا اور بولا۔ "بس صاحب بس۔ اب اسی میں خیریت ہے کہ آپ چلے جائیے نہیں تو خون ہوجائے گا"۔

پربھو سیوک۔ ہم کو کوئی چرکٹا سمجھ لیا ہے۔ بدمعاش! خون پی لوں گا۔ گالی دیتا ہے۔

بجرنگی۔ بس اب بہت نہ بڑھئے۔ یہ اُسی گالی کا پھل ہے کہ آپ یوں کھڑے ہیں نہیں تو اب تک نہ جانے کیا ہوگیا ہوتا۔

پربھو سیوک جنون کے درجہ سے گزر کر مصلحت کے درجہ میں پہنچ چکے تھے۔ جاکر فٹن پر بیٹھ گئے اور گھوڑے کو چابک ماری گھوڑا ہوا ہوگیا۔

بجرنگی نے جاکر نایک رام کو اُٹھایا۔ گھٹنوں میں بہت چوٹ آئی تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ بجرنگی کا کندھا پکڑ کر آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے گھر چلے۔

ٹھاکردین نے کہا۔ "نایک رام! بھلا مانو یا بُرا۔ بھول تمہاری تھی۔

یہ لوگ گالی نہیں سہ سکتے۔

نایک رام۔ ارے تو میں نے گالی کب دی تھی بھائی؟ میں نے تو یہی کہا تھا کہ ایک ہی ہاتھ میں کرستانی نکل جائے گی۔ بس اسی پر بگڑ گیا

جمنی اپنے دروازہ پر کھڑی ہوئی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ آ کر بجرنگی کو کوسنے لگی "یہ کھڑے مُنہ تاکتے رہے اور لونڈا مار پیٹ کر چلا گیا۔ ساری پہلوانی دھری رہ گئی"۔

بجرنگی۔ میں تو جیسے گھبرا گیا۔

جمنی۔ چپ بھی رہو۔ لاج نہیں آتی؟ ایک لونڈا آ کر سب کو پچھاڑ گیا۔ یہ تم لوگوں کے گھمنڈ کا ڈنڈ ہے۔

ٹھاکردین۔ بہت سچ کہتی ہو۔ جمنا۔ یہ تماشہ دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ بھگوان کو ہمارے گرُور (غرور) کی سجا (سزا) دینی تھی نہیں تو کیا ایسے ایسے جودھا کاٹھ پتلیوں کی طرح کھڑے رہتے۔ بھگوان کسی کا گھمنڈ نہیں رکھتے۔

نایک رام۔ یہی بات ہوگی۔ میں اپنے گھمنڈ میں کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔

یہ باتیں کرتے ہوئے لوگ نایک رام کے گھر آئے۔ کسی نے آگ جلائی۔ کوئی ہلدی پیسنے لگا۔ ذرا دیر میں محلّہ کے اور لوگ آ کر جمع ہو گئے سب کو تعجب تھا کہ نایک جیسا پھنکیت اور لٹھ باز کس طرح زک کھا گیا۔ کہاں سیکڑوں کے بیچ سے بے داغ نکل آتا تھا کہاں ایک چھوکرے نے لتھاڑ ڈالا۔ بھگوان کی مرضی!

جگدھر ہلدی کی لیپ کرتا ہوا بولا۔ "یہ ساری آگ بھیرو کی لگائی ہوئی ہے۔ اُس نے راستہ ہی میں صاحب کے کان بھر دئے تھے۔ میں

نے تو دیکھا کہ اُس کی جیب میں پستول بھی تھا۔
نایک رام۔ پستول اور بندوق سب دیکھوں گا۔ اب تو لاگ پڑگئی ہے۔ بٹھا کر دیں۔ کوئی انستھان کروا دیا جائے۔
جگدھر۔ انستھان کا کرستانوں پر کچھ بس نہیں چلتا۔
نایک رام۔ اسے بیچ بازار میں فٹن روک کر ماروں گا۔ پھر کہیں مُنہ دکھانے لایق نہ رہے گا۔ اب من میں یہی ٹھن گئی ہے۔
اُسی وقت بھیرو بھی آکر کھڑا ہو گیا۔ نایک رام نے طنزاً کہا۔
"تم کو تو بڑی خوشی ہوئی ہوگی۔ بھیرو!"
بھیرو۔ کیوں بھیّا؟
نایک رام۔ مجھ پر مار پڑی ہے نا۔
بھیرو۔ کیا میں تمہارا دشمن ہوں بھیّا؟ میں نے تو ابھی دوکان پر سُنا۔ ہوش اُڑ گئے۔ صاحب دیکھنے میں تو بہت سیدھا سادہ معلوم ہوتا تھا مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ یہاں آکر نہ جانے کون بھوت اُس کے سر پر سوار ہو گیا؟
نایک رام۔ اُس کا بھوت میں اُتار دوں گا۔ اچھّی طرح اُتار دوں گا ذرا کھڑا تو ہونے دو۔ ہاں۔ یہاں جو کچھ رائے ہو اُس کی کھبر وہاں نہ ہونے پائے نہیں تو چوکنا ہو جائے گا۔
بجرنگی۔ یہاں ہمارا کون ایسا بیری بیٹھا ہوا ہے؟
جگدھر۔ یہ نہ کہو۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کون جانے کوئی آدمی ساباسی لوٹنے کے لئے انعام لینے کے لئے یا سُرکھرو (سرخرو) بننے کے لئے وہاں ساری باتیں لگا آئے۔

بھیرو۔ مجھی پر شک کر رہے ہو تو میں اتنا نیچ نہیں ہوں کہ گھر کا بھید دوسروں سے کھولتا پھروں۔ اس طرح چار آدمی ایک جگہ رہتے ہیں تو آپس میں کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے لیکن اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ بھبھیکن کی طرح اپنے بھائی کے گھر میں آگ لگوا دوں۔ کیا اتنا نہیں جانتا کہ مرنے جینے میں۔ بپت سمپت میں محلہ ہی کے لوگ کام آتے ہیں؟ کبھی کسی کے ساتھ بسواس گھات کیا ہے؟ پنڈا جی ہی کہہ دیں کہ میں نے کبھی اُن کی بات دولکھی ہے۔ اُن کی آڑ نہ ہوتی تو پولیس نے اب تک مجھے کب کا لدوا دیا ہوتا نہیں تو رجسٹر میں نام نامہ نہیں ہے۔

نایک رام۔ بھیرو! تم نے وقت پڑنے پر کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ اتنا تو ماننا ہی پڑے گا۔

بھیرو۔ پنڈا جی تمہارا حکم ہو تو آگ میں کود پڑوں۔

اتنے میں سورداس بھی آ پہنچا۔ سوچتا آتا تھا۔ آج کھانا کہاں بناؤں گا۔ اس کی کیا فکر ہے۔ بس نیم کے پیڑ کے نیچے باٹیاں لگاؤں گا۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ کون سا پانی برس رہا ہے۔ اسی سوچ بچار میں وہ جوں ہی بجرنگی کے دروازہ پر پہنچا جمنی نے آج کا سارا حال کہہ سنایا۔ ہوش اُڑ گئے۔ اُپلے ایندھن کی سدھ نہ رہی۔ سیدھے نایک رام کے یہاں پہنچا۔ بجرنگی نے کہا۔ آؤ سورداس! بڑی دیر لگائی۔ کیا ابھی چلے آتے ہو؟ آج تو یہاں بڑا گول مال ہو گیا۔

سورداس۔ ہاں۔ جمنا نے ابھی مجھ سے کہا۔ میں تو سنتے ہی ٹھک سے رہ گیا۔

بجرنگی۔ ہونہار تھی اور کیا۔ ہے تو لونڈا پر بہت کا پکا ہے۔ جب تک ہم لوگ ہاں ہاں کریں تب تک فٹن پر سے کود ہی تو پڑا اور لگا ہاتھ پر ہاتھ چلانے۔

سورداس۔ تم لوگوں نے پکڑ بھی نہ لیا؟

بجرنگی۔ سنتے تو ہو۔ جب تک دوڑیں تب تک تو اس نے ہاتھ چلا ہی دیا۔

سورداس۔ بڑے آدمی گالی سن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

جگدھر۔ جب بیچ باجار (بازار) میں بے بھاؤ کی پڑیں گی۔ تب روئیں گے۔ ابھی تو پھولے نہ سماتے ہوں گے۔

بجرنگی۔ جب چوک میں نکلے تو گاڑی روک کر جوتوں سے ماریں۔

سورداس۔ ارے اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کی آبرو بگاڑنے سے کیا ملے گا؟

نایک رام۔ تو کیا میں یونہی چھوڑ دوں گا؟ ایک ایک بیت کے بدلے اگر سو سو جوتے نہ لگاؤں تو میرا نام نایک رام نہیں۔ یہ چوٹ میرے بدن میں نہیں۔ میرے کلیجہ پر لگی ہے۔ میں بڑوں بڑوں کا سر نیچا کر چکا ہوں۔ انہیں مٹاتے کیا دیر لگتی ہے؟ (چٹکی بجا کر) اس طرح اڑا دوں گا۔

سورداس۔ بیر بڑھانے سے کچھ پھائدہ (فائدہ) نہ ہوگا۔ تمہارا تو کچھ نہ بگڑے گا پر محلہ کے سب آدمی بندھ جائیں گے۔

نایک رام۔ کیسی پاگلوں سی باتیں کرتے ہو؟ میں کوئی دھنیا چمار ہوں کہ اتنی بے عزتی کرا کے چپ ہو جاؤں۔ تم لوگ سورداس کو قایل

کیوں نہیں کرتے۔ جی ؟ کیا چپ ہو کے بیٹھ رہوں ؟ بولو بجرنگی! تم لوگ بھی ڈر رہے ہو کہ وہ کرسٹان سارے محلّہ کو پیس کر پی جائے گا ؟
بجرنگی۔ اوروں کو تو میں نہیں کہتا لیکن میرا بس چلے تو اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں۔ چاہے جیل ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔ یہ تمہاری ہی بے اجتنی (بے عزتی) نہیں ہے۔ محلّہ بھر کے مُنہ میں کالکھ لگ گئی ہے!
بھیرو۔ بس تم نے تو میرے مُنہ سے بات چھین لی۔ کیا کہوں اُس بکھت (وقت) نہ تھا نہیں تو ہڈی توڑ ڈالتا۔
جگدھر۔ پنڈا جی۔ مُنہ دیکھی نہیں کہتا۔ تم چاہے دوسروں کے کہنے سننے میں آجاؤ لیکن میں بنا اُس کی مرمت کئے نہ مانوں گا۔
اس پر کئی آدمیوں نے کہا ” نہیا کی اِجت گئی تو سب کی گئی وہی تو کرسٹان ہیں جو گلی گلی عیسیٰ مسیح کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ دومڑا۔ چمار۔ جو گرجا میں جا کر کھانا کھائے وہی کرسٹان ہو جاتا ہے۔ وہی پیچھے کوٹ پتلون پہن کر صاحب بن جاتے ہیں۔“
ٹھاکر دین۔ میری تو صلاح یہی ہے کہ کوئی انسٹھان کرا دیا جائے۔
نایک رام۔ اب بتاؤ سور داس! تمہاری بات مانوں یا اتنے آدمیوں کی ؟ تمہیں ڈر ہوگا کہ کہیں میری دھرتی پر آنچ نہ آجائے تو اس سے تم نسچنت رہو۔ راجہ صاحب نے جو بات کہہ دی اُسے پتھر کی لکیر سمجھو۔ صاحب سر رگڑ کر مر جائیں تو بھی اب اُس دھرتی کو نہیں پا سکتے۔
سور داس۔ دھرتی کی مجھے چنتا نہیں ہے۔ مروں گا تو سر پر لاد تھوڑا ہی جاؤں گا مگر آخر میں یہ سارا پاپ میرے ہی سر پڑے گا۔ میں ہی تو اس سارے تو پھان (طوفان) کی جڑ ہوں۔ میرے ہی کارن

تو یہ رگڑ جھگڑا مچی ہوئی ہے نہیں تو صاحب کو تم سے کون دشمنی تھی؟
نایک رام۔ یارو۔ سورداس کو سمجھاؤ *
جگدھر۔ سورداس۔ سوچو۔ ہم لوگوں کی کتنی بے آبروئی ہوئی ہے؟
سورداس۔ آبرو کا بنانے بگاڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ بھگوان ہے۔ اسی کی نگاہ میں آبرو بنی رہتی چاہیئے۔ آدمیوں کی نگاہ میں آبرو کی پرکھ کہاں ہے۔ جب سود کھانے والا بنیا اور گھوس کھانیوالا حاکم اور جھوٹ بولنے والا گواہ بے آبرو نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ اُن کا آدر کرتے ہیں تو یہاں سچی آبرو کی قدر کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں *
بجرنگی۔ تم سے کچھ مطلب نہیں۔ ہم لوگ جو چاہیں گے وہ کریں گے *
سورداس۔ اگر تم میری بات نہ مانو گے تو میں جاکر صاحب سے سارا ماجرا کہہ سناؤں گا *
نایک رام۔ اگر تم نے اُدھر پیر رکھا تو یاد رکھنا وہیں کھود کر گاڑ دونگا۔ اندھا اپاہج سمجھ کر تمہاری مروت کرتا ہوں نہیں تو تم ہو کس کھیت کی مولی؟ کیا تمہارے کہنے سے اپنی عزت گنوا دوں۔ باپ دادوں کے منہ میں کالکھ لگوا دوں؟ بڑے آئے ہو وہاں سے گیانی بن کے۔ تم بھیک مانگتے ہو۔ تمہیں اپنی عزت کی فکر نہ ہو یہاں تو آج تک پیٹھ میں دھول نہیں لگی *

سورداس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے سے اُٹھا اور مندر کے چبوترہ پر جاکے لیٹ گیا * مٹھوا پرشاد کے انتظار میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے پیسے نکال کر دیئے کہ ستو گُڑ لاکر کھالے۔ مٹھوا خوش ہو کر بنئے کی دوکان کی طرف دوڑا۔ لڑکوں کو ستو اور چربن ردیٹیوں سے

لذیذ تر معلوم ہوتا ہے ۔

سورداس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک سب لوگ سناٹے میں بیٹھے رہے۔ اُس کی مخالفت نے اُن کو شک میں ڈال دیا تھا! اُس کی صاف گوئی سے سب لوگ ڈرتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اُسے پورا کر دکھاتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ پہلے سورداس ہی سے نپٹ لیا جائے۔ اس کو قایل کرنا مشکل تھا۔ دھمکی سے بھی کوئی کام نہ نکل سکتا تھا۔ نایک رام نے اُس پر لگے ہوئے الزام کی تائید کر کے اُسے شکست دینا تجویز کیا۔ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں نے اندھے کو پھوڑ لیا" ۔

بھیرو۔ مجھے بھی یہی شک ہوتا ہے ۔

جگدھر۔ سورداس پھوٹنے والا آدمی نہیں ہے ۔

بجرنگی۔ کبھی نہیں ۔

ٹھاکردین۔ ایسا سوبھاؤ تو نہیں ہے پر کون جانے کسی کی نہیں چلائی جاتی۔ میرے ہی گھر چوری ہوئی تو کیا باہر کے چور تھے؟ پڑوسیوں کی ہی کرتوت ہے۔ پورے ایک ہزار کا مال اُٹھ گیا اور وہی لوگ جنہوں نے مال اُڑایا۔ اب تک میرے دوست بنے ہوئے ہیں۔ آدمی کا من چھن بھر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے ۔

نایک رام۔ شاید زمین کا معاملہ کرنے پر راضی ہو گیا ہو۔ پر صاحب نے ادھر آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو بنگلہ میں آگ لگا دوں گا (مسکرا کر بھیرو میری مدد کریں گے ہی ۔

بھیرو۔ پنڈا جی۔ تم لوگ میرے اوپر شبہ کرتے ہو پر میں جوانی کی

کھاتا ہوں جو اُس کے جھونپڑے کے پاس گیا بھی ہوں۔ جگدھر میرے یہاں آتے جاتے ہیں۔ ایمان سے پُوچھئے اِنہیں سے ؛

نایک رام۔ جو آدمی کسی کی بہو بیٹی پر بُری نگاہ کرے اُس کے گھر میں آگ لگانا بُرا نہیں۔ مجھے پہلے تو بسواس نہیں آتا تھا پر آج اُس کے مجاج (مزاج) کا رنگ بدلا ہُوا ہے ؛

بجرنگی۔ پنڈاجی اسور داس کو تم آج تیس برس سے دیکھ رہے ہو۔ ایسی بات نہ کہو ؛

جگدھر سورداس میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں پر یہ بُرائی نہیں ہے ؛

بھیرو۔ مجھے بھی ایسا جان پڑتا ہے کہ ہم نے ناحق (ناحق) اُس پر کلنک لگایا۔ سبھاگی آج سویرے آ کر میرے پیروں پر گر پڑی اور تب سے گھر کے باہر نہیں نکلی۔ سارے دن اماں کی سیوا ٹہل کرتی رہی ؛

یہاں تو یہی باتیں ہوتی رہیں کہ پربھو سیوک کی خاطر مدارات کیونکر کی جائے گی اُدھر پربھو سیوک گھر چلے تو آج کے کام پر اُن کو وہ خوشی نہ تھی جو نیک کام کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا دل مطمئن تھا ؛

کوئی شریف آدمی بُرے کلمات کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ کرنا ہی چاہئے۔ اگر کوئی گالیاں کھا کر چپ ہو رہے تو اُس کے معنے یہ ہیں کہ اُس میں مردانگی نہیں ہے۔ خودداری نہیں ہے۔ گالیاں کھا کر بھی جس کے خون میں جوش نہ آئے وہ بیجان اور مردہ ہے ؛

پربھوسیوک کو افسوس یہ تھا کہ میں نے یہ نوبت آنے ہی کیوں دی۔ مجھے اُن سے دوستی کرنی چاہئے تھی۔ ان لوگوں کو طاہر علی کے گلے ملانا چاہئے تھا۔ مگر یہ زمانہ سازی کس سے سیکھوں؟ اوفہ! یہ چالیں وہ چلے جسے پھیلنے کی چاہ ہو۔ یہاں تو سرٹ کر رہنا چاہتے ہیں۔ پاپا سُنتے ہی جھلا اُٹھیں گے۔ سارا الزام میرے ہی سر تھوپیں گے۔ میں ہی کوتاہ فہم نامصلحت شناس۔ ناتجربہ کار رہوں ضرور رہوں۔ جسے دنیا میں رہ کر دُنیاداری نہ آئے وہ ضرور خردماغ ہے۔ پاپا ناخوش ہوں گے۔ میں خاموشی سے اُن کی ناخوشی برداشت کروں گا۔ اگر وہ میری طرف سے مایوس ہوکر یہ کارخانہ کھولنے کا ارادہ ترک کردیں تو میں مُنہ مانگی مُراد پا جاؤں ؛؛

لیکن پربھوسیوک کو کتنا تعجب ہوا جب سارا ماجرا سُن کر بھی جان سیوک کے چہرہ پر غصہ کی کوئی علامت نمودار نہ ہوئی۔ یہ خاموشی تنبیہہ و تہدید سے زیادہ ناقابل برداشت تھی۔ پربھوسیوک چاہتے تھے کہ پاپا مجھے خوب تنبیہہ کریں کہ مجھے اپنی صفائی دینے کا موقع ملے۔ میں ثابت کردوں کہ اس ناگوار واقعہ کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میرے بجائے کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اُس پر بھی یہی افتاد پڑتی۔ اُنہوں نے دو ایک بار اپنے والد کے غصہ کو مشتعل کرنے کی کوشش کی لیکن جان سیوک نے صرف ایک مرتبہ اُن کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ اور اُٹھ کر چلے گئے۔ کسی شاعر کی داد پانے کی تمنا سامعین کے سکوت سے اتنی برباد نہ ہوئی ہوگی!

مسٹر جان سیوک چھلکے ہوئے دودھ پر آنسو نہ بہاتے تھے۔

پربھو سیوک کے کام کی بُرائی کرنا بے سُود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُنہوں نے خود ہی اس جذبہ کی پرورش کی تھی۔ سوچنے لگے "اس گتھی کو کیسے سلجھاؤں؟ نایک رام محلّہ کا مکھیا ہے۔ سارا محلّہ اُس کے اشارہ پر ناچتا ہے۔ سورداس تو محض بڑا دُنیا بیت ہے اور نایک رام مکھیا ہی نہیں ہے بلکہ شہر کا مشہور گُنڈا بھی ہے۔ بڑی خیریت ہوئی کہ پربھو سیوک وہاں سے جیتا جاگتا لوٹ آیا۔ راجہ صاحب بڑی مشکل سے راہ راست پر آئے تھے۔ نایک رام اُن سے ضرور فریاد کرے گا۔ اب کے ہماری زیادتی ثابت ہوگی۔ راجہ صاحب کو سرمایہ داروں سے یونہی چڑ ہے۔ یہ حال سُنتے ہی جامہ سے باہر ہو جائیں گے۔ پھر کسی طرح اُن کا مُنہ سیدھا نہ ہوگا" ساری رات جان سیوک اسی اُدھیڑ بُن میں پڑے رہے دفعتاً اُنہیں ایک بات سوجھی۔ چہرہ پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی "ممکن ہے یہ چال سیدھی پڑ جائے تو بگڑا ہوا کام پھر بن جائے"۔ صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد فٹن تیار کرائی اور پانڈے پور روانہ ہو گئے۔

نایک رام نے پیروں میں پٹیاں باندھ لی تھیں۔ بدن میں ہلدی کی مالش کرائے ہوئے تھے۔ ایک ڈولی منگوا رکھی تھی اور راجہ صاحب کے پاس جانے کو تیار تھے۔ ابھی صورت میں دو چار پَل کی کسر تھی۔ بجرنگی اور جگدھر بھی ساتھ جانے والے تھے۔ یکایک فٹن پہنچی تو لوگ متحیّر ہو گئے۔ ایک لمحہ میں سارا محلّہ آکر جمع ہو گیا کہ آج کیا ہوگا؟

جان سیوک نایک رام کے پاس جا کر بولے "آپ ہی کا نام نایک رام پانڈے ہے نہ؟ میں آپ سے کل کی باتوں کے لئے معافی مانگنے آیا ہوں

جونہی لڑکے نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور رات زیادہ نہ گئی ہوتی تو میں اُسی وقت آپ کے پاس آتا۔ لڑکا نالایق اور ناتجربہ کار ہے۔ کتنا ہی چاہتا ہوں کہ اُس میں ذرا آدمیت آجائے پر ایسی اُلٹی سمجھ ہے کہ کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔ پڑھنے کے لئے ولایت بھیجا وہاں سے بھی پاس ہو آیا۔ لیکن آدمیت نہ آئی اُس کی نادانی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اتنے آدمیوں کے بیچ میں وہ آپ سے بے ادبی کر بیٹھا۔ اگر کوئی آدمی شیر پر پتھر پھینکے تو یہ اس کی بہادری نہیں بلکہ نادانی ہے۔ ایسا شخص رحم کے قابل ہے کیونکہ دیر میں یا جلد ہی وہ شیر کے مُنہ کا لقمہ بن جائے گا۔ اس لونڈے کی بجنسہٖ یہی حالت ہے۔ آپ نے مروّت نہ کی ہوتی۔ تحمل سے کام نہ لیا ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ جب آپ نے اتنی رعایت کی ہے تو دل سے ملال بھی نکال ڈالئے"۔

نایک رام چارپائی پر لیٹ گئے گویا کھڑے رہنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ بولے ٹیڈ صاحب! دل سے ملال، تو نہ نکلے گا چاہے جان نکل جائے۔ اِسے چاہے ہم لوگوں کی مروّت کہئے چاہے اُن کی تقدیر کہئے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے گئے۔ لیکن ملال تو دل میں بنا ہوا ہے۔ وہ تبھی نکلے گا جب ہم دونوں میں سے ایک نہ رہے گا۔ رہی بھل منسی سو بھگوان نے چاہا تو جلد ہی سیکھ جائیں گے۔ بس ایک بار ہمارے ہاتھ میں پھر پڑ جانے دیجئے ہم نے بڑے بڑوں کو بھلامانس بنا دیا۔ اُن کی کیا ہستی ہے؟

جان سیوک۔ اگر آپ اتنی آسانی سے اُسے بھل منسی سکھا سکیں تو کہئے

آپ ہی کے پاس بھیج دوں۔ میں تو سب کچھ کھو کے ہار گیا *
نایک رام۔ بولو بھائی بجرنگی۔ صاحب کی باتوں کا جواب دو۔ مجھ سے تو بولا نہیں جاتا۔ رات کراہ کراہ کر کاٹی ہے۔ صاحب کہتے ہیں ماپھ (معاف) کر دو۔ دل میں ملال نہ رکھو۔ میں تو یہ سب بیوپار نہیں جانتا۔ یہاں تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا سیکھا ہے *
بجرنگی۔ صاحب لوگوں کا بھی دستور ہے پہلے تو مارتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ ہمارے اوپر بھی مار پڑا چاہتی ہے تو چٹ کہتے ہیں۔ ماپھ کر دو۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس نے مار کھائی ہے اُس کو بنا مارے کیسے تسکین ہوگی *
جان سیوک۔ تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ معافی انتقام کے خوف سے نہیں مانگی جاتی۔ خوف سے آدمی چھپ جاتا ہے۔ دوسروں کی مدد مانگنے دوڑتا ہے۔ معافی نہیں مانگتا۔ معافی آدمی اُسی وقت مانگتا ہے جب اُس کو اپنی بے انصافی اور زیادتی کا یقین ہو جاتا ہے اور جب اُس کا دل اُسے شرمندہ کرنے لگتا ہے۔ پربھو سیوک سے تم معافی مانگنے کو کہو تو ہرگز نہ مانے گا۔ تم اُس کی گردن پر تلوار چلا کر بھی اُس کے منہ سے معافی کا ایک لفظ نہیں نکلوا سکتے۔ اگر یقین نہ ہو تو اُس کا امتحان لے لو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ سمجھتا ہے۔ میں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے اُن لوگوں نے گالیاں دیں۔ لیکن میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ آپ لوگوں نے اُس کو گالیاں دی ہوں گی۔ شریف آدمی نہ گالیاں دیتا ہے۔ نہ گالیاں سُنتا ہے میں جو معافی مانگ رہا ہوں تو اس لئے کہ مجھے یہاں سراسر اُس کی زیادتی

معلوم ہوتی ہے۔ میں اُس کی حرکت پر دل سے نادم ہوں اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے اُس کو یہاں کیوں آنے دیا سچ پوچھئے تو اب مجھے یہی پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں نے اس زمین کو لینے کی بات ہی کیوں اُٹھائی؟ آپ لوگوں نے میرے ملازم کو مارا۔ میں نے پولیس میں رپورٹ تک نہ کی۔ میں نے قصد کر لیا کہ اب اس زمین کا نام نہ لوں گا میں آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ آپ لوگوں کو اُجاڑ کر اپنا گھر نہیں بنانا چاہتا۔ اگر تم لوگ خوشی سے دو گے تو لوں گا ورنہ چھوڑ دوں گا۔ کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے۔ جب تک آپ لوگ مجھے معاف نہ کر دیں گے میرے دل کو چین نہ آئے گا"

شرارت سادگی کی محض ایک خوفناک شکل ہے۔ صاحب کی شیریں بیانی نے نایک رام کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ کوئی دوسرا شخص اتنی ہی آسانی سے اُس کو صاحب کی گردن پر تلوار چلانے کے لئے آمادہ کر سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ پربھوسیوک کو دیکھ کر اُس کے سر پر پھر خون سوار ہو جاتا۔ لیکن اس وقت صاحب کی باتوں نے اس پر جادو سا کر دیا۔ بولا "کہو بجرنگی۔ کیا کہتے ہو؟"

بجرنگی۔ کہنا کیا ہے؟ جو اپنے سامنے سر جھکائے اُس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ صاحب بہادر بھی تو کہتے ہیں کہ اب ہم جمیں (زمین) سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے تو ہمارے اور ان کے بیچ میں جھگڑا ہی کیا رہا؟

جگدھر۔ ہاں جھگڑے کا مٹ جانا ہی اچھا ہے۔ عداوت اور لڑائی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بھیرو۔ چھوٹے صاحب کو چاہئیے کہ آکر پنڈا جی سے اپنی (معافی) مانگیں اب وہ کوئی چھوٹے بچے نہیں ہیں کہ آپ اُن کی طرف سے سپارس کریں۔ چھوٹا لڑکا ہوتا تو دوسری بات تھی تب ہم لوگ آپ ہی کو اولنہا دیتے۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مونچھ داڑھی نکل آئی ہے۔ اُنہیں خود آکر پنڈا جی سے کہنا سُننا چاہئیے ۔

نایک رام۔ ہاں یہ بات پکّی ہے۔ جب تک وہ تھوک کر نہ چاٹیں گے میرے دل سے ملال نہ دور ہوگا ۔

جان سیوک۔ تو تم سمجھتے ہو کہ داڑھی مونچھ آجانے سے عقل بھی آ جاتی ہے؟ کیا ایسے آدمی نہیں دیکھے ہیں۔ جن کے بال پک گئے ہیں۔ دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ اور ابھی تک عقل نہیں آئی؟ پربھو سیوک اگر بے عقل نہ ہوتا تو اتنے آدمیوں کے بیچ میں پنڈا جی جیسے پہلوان پر ہاتھ نہ چلاتا۔ اُسے تم کتنا ہی دباؤ پر وہ معافی نہ مانگے گا۔ رہی زمین کی بات۔ سو اگر تم لوگوں کی مرضی ہے کہ اِس معاملہ کو دبا رہنے دوں تو یہی سہی۔ مگر شاید ابھی تک تم لوگوں نے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ ورنہ کبھی مخالفت نہ کرتے۔ بتلائیے پنڈا جی آپ کو اِس معاملہ میں کیا اعتراض ہے؟

نایک رام۔ بھیرو اس کا جواب دو۔ اب تو صاحب نے تم کو قائل (دقائل) کر دیا۔

بھیرو۔ قائل کیا کر دیا۔ صاحب یہی کہتے ہیں نا کہ چھوٹے صاحب کو اکل (عقل) نہیں ہے تو وہ کنوئیں میں کیوں نہیں کود پڑتے؟ اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ کیوں نہیں کاٹ لیتے؟ ایسے آدمیوں کو کوئی کیسے

پاگل سمجھ لیں ؟

جان سیوک - جو آدمی یہ نہ سمجھے کہ کس موقع پر کون کام کرنا چاہئے - وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے ؟

نایک رام - صاحب انہیں میں پاگل تو کسی طرح نہ مانوں گا - ہاں آپ کا منہ دیکھ کے اُن سے بہتر نہ بڑھاؤں گا - آپ کی بنتی نے میرا سر جھکا دیا - سچ کہتا ہوں آپ کی تحمل منسی نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا - نہیں تو میرے دل میں نہ جانے کتنا گبار (غبار) بھرا ہوا تھا - اگر آپ تھوڑی دیر اور نہ آتے تو آج شام تک چھوٹے صاحب اسپتال میں ہوتے آج تک کبھی میری پیٹھ میں دھول نہیں لگی - جندگی (زندگی) میں پہلی بار میری اتنی بیعزتی ہوئی اور پہلی بار میں نے ماپھ (معاف) کرنا بھی سیکھا - یہ آپ کی عقل کی برکت ہے - میں آپ کی کھوپڑی کو مان گیا - اب صاحب کی دوسری بات کا جواب دو - بجرنگی ؟

بجرنگی - اس میں اب کا ہے کا سوال جواب ؟ صاحب نے تو کہہ دیا کہ میں اس کا نام نہ لوں گا - بس جھگڑا مٹ گیا ۔

جان سیوک - لیکن اگر اس زمین کے میرے ہاتھ میں آنے سے تمہارا سولہوں آنے فائدہ ہو تو بھی تم ہمیں نہ لینے دو گے ۔

بجرنگی - ہمارا پھائدہ کیا ہوگا ؟ ہم تو مٹی میں مل جائیں گے !

جان سیوک - میں تو دکھا دوں گا - کہ تمہارا بھرم ہے بتلاؤ تمہیں کیا اعتراض ہے ؟

بجرنگی - پنڈا جی کے ہزاروں جاتری آتے ہیں وہ سب اسی میدان میں ٹھہرتے ہیں - دس دس بیس بیس دن پڑے رہتے ہیں - وہیں

تا پکاتے ہیں۔ وہیں سوتے ہیں۔ شہر کے دھرمسالوں میں دیہات
لوگوں کو آرام کہاں؟ یہ دھرتی نہ رہے تو کوئی جاتری یہاں
انکنے بھی نہ آئے۔

ان سیوک۔ جاتریوں کے لئے سڑک کے کنارے کھپریل کے
انات بنوا دیئے جائیں تو کیسا؟

رنگی۔ اتنے مکان کون بنوائے گا؟

ان سیوک۔ اس کا میرا ذمہ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہاں
رم شالا بنوا دوں گا۔

بجرنگی۔ میرے محلے کے دوسرے آدمیوں کی گائیں بھینسیں کہاں
یں گی؟

ان سیوک۔ احاطہ میں گھاس چرانے کا تمہیں اختیار رہے گا۔
راب تم کو اپنا سارا دودھ لے کر شہر جانا پڑتا ہے۔ حلوائی تم سے
دودھ لے کر ملائی، مکھن، دہی بناتا ہے اور تم سے کہیں زیادہ خوشحال
ر آتا ہے۔ یہ نفع اُس کو تمہارے ہی دودھ سے تو ہوتا ہے؟ تم ابھی
ان ملائی مکھن بناؤ تو لے گا کون؟ جب یہاں کارخانہ کھل جائے گا۔
ہزاروں آدمیوں کی بستی ہو جائے گی۔ تم دودھ کی بالائی بیچو گے۔
دودھ علیحدہ بکے گا۔ اس طرح تمہیں دوہرا منافع ہو گا۔ تمہارے
پلے گھر بیٹھے بک جائیں گے۔ تمہیں تو کارخانہ کھلنے سے سب نفع ہی
نفع ہے۔

یک رام۔ آتا ہے سمجھ میں نا بجرنگی۔

بجرنگی۔ سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ لیکن ایک میں دودھ کی ملائی بنا

لوں گا۔ اور لوگ بھی تو ہیں جو دودھ کھانے کے لئے جانور پالے ہوئے ہیں اُنہیں تو مشکل پڑے گی ؛

ٹھاکر دین۔ میرے ہی ایک گائے ہے چوروں کا بس چلتا تو اسے بھی لے گئے ہوتے۔ دن بھر دہاں چرتی ہے۔ سانجھ سبیرے (سویرے) دودھ دوہ کر چھوڑ دیتا ہوں۔ دھیلے کا بھی چارا نہیں لینا پڑتا جب تو آٹھ آنے روج (روز) کا بھوسہ بھی پورا نہ پڑے گا ؛

جان سیوک۔ تمہاری پان کی دوکان ہے نا۔ ابھی تم دس بارہ آنے کے پیسے کماتے ہوگے۔ اُس وقت تمہاری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ اِدھر کی کمی اُدھر پوری ہو جائے گی۔ مزدوروں کو پیسے کی پکڑ نہیں ہوتی۔ کام سے ذرا فرصت ہوئی کہ کوئی پان پر گرا کوئی سگریٹ پر دوڑا۔ خوانچہ والوں کو بھی خاصی بکری ہوگی اور شراب تاڑی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چاہے تو پانی کو شراب بنا کر بیچو۔ گاڑی والوں کی مزدوری بڑھ جائے گی۔ یہی محلہ چوک کا ٹکڑا ہو جائے گا۔ ابھی تمہارے لڑکے پڑھنے کے لئے شہر جاتے ہیں۔ تب یہیں مدرسہ کھل جائے گا ؛

جگدھر۔ کیا یہاں مدرسہ بھی کھلے گا ؟

جان سیوک۔ ہاں کارخانہ کے آدمیوں کے لڑکے آخر پڑھنے کہاں جائیں گے ؟ انگریزی بھی پڑھائی جائے گی ؛

جگدھر۔ فیس کچھ کم لی جائے گی ؟

جان سیوک۔ فیس بالکل ہی نہ لی جائے گی۔ کم زیادہ کیسی ؛

جگدھر۔ تب تو بڑا آرام ہو جائے گا ؛

نایک رام۔ جس کا مال ہے اُسے کیا ملے گا ؟

جان سیوک۔ جو تم لوگ طے کر دو۔ میں تمہیں کو پنچ مانتا ہوں۔ بس اسے راضی کرنا تمہارا کام ہے۔

نایک رام۔ وہ راجی ہی ہے۔ آپ نے بات کی بات میں سب کو راجی کر لیا نہیں تو یہاں لوگ مَن میں نہ جانے کیا کیا سمجھے بیٹھے تھے۔ سچ ہے بدیا بڑی چیز ہے۔

بھیرو۔ وہاں تاڑی کی دوکان کے لئے کچھ دینا تو نہ پڑے گا؟

نایک رام۔ کوئی اور کھڑا ہو گیا تو ضرور چڑھا اُپری ہوگی۔

جان سیوک۔ نہیں تمہارا حق سب سے بڑھ کر سمجھا جائے گا۔

نایک رام۔ تو پھر تمہاری چاندی ہے۔ بھیرو۔

جان سیوک۔ تو اب میں چلوں پنڈا جی۔ آپ کے دل میں ملال تو نہیں ہے؟

نایک رام۔ اب کچھ کہلائیے نا۔ آپ کا سا بھلا مانس آدمی کم دیکھا۔

جان سیوک چلے گئے تو بجرنگی نے کہا "کہیں سورداس راجی نہ ہوئے تو؟"

نایک رام۔ ہم تو راجی کریں گے۔ چار بچار روپے دلانے چاہئیے۔ اب اسی سمجھوتہ میں کُشل ہے۔ جمین (زمین) رہ نہیں سکتی۔ وہ آدمی اتنا بشیار ہے کہ ہم لوگ اُس سے پیش نہیں پا سکتے۔ یوں ہی نکل جائے گی۔ تو ہمارے ساتھ یہ سلوک کون کرے گا؟ مفت میں جس ملتا ہو تو چھوڑنا نہ چاہئیے۔

جان سیوک گھر پہنچے تو ڈنر تیار تھا۔ پربھو سیوک نے پوچھا "آپ کہاں گئے تھے"؟ جان سیوک نے رومال سے مُنہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہر

ایک کام کرنے کو تمیز چاہئے۔ اشعار کہہ لینا دوسری بات ہے کام کر دکھانا دوسری بات! تم ایک کام کرنے گئے محلہ بھر سے لڑائی ٹھان کر چلے آئے۔ جس وقت میں پہنچا ہوں سارے آدمی ٹائیک رام کے دروازہ پر جمع تھے۔ وہ ڈولی پر بیٹھ کر شاید راجہ جھلیندر سنگھ کے پاس جانے کو تیار تھا۔ مجھے سب نے یوں دیکھا گویا پھاڑ کھائیں گے۔ لیکن میں نے کچھ اِس طرح تحمل اور انکسار سے کام لیا۔ اُن کو دلیلوں اور چکنی چپڑی باتوں سے ایسا ڈھرے پر لایا کہ جب وہاں سے چلا تو سب میرا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ زمین کا معاملہ بھی طے ہو گیا اُس کے ملنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں"۔

پربھو سیوک۔ پہلے تو سب اُس زمین کے لئے مرنے مارنے پر تیار تھے۔

جان سیوک۔ اور کچھ کسر تھی تو وہ تم نے جا کر پوری کر دی۔ مگر یاد رکھو کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ "ڈرامیٹک مومنٹ" پر نگاہ رکھنی چاہئے۔ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ شکاری جانتا ہے کس وقت ہرن پر نشانہ مارنا چاہئے۔ وکیل جانتا ہے عدالت پر اُس کی دلیلوں کا بہترین اثر کب پڑ سکتا ہے۔ آج سے مہینہ نہیں ایک دن پہلے میری باتوں کا ان آدمیوں پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ کل تمہاری زیادتیوں نے وہ موقع پیدا کر دیا۔ میں معافی کا خواستگار بن کر اُن کے سامنے گیا۔ مجھے دب کر جھک کر، عاجزی سے انکسار سے اپنے مسئلہ کو اُن کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا۔ اگر اُن کی زیادتی ہوتی تو میری جانب سے بھی سختی کا اظہار ہوتا۔ اُسی حالت میں دبنا آئین اخلاق کے خلاف ہوتا۔ زیادتی ہماری طرف سے ہوئی۔ بس یہی میری جیت تھی۔

ایشور سیوک بولے۔ "یسوع! اس گناہگار کو اپنے دامن میں لے۔ برف آج کل بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کیوں اتنی بیدردی سے خرچ کی جاتی ہے۔ صراحی کا پانی تو کافی ٹھنڈا ہوتا ہے"۔
جان سیوک۔ پاپا معاف کیجئے۔ بلا برف کے پیاس ہی نہیں بجھتی۔
ایشور سیوک۔ خدانے چاہا بیٹا۔ تو اس زمین کا معاملہ طے ہو جائیگا آج تم نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔
مسز سیوک۔ مجھے ان ہندوستانیوں پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔ دغابازی کوئی ان سے سیکھ لے۔ ابھی سب کے سب ہاں ہاں کر رہے ہیں موقع پڑنے پر سب نکل جائیں گے۔ بھیندر سنگھ ہی نے دھوکا نہیں دیا۔ یہ قوم ہی ہماری دشمن ہے۔ ان کا بس چلے تو ایک عیسائی بھی ملک میں نہ رہنے پائے۔
پربھو سیوک۔ ماما۔ یہ آپ کی زیادتی ہے۔ پہلے ہندوستانیوں کو عیسائیوں سے کتنی نفرت رہی ہو لیکن اب حالت تبدیل ہوگئی ہے۔ ہم خود انگریزوں کی نقل کرکے انھیں چڑاتے ہیں۔ ہر موقع پر انگریزوں کی مدد سے انھیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ ہماری سیاسی غلطی ہے۔ ہماری نجات اہل ملک کے ساتھ برادرانہ تعلق رکھنے میں ہے ان پر رعب جمانے میں نہیں۔ آخر ہم بھی تو اسی بھارت ماتا کی اولاد ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے کہ گوری قومیں صرف مذہب کے تعلق سے ہمارے ساتھ برابری کا برتاؤ کریں۔ امریکہ کے حبشی عیسائی ہیں لیکن وہاں کے گورے ان کے ساتھ کتنا وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ ہماری نجات ہندوستانیوں ہی کے ساتھ ہے۔

مسز سیلوک۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم اِن کافروں کی دوستی کو اپنی نجات کا ذریعہ بنائیں۔ ہم حکمرانوں کے ہم مذہب ہیں۔ ہمارا مذہب ہمارا رواج۔ ہمارا طرزِ معاشرت وہی ہے جو انگریزوں کا ہے۔ ہم اور وہ ایک کلیسا میں ایک خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ ہم اس ملک میں حاکم بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ محکوم بن کر نہیں۔ تمہیں شاید کنور بھرت سنگھ نے یہ کلمہ پڑھایا ہے۔ کچھ دن اور اُن کی صحبت میں رہ کر شاید تم بھی یسوع سے منکر ہو جاؤ ✤

پربھو سیلوک۔ مجھے تو عیسائیوں میں بیداری کے کوئی خاص آثار نظر نہیں آتے ✤

جان سیلوک۔ پربھو سیوک۔ تم نے ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ میرے خیال میں ہمارا مفاد انگریزوں سے رشتۂ اخوت قائم کرنے میں ہے۔ انگریز اس وقت ہندوستانیوں کی متفقہ قوت سے متردد ہو رہے ہیں۔ ہم انگریزوں کے دوست بن کر اُن پر اپنی وفاداری کا سکہ جما سکتے ہیں اور من مانی رعایتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ افسوس یہی ہے کہ ہماری قوم نے ابھی تک سیاسی میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ حالانکہ ملک میں ہماری جماعت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے مگر سیاسی دائرہ میں اب تک ہم کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔ ہندوستانیوں میں مل کر ہم گم ہو جائیں گے۔ کھو جائیں گے۔ اُن سے الگ رہ کر خاص اقتدار اور خاص عزت حاصل کر سکتے ہیں ✤

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چپڑاسی نے آکر ایک خط دیا۔ یہ خط مسٹر کلارک حاکم ضلع کا تھا۔ اُن کے یہاں ولایت سے کئی مہمان آئے

ہوئے تھے۔ کلارک نے اُن کی خاطر سے ایک ڈنر دیا تھا اور مسز سیوک کو معہ مس صوفیہ سیوک کے اُس میں شریک ہونے کے لئے بلایا تھا۔ ساتھ ہی مسز سیوک سے یہ اصرار بھی کیا گیا تھا کہ صوفیہ کو ایک ہفتہ کے لئے ضرور بلا لیجئے ۔

چپڑاسی کے چلے جانے پر مسز سیوک نے کہا "صوفی کے لئے یہ سنہرا موقع ہے "۔

جان سیوک۔ ہاں۔ ہے تو پر وہ آئے گی کیسے ؟

مسز سیوک۔ اُس کے پاس یہ خط بھیج دوں ؟

جان سیوک۔ صوفی اُس کو کھول کر دیکھے گی بھی نہیں۔ تُم سے جا کر بلا کیوں نہیں لاتیں ؟

مسز سیوک۔ وہ تو آتی ہی نہیں ۔

جان سیوک۔ تم نے کبھی بلایا ہی نہیں۔ آتی کیونکر ؟

مسز سیوک۔ وہ آنے کے لئے کیسی شرط لگاتی ہے ۔

جان سیوک۔ اگر اُس کی بھلائی چاہتی ہو تو اپنی شرطیں توڑ دو ۔

مسز سیوک۔ وہ گرجا نہ جائے تو بھی زبان نہ کھولوں ؟

جان سیوک۔ ہزاروں عیسائی کبھی گرجا نہیں جاتے اور انگریز تو بہت کم جاتے ہیں ۔

مسز سیوک۔ خداوند یسوع کی توہین کرے تو بھی چپ رہوں ؟

جان سیوک۔ وہ یسوع کی توہین نہیں کرتی۔ جسے خدا نے ذرا بھی عقل دی ہے وہ خداوند یسوع کی دل و جان سے عزت کرے گا۔ سندھ تک یسوع کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔ اگر صوفی یسوع کو اپنا نجات

دہندہ خدا کا بیٹا یا خدا نہیں سمجھتی تو اس پر جبر کیوں کیا جائے۔ کہتے ہیں عیسائیوں کو اس قسم کے شکوک ہیں خواہ وہ اُنہیں علانیہ نہ بیان کریں میرے خیال میں اگر کوئی شخص نیک کاموں کو کرتا ہوا زندگی بسر کرتا ہے اور دل میں ویسے ہی خیالات رکھتا ہے تو وہ اُس مسیحی سے کہیں بہتر ہے جو مسیح کا نام تو جپتا ہے پر نیت کا بُرا ہے ❊

ایشور سیوک - یا خدا اس خاندان پر اپنا سایہ پھیلا! بیٹا! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ مسیح کا بندہ کبھی راہ راست سے منحرف نہیں ہو سکتا اُس پر مسیح کی نظر نوازش رہتی ہے ❊

جان سیوک (بیوی سے) تم کل صبح چلی جاؤ۔ رانی سے ملاقات ہو جائے گی اور صوفی کو بھی ساتھ لیتی آؤ گی ❊

مسز سیوک - اب تو جانا پڑے گا۔ جی تو نہیں چاہتا پر جاؤں گی اُسی کی ہٹ رہے ❊

x x x x x

سورداس شام کو گھر آیا۔ اُس نے سارا حال سُنا تو نایک رام بولا "تم نے میری دھرتی صاحب کو دے دی؟"

نایک رام - میں نے کیوں دی؟ مجھ سے واسطہ؟

سورداس - میں تو تمہیں کو سب کچھ سمجھتا تھا اور تمہارے ہی بل کودتا تھا پر آج تم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اچھی بات ہے۔ میری بھول تھی کہ تمہارے بل پر پھولا ہوا تھا۔ یہ اُسی کا ڈنڈ ہے۔ اب نیائے کے بل پر لڑوں گا۔ بھگوان ہی کا بھروسہ کروں گا ❊

نایک رام - بجرنگی۔ جرا (ذرا) بھیرو کو بلالو۔ انہیں سب باتیں

دیہ۔ میں ان سے کہاں تک تلخ (مغز) لڑاؤں ؟

بجرنگی۔ بھیرو کو کیوں بلاؤں ؟ کیا میں اتنا بھی نہیں کرسکتا ؟ بھیرو کو اتنا سر چڑھا دیا اسی سے تو اس کو گھمنڈ ہوگیا ہے ۔

یہ کہہ کر بجرنگی نے جان سیوک کی ساری تجویزیں کم و بیش طریقہ پر بیان کردیں۔ اور بولا بتاؤ جب کارخانہ سے سب کا پھائدہ ہے تو ہم صاحب سے کیوں لڑیں ؟

سورداس۔ تمہیں بسواس ہوگیا کہ سب کا پھائدہ ہوگا ؟

بجرنگی۔ ہاں ہوگیا۔ ماننے لایق بات ہوتی ہے تو مانی ہی جاتی ہے۔

سورداس۔ کل تو تم لوگ دھرتی کے پیچھے جان دینے کو تیار تھے۔ مجھ پر شک کر رہے تھے کہ میں نے صاحب سے میل کرلیا۔ آج صاحب کے ایک ہی چکمہ میں پانی ہو گئے ۔

بجرنگی۔ اب تک کسی نے سب باتیں اتنی صفائی سے نہ سمجھائی تھیں۔ کارخانہ سے سارے محلے کا سارے سہر کا پھائدہ ہے۔ مجوروں کی مجوری بڑھے گی۔ دوکانداروں کی بکری بڑھے گی۔ تو اب ہم کو جھگڑا نہیں ہے تم کو بھی ہم یہی صلاح دیتے ہیں کہ چوکھے دام مل رہے ہیں۔ دھرتی کو دے ڈالو۔ یوں نہ دوگے تو جابطے سے لے لی جائے گی۔ اس سے کیا پھائدہ ؟

سورداس۔ ادھرم اور پاپ کتنا بڑھ جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہے ؟

بجرنگی۔ دھن سے ادھرم ہوتا ہی ہے پر دھن کو کوئی چھوڑ نہیں دیتا ۔

سورداس۔ تو اب تم لوگ میرا ساتھ نہ دوگے ؟ مت دو۔ جدھر نیائے ہے ادھر کسی کی مدد کی اتنی بھی جرورت نہیں ہے۔ میری چیج (چیز) ہے

باپ دادوں کی کمائی ہے۔ کسی دوسرے کا اُس پر کوئی اختیار نہیں ہے اگر دھرتی گئی تو اُس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی ۔

یہ کہہ کر سورداس اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر جاکر نیم کے نیچے لیٹ رہا ۔

(۱۳)

وِنے سنگھ کے جانے کے بعد صوفیہ کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ رانی جانہوی مجھ سے کچھ کشیدہ خاطر ہیں۔ وہ اب اس کو کتاب یا اخبار پڑھنے کے لئے یا خطوط لکھنے کے لئے بہت کم بلاتیں۔ اس کے حرکات و سکنات کو بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھتیں۔ اگرچہ وہ کنایتہً بھی اپنی بدگمانی کا اظہار نہ کرتیں۔ لیکن صوفیہ کو یہ خیال ہوتا کہ مجھ پر شک کیا جارہا ہے۔ وہ جب کبھی باغ میں سیر کرنے چلی جاتی یا کہیں گھومنے کو نکل جاتی تو واپس آنے پر اُس کو ایسا معلوم ہوتا کہ میری کتابیں اُلٹ پلٹ دی گئی ہیں۔ یہ بدگمانی اُس وقت اور بھی شاق گزرتی۔ جب ڈاکیہ کے آنے پر رانی صاحبہ خود ہی اُس کے ہاتھوں سے خطوط لیتیں اور نہایت غور سے دیکھتیں کہ صوفیہ کا کوئی خط تو نہیں ہے۔ کئی بار صوفیہ کو اپنے خطوں کے لفافے پھٹے ہوئے ملے۔ وہ اِن بدگمانیوں کے راز کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ روک تھام صرف اس لئے ہے کہ میرے اور ونے سنگھ کے درمیان خط کتابت نہ ہونے پائے۔ پہلے رانی صاحبہ صوفیہ سے ونے اور اندو کا تذکرہ اکثر کیا کرتیں۔ اب بھول کر بھی ونے کا نام نہ لیتیں۔ یہ محبت کا پہلا امتحان تھا!

مگر تعجب یہ تھا کہ صوفیہ میں اب وہ خودداری نہ تھی جو ناک پر مکھی

نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اب وہ نہایت بُردبار ہوگئی تھی۔ رانی سے نفرت کرنے کے بجائے وہ اُن کی بدگمانی دور کرنے کے لئے موقع و محل کی تلاش کیا کرتی تھی۔ اُس کو رانی صاحبہ کا طرزِ عمل بالکل قرین انصاف معلوم ہوتا تھا وہ سوچتی "اِن کی دلی تمنا ہے کہ ونے سنگھ کی زندگی ایک معیاری زندگی ہو اور میں اُن کی تربیت میں مخل نہ ہوں۔ میں انہیں کس طرح سمجھاؤں کہ آپ کی تمنا کو میرے ہاتھوں ذرا بھی جھونکا نہ لگے گا۔ میں تو خود ہی اپنی زندگی کو ایک ایسے مقصد کے لئے قربان کر چکی ہوں جس کے لئے وہ کافی نہیں۔ میں خود ہی کسی خواہش کو اپنے مقصد کے راستہ کا کانٹا نہ بناؤں گی۔" لیکن اُس کو ایسا موقع نہ ملتا تھا۔ جو باتیں زبان پر نہیں آ سکتیں اُن کے لئے کبھی موقع نہیں ملتا۔

صوفیہ کو اکثر اپنے دل کی کمزوریوں پر افسوس ہوتا۔ وہ اپنی طبیعت کو اِدھر سے ہٹانے کے لئے مطالعہ کتب میں محو ہو جانا چاہتی۔ لیکن جب کتاب سامنے کھلی رہتی اور دل کہیں اور جا پہنچتا تو وہ جھنجھلا کر کتاب بند کر دیتی اور یہ سوچتی "یہ میری کیا حالت ہے؟ کیا میرا نفس یہ بھیس اختیار کر کے مجھے راہِ راست سے ہٹا دینا چاہتا ہے؟ میں جان کر کیوں انجان بنی جاتی ہوں؟" تب وہ عہد کرتی کہ میں اس کانٹے کو دل سے نکال ڈالوں گی۔

لیکن مشق و محبت کے دلدادگان کا عہد بزدلوں کی تمنائے جنگ کے مشابہ ہے جو حریف کا نعرہ سنتے ہی ہوا ہو جاتی ہے۔ صوفیہ ونے کو تو بھول جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس کو اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ مجھے بھول نہ جائیں۔ جب کئی روز تک اُن کا کوئی حال نہ ملا تو اُس نے سمجھا

"مجھے بھول گئے۔ ضرور بھول گئے۔ مجھے اُن کا پتہ معلوم ہوتا تو شاید ہر روز ایک خط لکھتی۔ روز کئی کئی خط بھیجتی۔ مگر اُن کو ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ وہ مجھے بھول جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ وہ ایک عیسائی عورت سے کیوں محبت کرنے لگے؟ اُن کے لئے کیا ایک سے ایک نہایت خوب صورت تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق راجکماریاں نہیں ہیں؟"

ایک روز ان خیالات نے اُس کو اس قدر بیتاب کیا کہ وہ رانی کے کمرہ میں جا کر ونے کے خطوط کو پڑھنے لگی۔ دم کے دم میں اُس نے سارے خطوط پڑھ ڈالے۔ دیکھوں میری طرف کوئی اشارہ ہے یا نہیں؟ کوئی فقرہ ایسا ہے جس میں سے محبت کی خوشبو آئے؟ لیکن ایسا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ جس سے کھینچ تان کرنے پر بھی وہ کوئی پوشیدہ بات پیدا کر سکتی۔ ہاں اُس کوہستانی علاقہ میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کا مفصل تذکرہ کیا گیا تھا۔ جوان العمری کو مبالغہ سے اُنس ہوتا ہے۔ ہم مشکلات پر فتح پا کر نہیں بلکہ اُن کی طولانی صراحت سے اپنا وقار دلوں پر قایم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر معمولی جرارت ہے تو اُسے سرسامی بخار کہا جاتا ہے۔ ایک روز پہاڑوں پر چلنا پڑا تو اُسے رفعتہً پہاڑوں سے سر ٹکرانا بتلایا جاتا ہے۔ ونے سنگھ کے خطوط اسی قسم کی بہادرانہ داستانوں سے معمور تھے۔ سوفیہ پڑھ کر بیقرار ہو گئی۔ وہ اتنی سختیاں جھیل رہے ہیں اور میں یہاں آرام سے پڑی ہوں۔ وہ اسی سراسیمگی کی حالت میں اپنے کمرہ میں آئی اور ونے کو ایک طولانی خط

نہایت دردناک الفاظ میں استدعا کی کہ مجھے اپنی خدمت میں آنے کی اجازت دیجئے۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ اُس کا انداز بیان نادانستہ طور پر شاعرانہ ہوگیا۔ خط پورا کرکے وہ اُسی وقت قریب کے لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

خط چھوڑ دینے کے بعد جب اُس کو سکون ہوا تو اسے خیال آیا کہ رانی صاحبہ کے کمرہ میں چھپ کر جانا اور خطوں کو پڑھنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ وہ سارا دن اسی فکر میں پڑی رہی۔ بار بار اپنے کو ملامت کرتی۔ ایشور میں کتنی بدنصیب ہوں۔ میں نے اپنی زندگی سچے مذہب کی تلاش کے لئے وقف کر دی تھی۔ برسوں سچائی کی تحقیقات میں مصروف ہوں مگر نفس کی پہلی ہی ٹھوکر میں پیچھے گر پڑی۔ میں کیوں اتنی کمزور ہو گئی ہوں؟ کیا میرا پاک مقصد نفسانی خواہشات کے بھنور میں پڑ کر ڈوب جائے گا؟ میری عادت اتنی بُری ہو جائے گی کہ میں کسی کی چیزیں چراؤں گی۔ یہ بات تو کبھی میرے خواب وخیال میں بھی نہ آئی تھی۔ جن کا مجھ پر اتنا اعتبار۔ اتنا بھروسہ۔ اتنی محبت۔ اتنی مہربانی ہے اُنہیں کے ساتھ میری یہ دغابازی! اگر ابھی یہ حالت ہے تو بھگوان ہی جانے۔ آگے چل کر کیا حالت ہو گی؟ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ کاش وہ خط جسے میں ابھی ڈال آئی ہوں۔ واپس مل جاتا تو میں اُس کو ابھی چاک کر ڈالتی!

وہ اسی تفکر و پشیمانی کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رانی صاحبہ کمرہ میں آگئیں۔ صوفیہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی آنکھیں چھپانے کے لئے زمین کی طرف تاکنے لگی۔ لیکن آنسو پی جانا آسان نہیں ہے۔ رانی

نے کرخت آواز میں پوچھا "صوفی کیوں روتی ہو؟"
جب ہم اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں تو سچ بات خود بخود ہمارے منہ سے نکل پڑتی ہے۔ صوفی ہچکتی ہوئی بولی "جی کچھ نہیں . . . . . مجھ سے ایک خطا سرزد ہوگئی ہے۔ آپ سے اس کی معافی چاہتی ہوں۔"
رانی نے زیادہ کرخت لہجہ میں پوچھا "کیا بات ہے؟"
صوفی۔ آج جب آپ سیر کرنے گئی تھیں تو میں آپ کے کمرہ میں چلی گئی تھی۔
رانی۔ کیا کام تھا؟
صوفی کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ بولی "میں نے آپ کی کوئی چیز نہیں چھوئی۔"
رانی۔ میں تم کو اتنا نیچ نہیں سمجھتی۔
صوفی۔ ایک . . . . . . ایک خط دیکھنا تھا۔
رانی۔ ونے سنگھ کا؟
صوفیہ نے سر جھکا لیا۔ وہ اپنی نگاہوں میں خود اتنی ذلیل ہوگئی تھی کہ جی چاہتا تھا۔ زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ رانی نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا "صوفی! تم مجھ کو احسان فراموش سمجھوگی۔ مگر میں نے تمہیں اپنے گھر میں رکھ کر بڑی غلطی کی۔ ایسی غلطی میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم آستین کا سانپ بنوگی۔ اس سے بہت بہتر ہوتا کہ ونے اسی روز آگ میں جل گیا ہوتا تب مجھے اس قدر رنج نہ ہوتا۔ میں تمہارے طرزِ عمل کو پہلے نہ سمجھی۔ میری آنکھوں پر پردہ پڑا تھا۔ تم جانتی ہو میں نے کیوں ونے کو اتنی جلدی یہاں

سے بھگا دیا؟ تمہاری ہی وجہ سے تمہاری محبت کے حملوں سے بچانے
کی غرض سے۔ لیکن اب بھی تم قسمت کی طرح اس کا دامن نہیں چھوڑتیں
آخر تم اُس سے کیا چاہتی ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ تم سے اُس کا بیاہ
نہیں ہو سکتا۔ اگر میں حیثیت اور خاندانی رواج کا لحاظ نہ کروں تو
بھی تمہارے اور ہمارے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی ہے۔ اس
محبت کا نتیجہ اُس کے سوا اور کیا ہوگا کہ تم اپنے ساتھ اُس کو بھی لے ڈوبوگی
اور میری دیرینہ تمناؤں کو خاک میں ملا دوگی۔ میں ونے کو ایسا انسان
بنانا چاہتی ہوں جس پر قوم کو فخر ہو۔ جس کے دل میں لگن ہو ہمت ہو
استقلال ہو۔ جو خطرات کے سامنے منہ نہ موڑے۔ جو قوم کی خدمت کے
لئے ہمیشہ سر کو ہتھیلی پر لئے رہے۔ جس میں نفس پروری کا شائبہ بھی نہ
ہو۔ جو خود کو دھرم پر قربان کردے۔ میں اُسے سپوت بیٹا۔ وفادار دوست
اور بےغرض خادم بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے اُس کی شادی کا شوق نہیں
اپنے پوتوں کو گود میں کھلانے کی خواہش نہیں۔ ملک میں نفس پرست
مردوں اور اولاد پرست عورتوں کی کمی نہیں۔ زمین اُن کے بوجھ سے دبی
جاتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو سچا راجپوت بنانا چاہتی ہوں۔ آج وہ کسی
کی حفاظت کے لئے اپنی جان دے دے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب
ماں دنیا میں نہ ہوگی۔ تم میرے اس سنہرے خواب کو پریشان کر رہی ہو
میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ صوفی! اگر میں تمہارے احسانات کے بوجھ سے
دبی نہ ہوتی تو تمہیں اس حالت میں زہر دے کر راستہ سے ہٹا دینا اپنا فرض
سمجھتی۔ میں راجپوتنی ہوں۔ مرنا بھی جانتی ہوں اور مارنا بھی۔ اس کے قبل
کہ ونے سے تمہیں خط کتابت کرتے دیکھوں۔ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی؛

میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ونے کو اپنے دامِ محبت میں پھنسانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ اُس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ تمہیں ایشور نے فہم و فراست عطا کی ہے عقل سے کام لو۔ میرے خاندان کو یک لخت تباہ مت کرو "۔

صوفی نے روتے ہوئے کہا "مجھے اجازت دیجئے۔ آج یہاں سے چلی جاؤں "۔

رانی کچھ نرم ہو کر بولیں "میں تمہیں جانے کو نہیں کہتی۔ تم میرے سر آنکھوں پر رہو (نادم ہو کر) میری زبان سے اس وقت جو ثقیل الفاظ نکلے ہیں اُن کے لئے مجھے معاف کرو۔ بڈھے آدمی زود رنج ہوتے ہیں۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ شوق سے رہو۔ ونے اب شاید پھر نہ آئے گا۔ ہاں وہ شیر کا مقابلہ کر سکتا ہے پر میرے غصہ کا مقابلہ نہیں۔ وہ جنگلوں کی خاک چھانے گا لیکن اب گھر نہ آئے گا۔ اگر تمہیں اُس سے محبت ہے تو اپنے کو اُس کی بہبود کی خاطر قربان کرنے کو تیار ہو جاؤ۔ اب اُس کی سلامتی کی صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ جانتی ہو وہ کیا ہے؟

صوفی نے سر ہلا کر کہا "نہیں"۔

رانی۔ جاننا چاہتی ہو؟

صوفی نے سر ہلا کر کہا "ہاں"۔

رانی۔ قربانی کے لئے تیار ہو؟

صوفی نے پھر سر ہلا کر کہا "ہاں"۔

رانی۔ تو تم کسی قابل شخص سے شادی کر لو۔ ونے کو دکھا دو کہ تم اُسے بھول گئیں۔ تمہیں اُس کی فکر نہیں ہے۔ یہی مایوسی اُس کو بچا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مایوسی اُس کو زندگی سے بیزار کر دے۔ وہ گیان کے حصول

کا سہارا لے جو مایوسی کی واحد جائے پناہ ہے۔ لیکن ایسا امکان ہونے پر بھی اس کے سوا دوسری تدبیر نہیں ہے۔ تم منظور کرتی ہو؟

صوفی رانی کے پیروں پر گر پڑی اور روتی ہوئی بولی "اُنکی بہتری کے لئے .... کر سکتی ہوں"۔

رانی نے صوفی کو اُٹھا کر گلے لگا لیا اور رقت آمیز لہجہ میں بولیں۔ "میں جانتی ہوں تم اُن کے لئے سب کچھ کر سکتی ہو۔ ایشور تمہیں اِس عہد کو پورا کرنے کی طاقت عطا کریں"۔

یہ کہہ کر رانی جاہنوی وہاں سے چلی گئیں۔ صوفی ایک کوچ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی اُس کا بال بال پشیمانی سے تکلیف پا رہا تھا۔ اسے رانی پر غصہ نہ تھا اُسے اُن پر بیحد اعتقاد تھا۔ کتنا بلند اور پاک مقصد ہے! در اصل میں ہی دودھ کی مکھی ہوں اور مجھی کو نکل جانا چاہئے۔ لیکن رانی کا آخری حکم اُس کے لئے تلخ ترین لقمہ تھا۔ وہ جوگن بن سکتی تھی لیکن محبت کو بدنام کرنے کے خیال ہی سے اُس کو نفرت ہوتی تھی۔ اُس کی حالت اُس فقیر کی سی تھی جو کسی باغ میں سیر کرنے جائے اور پھل توڑنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔ ونئے کے ایثار نے اسے اُن کا عقیدتمند بنا دیا۔ عقیدت نے جلد ہی محبت کی شکل اختیار کر لی اور اب وہی محبت اُس کو جبراً دوزخ کی تاریکی کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی! اگر وہ ہاتھ پیر چھڑاتی ہے تو خوف ہے ...... وہ اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ سوچنے کی طاقت زائل ہو گئی۔ سارے تفکرات۔ ساری پشیمانیاں۔ ساری مایوسی ساری تکلیف ایکدم سر میں سما کر غائب ہو گئیں!

شام ہو گئی تھی۔ صوفیا من مارے اُداس بیٹھی ہوئی باغ کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی جیسے کوئی بیوہ اپنے خاوند کے سوگ میں محو ہو یکایک پربھو سیوک کمرہ میں داخل ہوئے ؀

صوفیہ نے پربھو سیوک سے کوئی بات نہ کی چپ چاپ اپنی جگہ پر بُت بنی بیٹھی رہی۔ وہ اُس حالت میں پہنچ گئی تھی جب ہمدردی سے بھی رغبت نہیں باقی رہتی۔ ناامیدی کا آخری درجہ ترکِ تعلق ہے ؀

لیکن پربھو سیوک اپنی نئی تصنیف سنانے کے لئے اس قدر بیتاب تھے کہ صوفی کے چہرہ کی طرف اُن کا دھیان ہی نہ گیا۔ آتے ہی بولے۔ صُوفی! دیکھو۔ آج رات میں یہ نظم لکھی ہے۔ ذرا غور سے سُننا میں نے ابھی کنور صاحب کو سُنائی۔ وہ نہایت محظوظ ہوئے"؀

یہ کہہ کر پربھو سیوک نے شیریں بیانی کے ساتھ اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔ شاعر نے اس دارفانی کے ایک غمزدہ دل کے وہ جذبات منظوم کئے تھے جو ستاروں کو دیکھ کر اُس میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک شعر جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ اور اس کو دو دو تین تین بار دُہراتے تھے۔ لیکن صوفیہ نے ایک بار بھی داد نہ دی گویا اس میں سخن فہمی کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ نظم کو ختم کرکے پربھو سیوک نے پوچھا "اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے"؟

صوفیہ نے کہا "اچھی تو ہے"؀

پربھو سیوک۔ میرے اشعار پر تم نے دھیان نہیں دیا۔ آج تک کسی شاعر نے بھی ستاروں کو ملائک کی ارواح سے تشبیہ نہیں دی ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہوتے ہی شعراء کی جماعت میں ہل چل

پیدا ہو جائے گی ؟

صوفیہ۔ مجھے تو یاد آتا ہے کہ شیلی اور ورڈسورتھ اس استعارہ کو پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں۔ یہاں کے شاعروں نے بھی کچھ ایسے ہی استعارے باندھے ہیں۔ شاید ہیوگو کی ایک نظم کا عنوان بھی یہی ہے۔ ممکن ہے تمہارا تخیل اُن کے تخیل سے لڑ گیا ہو ؟

پربھوسیوک۔ میں نے اُستادوں کا کلام تم سے زیادہ دیکھا ہے لیکن یہ تشبیہ مجھ کو کہیں بھی نہیں دکھائی دی ؟

صوفیہ۔ خیر۔ ہو سکتا ہے۔ مجھی کو یاد نہ ہوگا۔ نظم بُری نہیں ہے ؟

پربھوسیوک۔ اگر کوئی دوسرا شاعر یہ اعجاز پیدا کرے تو اُس کی غلامی کرنے کو تیار رہوں ؟

صوفیہ۔ تو میں کہوں گی کہ تمہاری نگاہ میں اپنی آزادی کی قیمت بہت زیادہ نہیں ہے ؟

پربھوسیوک۔ تو میں بھی یہی کہوں گا کہ سخن فہمی میں کمال حاصل کرنے کے لئے ابھی تمہیں بہت زیادہ مشق کی ضرورت ہے ؟

صوفیہ۔ مجھے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اہم کام کرنے ہیں۔ آج کل گھر کی کیا کیفیت ہے؟

پربھوسیوک۔ وہی پرانی کیفیت۔ میں تو عاجز آگیا ہوں۔ پاپا کو اپنے کارخانہ کی دُھن لگی ہوئی ہے اور مجھے اُس کام سے نفرت ہے۔ پاپا اور ماما دونوں ہر وقت جھنجھلائے رہتے ہیں۔ کسی کا مُنہ سیدھا ہی نہیں ہوتا۔ کہیں ٹھکانا نہیں ملتا ورنہ اس حرص کے آشیانے میں ایک منٹ بھی نہ رہتا۔ کہاں جاؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ؟

صوفیہ۔ بڑے تعجب کی بات ہے اس قدر عالم اور ہنرمند ہو کر بھی تمہیں اپنی گزر بسر کی کوئی سبیل نہیں نظر نہیں آتی۔ شاید تخیل کی دنیا میں خودداری کے لئے کہیں بھی جگہ نہیں ؞

پربھو سیوک۔ صوفی! میں اور سب کچھ کر سکتا ہوں مگر خانگی تفکرات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ میں بے فکر۔ آزاد اور بے لوث رہنا چاہتا ہوں ایک خوشنما باغ میں کسی گھنے درخت کے نیچے چڑیوں کے نغمے سنتا ہوا محو شعر میں محو ہو کر پڑا رہوں۔ یہی میری زندگی کا معیار ہے ؞

صوفیہ۔ تمہاری زندگی اسی طرح خواب دیکھنے میں گزرے گی ؞

پربھو سیوک۔ کچھ ہو۔ فکر سے تو نجات حاصل ہے۔ آزاد تو ہوں ؞

صوفیہ۔ جہاں ضمیر اور اصولوں کا خون ہوتا ہے۔ وہاں سے آزادی کوسوں دور بھاگتی ہے۔ میں اس کو آزادی نہیں کہتی۔ یہ بیحیائی ہے والدین کی بے رحمی کم تکلیف دہ نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کا ظلم اتنا ناقابل برداشت نہیں ہوتا جتنا کہ والدین کا ؞

پربھو سیوک۔ اونہہ۔ دیکھا جائے گا۔ سر پر جو پڑے گی جھیل لوں گا۔ مرنے کے پہلے ہی کیوں روؤں؟

یہ کہہ کر پربھو سیوک نے پانڈے پور کا واقعہ بیان کیا۔ اور اتنی ڈینگیں ماریں کہ صوفی چڑھ کر بولی "ٖڈر رہنے بھی دو ایک گنوار کو پیٹ لیا تو کون سا بڑا کام کیا۔ اپنی نظموں میں تو عدم تشدد کا مجسمہ بن جاتے ہو اور وہاں ذرا سی بات پر اتنا جامہ سے باہر ہو گئے"؞

پربھو سیوک۔ گالی سہ لیتا؟

صوفیہ۔ جب تم مارنے والے کو بھی مار دوگے۔ گالی دینے والے کو بھی

روگے تو عدم تشدد والے اصول پر کاربند کب ہوگے؟ راہ چلتے تو کسی کو کوئی نہیں مانتا۔ واقعی کسی نوجوان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ نصیحت کرے۔ خواہ اُس کی شاعرانہ قوت کتنی ہی زبردست ہو۔ نصیحت کرنا مشاق اور پختہ کار لوگوں ہی کا کام ہے۔ یہ نہیں کہ جس کو ذرا بھی تک بندی آگئی وہ لگا امن۔ برداشت اور عدم تشدد کا سبق پڑھانے! جو بات دوسروں کو سکھلانا چاہتے ہو وہ پہلے تو سیکھ لو۔

پربھوسیوک۔ ٹھیک یہی بات تو نے نے بھی اپنے خط میں لکھی ہے تو یاد آگیا۔ یہ تمہارا خط ہے مجھے یاد ہی نہیں رہی تھی۔ یہ تذکرہ نہ چھڑ جاتا تو جیب میں رکھے ہی لوٹ جاتا۔

یہ کہتے ہوئے پربھوسیوک نے ایک لفافہ نکال کر صوفیہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صوفیہ نے پوچھا "آج کل کہاں ہیں؟"

پربھوسیوک۔ اودے پور کے کوہستانی علاقوں میں گھوم رہے ہیں میرے نام جو خط آیا ہے اُس میں تو انہوں نے صاف لکھا ہے کہ میں اس خدمتی کام کے بالکل ناقابل ہوں۔ مجھ میں اُتنی قوت برداشت نہیں جتنی ہونی چاہئے۔ شباب کا زمانہ تجربہ حاصل کرنے کا زمانہ ہے پختہ عمری ہی میں کار ہائے عامہ میں شامل ہونا چاہئے۔ کسی جوان آدمی کو خدمتی کام کرنے کے لئے بھیجنا ویسا ہی ہے جیسے کسی کمسن طبیب کو مریض کی تکلیف رفع کرنے کے لئے بھیجنا۔

پربھوسیوک چلے گئے تو صوفیہ سوچنے لگی۔ یہ خط پڑھوں یا نہ پڑھوں؟ وہ نے اس کو رانی صاحبہ سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں ورنہ یہیں کے پتہ پر نہ بھیجتے۔ میں نے ابھی رانی صاحبہ سے وعدہ کیا ہے کہ اُن

سے خط کتابت نہ کروں گی۔ اِس خط کو کھولنا روا نہیں۔ رانی صاحبہ کو دکھا دوں۔ اِس سے اُن کے دل میں میری طرف سے جو بدگمانی ہے وہ دور ہو جائے گی۔ مگر معلوم نہیں۔ کیا باتیں لکھی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات ہو جو رانی کے غصّہ کو اور بھی تیز کر دے۔ نہیں۔ اِس خط کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہیئے۔ رانی کو دکھانا درست نہیں۔

اُس نے پھر سوچا "پڑھنے سے کیا فائدہ؟ نہ جانے میرے دل کی کیا کیفیت ہو۔ مجھے اب اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا اب اس محبّت کے پودے کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنا ہی ہے تو اُسے کیوں سینچوں؟ اس خط کو رانی کے حوالہ کر دینا ہی مناسب ہے۔

صوفیہ نے اور زیادہ سوچ بچار نہ کیا۔ شک ہوا کہ کہیں میں اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکوں۔ چھلنی میں پانی نہیں ٹھہرتا۔

اُس نے اُسی وقت وہ خط لے جا کر رانی کو دے دیا۔ اُنھوں نے پوچھا کہ کس کا خط ہے؟ یہ تو ونے کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے نام آیا تھا؟ تم نے لفافہ کھولا نہیں؟

صوفیہ۔ جی نہیں۔

رانی نے خوش ہو کر کہا۔ "میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ اِسے پڑھو۔ تم نے اپنا قول نباہا ہے۔ اس سے میں خوش ہوں"۔

صوفیہ۔ مجھے معاف کیجئے۔

رانی۔ میں خوشی سے کہتی ہوں۔ پڑھو۔ دیکھو کیا لکھتے ہیں۔

صوفیہ۔ جی نہیں۔

رانی نے خط کو جوں کا توں صندوق میں بند کر دیا۔ خود بھی نہیں

پڑھا کیونکہ ایسا کرنا آئین آداب کے خلاف تھا۔ پھر صوفیہ سے بولی۔
"بیٹی! اب میری تم سے ایک التجا اور ہے۔ وسنے کو خط لکھو اور اُس میں صاف لکھ دو کہ ہماری اور تمہاری بھلائی اِسی میں ہے کہ آیندہ ہم دونوں میں صرف بھائی بہن کا تعلق رہے۔ تمہارے خط سے یہ ظاہر ہونا چاہئے کہ تم اُن کی محبت کے بہ نسبت اُن کے قومی جذبات کی زیادہ قدر کرتی ہو۔ تمہارا یہ خط میرے اور اُن کے والد کے ہزاروں نصائح سے زیادہ مؤثر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا خط پاتے ہی اُن کی طبیعت بدل جائے گی اور وہ فرض کے راستہ پر مستعدی سے گامزن ہوں گے۔ میں اس مہربانی کے کے لئے تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی۔ صوفیہ نے مغموم لہجہ میں کہا۔ "آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گی"۔

رانی۔ نہیں۔ صرف میرے ارشاد کی تعمیل کافی نہیں ہے۔ اگر یہ ظاہر ہوا کہ کسی کی ترغیب سے لکھا گیا ہے تو اُس کا اثر جاتا رہے گا۔

صوفیہ۔ آپ کو خط لکھ کر دکھلادوں؟

رانی۔ نہیں۔ تمہیں بھیج دینا۔

صوفیہ جب وہاں سے آکر خط لکھنے بیٹھی تو اُس کو سُوجھتا ہی نہ تھا کہ کیا لکھوں۔ سوچنے لگی۔ وہ مجھے بیدرد خیال کریں گے۔ اگر لکھ دوں کہ میں نے تمہارا خط پڑھا ہی نہیں تو اُنہیں کتنا رنج ہوگا۔ کیسے کہوں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی؟

وہ میز پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور طے کرلیا کہ کل لکھوں گی۔ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ کھانے کا وقت آگیا۔ نو بج گئے۔ ابھی وہ مُنہ ہاتھ دھوکر بیٹھی تھی۔ کہ اُس نے رانی کو دروازہ سے اندر کی طرف جھانکتے دیکھا

سمجھی کہ کسی کام سے جا رہی ہوں گی۔ پھر کتاب دیکھنے لگی۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ رانی پھر دوسری طرف سے لوٹیں اور انہوں نے کمرہ میں پھر جھانکا۔

صوفیہ کو اُن کا اس طرح منڈلانا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ اُس نے سمجھا "یہ مجھے بالکل کاٹھ کی پتلی بنانا چاہتی ہیں کہ بس اُن کے اشاروں پر ناچا کروں۔ اتنا تو نہ ہوسکا کہ جب میں نے بند لفافہ اُن کے ہاتھ میں رکھ دیا تو مجھے خط پڑھ کر سُنا دیتیں۔ آخر میں لکھوں کیا؟ نہیں معلوم کہ اُنہوں نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے؟ دفعتاً اُس کو خیال ہوا کہ میرا خط نصیحت کی شکل نہ اختیار کرے۔ وہ اسے پڑھ کر شاید مجھ سے چڑھ جائیں اپنے محبت کرنے والوں سے ہم سبق و نصیحت کی باتیں نہیں بلکہ محبت اور دل دہی کی باتیں سُننا چاہتے ہیں۔ بڑی خیریت ہوئی۔ ورنہ وہ میری نصیحت آمیز تحریر کو پڑھ کر نہ جانے اپنے دل میں کیا سمجھتے۔ اُنہیں خیال ہوتا کہ گرجا میں وعظ سنتے سنتے اس کے جذبات محبت افسردہ و بےحس ہوگئے ہیں۔ اگر وہ مجھے ایسا خط لکھتے تو مجھے کتنا بُرا معلوم ہوتا آہ میں نے بڑا دھوکا کھایا۔ پہلے میں نے سمجھا تھا کہ اُن سے صرف روحانی محبت کروں گی۔ اب معلوم ہو رہا ہے کہ روحانی محبت یا عقیدہ صرف مذہبی دنیا کے لئے مخصوص ہے۔ عورت اور مرد میں پاک محبت ہونی غیر ممکن ہے۔ محبت پہلے اُنگلی پکڑ کر فوراً پہنچا پکڑتی ہے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ محبت مجھے علم حقیقی کے بلند ترین معیار سے نیچے گرا رہی ہے۔ ہم کو زندگی اس لئے عطا کی گئی ہے کہ پاکیزہ خیالی اور نیک اعمالی سے اُس کو اونچے مدارج پر پہنچائیں یہاں تک کہ ایک روز نور ازلی میں محو ہو کر

نیست ہو جائیں، یہ بھی جانتی ہوں کہ زندگی فانی ہے۔ چند روزہ ہے۔ اور دُنیا کی ساری مسرتیں بھی فانی اور چند روزہ ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی پروانہ کی طرح شمع پر گر رہی ہوں۔ اسی لئے تو کہ محبت میں وہ بیخودی ہے کہ جو عقل احتیاط اور ارادہ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اہل تصوف بھی جو روحانی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ خواہشات نفسانی سے مبرّا نہیں رہ سکتے۔ جیسے کوئی جبراً کھینچے لئے جا رہا ہو۔ اس کو جانے سے منع کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے۔

دُکھی لوگوں کے لئے رات ایک کٹھن تپسیا سے کم نہیں ہے جوں جوں رات گزرتی تھی صوفی کی بےچینی بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی رات تک اپنے اندرونی جذبات سے لگاتار مقابلہ کرنے کے بعد اُس نے بالآخر مجبور ہو کر اپنے دل کے دروازے عشق و محبت کی خوش فعلیوں کے لئے کھول دیئے۔ جیسے کسی تماشا کا منیجر تماشائیوں کی کثرت سے تنگ آ کر تماشا گاہ کو عوام کے لئے کھول دیتا ہے۔ باہر کا شور اندر کے نغمہ سرا ہونیں مخل ہوتا ہے صوفی نے اپنے کو عشقیہ خیالات کی گود میں ڈال دیا اور بلا کسی ہچک یا رکاوٹ کے اُن خیالات سے یوں لطف اندوز ہونے لگی مدکیوں و نے تم میرے لئے کیا کیا مصیبتیں جھیلو گے! بےعزتی۔ ذلت۔ نفرت والدین کی مخالفت۔ تم میرے لئے یہ سب باتیں سہ لوگے؟ لیکن مذہب؟ وہ دیکھو تمہارا چہرہ اُداس ہو گیا؟ تم سب کچھ کروگے پر مذہب نہیں ترک کر سکتے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میں تمہارے ساتھ فاقہ کر سکتی ہوں ذلت حقارت۔ رسوائی سب برداشت کر سکتی ہوں۔ پر مذہب کو کس طرح ترک کروں؟ یسوع کا دامن کیسے چھوڑ دوں؟ عیسائیت کی مجھے پرواہ

نہیں ۔ یہ صرف خود غرضیوں کا ایک مجموعہ ہے ۔ لیکن اُس مقدس روح سے کیونکر منحرف ہو سکتی ہوں جو سراپا عفو و رحم تھی ؟ کیا یہ ممکن نہیں ۔ کہ میں یسوع کے دامن سے وابستہ رہ کر بھی اپنی محبت کی خواہشات کو آسودہ کر سکوں ؟ ہندو مذہب کے وسیع دامن میں کس کے لئے گنجائش نہیں ؟ خدا کا ماننے والا بھی ہندو ہے ۔ نہ ماننے والا بھی ہندو ہے ۔ ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو ہے ۔ جہاں مہابیر کے بھگتوں کے لئے جگہ ہے ۔ مہاتما بدھ کے بھگتوں کے لئے جگہ ہے وہاں کیا عیسیٰ کے بھگتوں کے لئے جگہ نہیں ہے ؟ تم نے مجھے محبت کا نوید دیا ہے ۔ میں اُس کو نامنظور کیوں کروں ؟ میں بھی تمہارے ساتھ خدمتی کاموں میں مشغول ہو جاؤں گی ۔ تمہارے ساتھ جنگلوں میں پھروں گی جھونپڑوں میں رہوں گی ! آہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ۔ میں نے وہ خط رانی صاحبہ کو ناحق دے دیا ۔ میرا خط تھا ۔ مجھے اُس کے پڑھنے کا پورا حق تھا ۔ میرے اور اُن کے درمیان میں محبت کا رشتہ ہے ۔ جو دُنیا کے اور سبھی رشتوں سے پاکیزہ اور افضل ترین ہے ۔ میں اس بارہ میں اپنے حق سے دست بردار ہو کر ونے کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہوں ۔ نہیں میں اُن سے دغا کر رہی ہوں ۔ میں محبت کو بدنام کر رہی ہوں اور اُن کے دلی جذبات کا مضحکہ اُڑا رہی ہوں ۔ وہ میرا خط پڑھے بغیر ہی پھاڑ کر پھینک دیتے تو مجھے اتنا رنج ہوتا کہ اُنہیں کبھی معاف نہ کرتی ۔ کیا کروں ؟ جاکر رانی صاحبہ سے وہ خط مانگ لوں ؟ اُسے دینے میں اُن کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ دل میں خواہ کتنا ہی بُرا مانیں پر میری امانت مجھے ضرور لوٹا دیں گی ۔ وہ میری ماما کی طرح تنگ دل

نہیں ہیں۔ مگر اُن سے مانگوں کیوں؟ وہ تو میری چیز ہے۔ کسی اور شخص کا اُس پر ذرا بھی اختیار نہیں۔ اپنی چیز لے لینے کے لئے میں کسی دوسرے کی احسان مند کیوں بنوں؟

گیارہ بج رہے تھے۔ گھر میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ صوفیہ نے کھڑکی سے باہر باغ کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے دودھ کی بارش ہو رہی ہے۔ چاندنی خوب چھٹک رہی تھی۔ سنگ مرمر کی دونوں پریاں جو حوض کے کنارے کھڑی تھیں اُس خاموش نغمہ کی نورانی مورتیں سی معلوم ہوتی تھیں جس سے سارا منظر معمور تھا۔

صوفیہ کے دل میں زبردست خواہش ہوئی کہ اسی وقت چل کر اپنا خط اُٹھا لاؤں۔ وہ پختہ ارادہ کرکے اپنے کمرہ سے نکلی۔ اور بے خوفی کے ساتھ رانی صاحبہ کے دیوان خانہ کی طرف چلی۔ وہ اپنے دل کو بار بار سمجھا رہی تھی۔ مجھے خوف کس کا ہے۔ اپنی چیز لینے جا رہی ہوں۔ کوئی پوچھے تو اُس سے صاف صاف کہہ سکتی ہوں۔ ونے سنگھ کا نام لینا کوئی جرم نہیں ہے۔

مگر لگاتار تشفی ملنے پر بھی اُس کے قدم اتنی احتیاط سے پڑتے تھے کہ برآمدہ کے پختہ فرش پر بھی کوئی آہٹ نہ ہوتی تھی۔ اُس کے چہرہ سے وہ بے اطمینانی ظاہر ہو رہی تھی جو نیتِ فاسد کا نشان ہے۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے دہنے بائیں آگے پیچھے تاکتی جاتی تھی۔ ذرا سا بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو اُس کے پیر خود بخود رک جاتے تھے۔ اور برآمدہ کے ستونوں کی آڑ میں چھپ جاتی تھی۔ راستہ میں کئی کمرے تھے۔ اگرچہ اُن

میں تاریکی تھی اور روشنی گل ہوچکی تھی تاہم وہ دروازہ پر ایک لمحہ کے لئے رُک جاتی تھی کہ کوئی اُن میں بیٹھا ہو۔ دفعتاً ایک ٹیرئیر کُتا جسے رانی صاحبہ بہت پیار کرتی تھیں سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ صوفی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اُس نے ذرا بھی مُنہ کھولا کہ سارے مکان میں ہل چل ہو جائے گی۔ کُتّے نے اُس کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا اور اپنے فیصلہ کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ صوفیہ نے آہستہ سے اُس کا نام لیا اور اُسے گود میں اُٹھا کر اُس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ کُتا دُم ہلانے لگا لیکن اپنی راہ جانے کے بجائے وہ صوفیہ کے ساتھ ہولیا۔ شاید اُس کی فطرت بتلا رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس طرح پانچ کمروں کے بعد رانی صاحبہ کا دیوان خانہ ملا۔ اُس کے دروازے کھُلے تھے۔ لیکن اندر اندھیرا تھا۔ کمرہ میں بجلی کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اُنگلیوں کی بہت ہی خفیف حرکت سے کمرہ روشن ہوسکتا تھا۔ مگر اُس وقت بٹن کا دبانا اُسے بارود کے ڈھیر میں دیا سلائی لگانے سے کم خطرناک نہ معلوم ہوتا تھا۔ روشنی سے وہ کبھی اس قدر خوف زدہ نہ ہوئی تھی۔ مشکل تو یہ تھی کہ روشنی کے بغیر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب بھی نہ ہوسکتی تھی۔ وہی آب حیات بھی تھی اور زہر ہلاہل بھی۔ اُسے غصہ آرہا تھا کہ کواڑوں میں شیشے کیوں لگے ہوئے ہیں۔ پردے ہیں تو بھی اس قدر باریک کہ آدمی کا مُنہ دکھائی دیتا ہے۔ گھر نہ ہوا کوئی سجی ہوئی دوکان ہوئی۔ بالکل انگریزی نقل ہے۔ اور روشنی ٹھنڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے تو کوئی بہت بڑی کفایت نہیں ہوجاتی

ہم جب کسی تنگ سڑک پر چلتے ہیں تو ہمیں سواریوں کا آنا جانا بہت ہی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان راستوں پر

سواریوں کی آمدورفت کی روک ہونی چاہیئے۔ ہمارا اختیار ہوتا تو ان سڑکوں پر کوئی سواری نہ گزرنے دیتے۔ خصوصاً موٹروں کو۔ لیکن انھیں سڑکوں پر جب ہم کسی سواری پر بیٹھ کر چلتے ہیں تو قدم قدم پر مسافروں کو ہٹانے کے لئے رُک جانے پر جھنجھلاتے ہیں کہ یہ سب پٹری پر کیوں نہیں چلتے۔ خواہ مخواہ بیچ میں دھنسے پڑتے ہیں مشکلات میں پڑ کر گرد و پیش کے حالات پر ناخوشی کا اظہار کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے

صوفیہ کئی منٹ تک بجلی کے بٹن کے پاس کھڑی رہی۔ بٹن دبانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سارے صحن میں روشنی پھیل جائے گی۔ لوگ چونک پڑیں گے۔ اندھیرے میں سوتا ہوا آدمی بھی اُجالا پھیلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ مجبوراً اُس نے میز کو ٹٹولنا شروع کیا۔ دوات لڑھک گئی سیاہی میز پر پھیل گئی اور اُس کے کپڑوں پر داغ پڑ گئے۔ اُسے یقین تھا کہ رانی نے خط کو اپنے ہینڈ بیگ (دستی بیگ) میں رکھا ہوگا۔ ضروری خطوط اسی میں رکھتی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُس کو بیگ ملا۔ وہ اُس میں سے ایک ایک خط نکال کر اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ لفافے زیادہ تر ایک ہی قسم کے تھے۔ نگاہیں کچھ کام نہ کرسکیں۔ آخر اس طرح مطلب برآری ہوتے نہ دیکھ کر اُس نے بیگ کو اُٹھالیا اور کمرہ سے باہر نکلی۔ سوچا کہ میرے کمرہ میں ابھی تک روشنی ہے وہاں وہ خط بآسانی مل جائے گا۔ اِسے لاکر پھر یہیں رکھ دوں گی۔ لیکن واپس ہوتے وقت وہ اتنی ہوشیاری سے قدم نہ اُٹھا سکی۔ آتے وقت وہ قدم قدم پر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آئی تھی۔ اب بڑی تیزی سے چلی جارہی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ خالی ہاتھ ہونے پر عذر کی گنجایش

تھی۔ بھرے ہوئے ہاتھوں کے لئے کوئی عذر یا حیلہ نہ تھا۔

اپنے کمرہ میں پہنچتے ہی صوفیہ نے دروازہ بند کر دیا اور پردے ڈال دیئے۔ گرمی کی شدت سے سارا بدن پسینہ سے تر تھا۔ ہاتھ اس طرح کانپ رہے تھے جیسے رعشہ کا اثر ہو۔ وہ خطوط کو نکال نکال کر دیکھنے لگی۔ اور خطوط کو محض دیکھنا نہ تھا۔ انہیں اُن کی جگہوں پر ترتیب کے ساتھ رکھنا بھی تھا۔ خطوط کا ایک دفتر سامنے تھا۔ برسوں کے خطوط بہ حفاظت رکھے ہوئے تھے۔ صوفیہ کو تلاش کرتے گھنٹوں گذر گئے۔ دفتر ختم ہونے پر آ گیا۔ پر وہ چیز نہ ملی۔ اُسے اب کچھ کچھ مایوسی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آخری خط بھی اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا۔ اس وقت صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی۔ صوفیہ کی حالت اُس آدمی کی سی تھی جو کسی میلہ میں اپنے گم شدہ عزیز کو ڈھونڈتا ہو۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ اس کا نام لے کر زور زور سے پکارتا ہے۔ اُس کو وہم ہوتا ہے کہ وہ کھڑا ہے۔ لپک کر اس کے پاس جاتا ہے اور شرمندہ ہو کر واپس آتا ہے۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔

صوفیہ بھی رونے لگی۔ وہ خط کہاں گیا؟ رانی نے تو اُس کو میرے سامنے ہی اِسی بیگ میں رکھ دیا تھا۔ اُن کے اور سبھی خطوط یہاں موجود ہیں۔ کیا اُسے کہیں اور رکھ دیا؟ مگر اُمید اُس گھاس کی مانند ہے جو گرمی کی حدت سے جل جاتی ہے۔ زمین پر اُس کا نشان تک نہیں رہتا۔ زمین ایسی صاف سفید ہو جاتی ہے جیسے ٹکسال کا نیا روپیہ لیکن بارش کی بوند پڑتے ہی پھر جلی ہوئی جڑیں پنپنے لگتی ہیں اور

خشک جگہ پر ہریاول لہرانے لگی ہے۔

صوفیہ کی امید پھر ہری ہوئی۔ کہیں میں کوئی خط چھوڑ تو نہیں گئی؟ اُس نے خطوط کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا اور زیادہ غور کے ساتھ ایک ایک لفافہ کو کھول کر دیکھنے لگی کہ کہیں رانی نے اُسے کسی دوسرے لفافہ میں رکھ دیا ہو۔ جب دیکھا کہ اس طرح تو ساری رات گزر جائے گی تو اُنہیں لفافوں کو کھولنے لگی جو وزنی معلوم ہوئے۔ آخر یہ شک بھی رفع ہو گیا۔ اُس لفافہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب اُمید کی جڑیں بھی سوکھ گئیں۔ بارش کا قطرہ نہ ملا۔

صوفیہ چارپائی پر لیٹ گئی گویا تھک گئی ہو۔ کامیابی جانفزا ہوتی ہے اور ناکامی جان گسل۔ اُمید ایک نشہ ہے اور مایوسی اُس نشہ کا خمار۔ نشہ میں ہم گھر سے باہر دوڑتے ہیں اور خمار کے وقت ہم گھر میں آرام کرتے ہیں۔ امید مادہ کی طرف لے جاتی ہے۔ اور مایوسی روح کی طرف۔ اُمید آنکھیں بند کر دیتی ہے۔ مایوسی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ امید سُلانے والی تھپکی ہے۔ مایوسی جگانے والا چابک۔

صوفیہ کو اُس وقت اپنی اخلاقی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے ناحق اپنی روح کو گناہ گار بنایا۔ کیا میں رانی سے اپنا خط نہ مانگ سکتی تھی؟ اُنہیں اُس کے دینے میں ذرا بھی توقف نہ ہوتا۔ پھر میں نے وہ خط اُنہیں دیا ہی کیوں؟ رانی صاحبہ کو کہیں میری یہ باتیں معلوم ہو گئیں اور ضرور ہی معلوم ہو جائیں گی تو وہ میری بابت اپنے دل میں کیا خیال کریں گی؟ غالباً مجھ سے زیادہ ذلیل اور کمینہ شخص دوسرا نہ ہوگا۔

دفعتاً صوفیہ کے کانوں میں جھاڑو لگنے کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑی۔ کیا سویرا ہو گیا؟ پر دہ اُٹھا کر دروازہ کھولا تو دن نکل آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے درد آمیز نگاہوں سے دستی بیگ کی طرف دیکھا اور بُت کی طرح کھڑی رہ گئی۔ عقل نے جواب دے دیا۔ اپنی حالت اور کام پر ایسا غصّہ آرہا تھا کہ گردن پر چھُری پھیر لوں۔ کون سا مُنہ دکھاؤں گی؟ رانی صاحبہ علی الصباح اُٹھتی ہیں۔ مجھے ضرور ہی دیکھ لیں گی۔ لیکن اب اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ یا خدا! تو بیکسوں کا مددگار ہے۔ اب میری لاج تیرے ہی ہاتھ ہے۔ خدا کرے ابھی رانی صاحبہ نہ اُٹھی ہوں۔ اُس کی اس دعا میں کتنی عاجزی۔ کتنی مجبوری۔ کتنا درد۔ کتنی عقیدت اور کتنی غیرت تھی۔ شاید اُس نے ایسی صاف دلی سے کبھی دعا نہ کی تھی!

اب ذرا بھی دیر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اُس نے بیگ اُٹھا لیا۔ اور باہر نکلی۔ غرور کبھی اس قدر پامال نہ ہوگا۔ اُس کے منہ میں سیاہی لگی ہوتی جب بھی شاید وہ اس طرح آنکھیں چُراتی ہوئی نہ جاتی۔ کوئی شریف آدمی قیدی کی شکل میں بیڑیاں پہنے جاتا ہوا بھی اتنا خجل نہ ہوگا۔ جب وہ دیوان خانہ کے دروازہ پر پہنچی تو اس کا دل یوں دھڑکنے لگا گویا کوئی ہتھوڑا چلا رہا ہو۔ وہ ذرا دیر ٹھٹکی۔ کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ رانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صوفیہ کی اس وقت جو حالت ہوئی اُس کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ گڑ گئی۔ کٹ گئی۔ سر پر بجلی گر پڑتی یا نیچے کی زمین پھٹ جاتی تو وہ بھی شاید اس بڑی مصیبت کے مقابلہ میں پھولوں کی بارش یا پانی کی چھینٹوں کی طرح خوشگوار معلوم

ہوتی۔ اُس نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے ہینڈ بیگ کو چپکے سے لے جا کر میز پر رکھ دیا۔ رانی نے اُس کی طرف دِل کو چھید ڈالنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اُس میں غصّہ نہ تھا۔ رحم نہ تھا۔ حقارت تھی۔ خالص۔ زندہ اور بولتی ہوئی ۔

صوفیہ لوٹنا چاہتی تھی کہ رانی نے پوچھا "کیا ونے کے خط کی جستجو تھی"؟ صوفیہ ساکت و خاموش رہ گئی۔ معلوم ہوا کسی نے جگر پر خنجر چلا دیا ۔

رانی نے پھر کہا "اُسے میں نے علیٰحدہ رکھ دیا ہے۔ کہو تو منگوا دوں"

صوفیہ نے جواب نہ دیا۔ اُس کا سر چکر لینے لگا۔ اُس کو کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہوا ۔

رانی نے تیسرا تیر چلایا "کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے"؟

صوفیہ غش کھا کر فرش پر گر پڑی ۔

(۱۴)

صوفیہ کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے کانوں میں رانی کے آخری الفاظ گونج رہے تھے "کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے"؟ وہ اپنے کو اِس وقت اتنی حقیر سمجھ رہی تھی کہ گھر کا مہتر بھی اُسے گالیاں دیتا تو شاید سر نہ اُٹھاتی۔ وہ نفس کے ہاتھوں اس قدر پامال ہو چکی تھی کہ اُسے اپنے سنبھلنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ میرا دل مجھ سے وہ سب کچھ کرا سکتا ہے جس کے محض خیال سے انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ میں دوسروں پر کتنا ہنستی تھی۔ اپنی مذہبی رغبت پر کتنا فخر کرتی تھی۔ میں

تناسخ اور نجات۔ خدا اور مادہ جیسے پیچیدہ مسایل پر غور و خوض کرتی تھی اور
دوسروں کو خواہش اور خود غرضی کا غلام سمجھ کر ذلیل خیال کرتی تھی۔ میں
سمجھتی تھی کہ خدا سے قریب تر ہو گئی ہوں۔ دنیا کو ہیچ سمجھتے ہوئے
میں اپنے کو نجات کا مستحق خیال کرتی تھی۔ لیکن آج میری عقیدت کا
پردہ فاش ہو گیا۔ آہ دنیے کو یہ باتیں معلوم ہوں گی تو وہ اپنے دل میں
کیا سمجھیں گے؟ غالباً میں اُن کی نگاہوں میں اتنی گر جاؤں گی کہ وہ مجھ
سے بولنا بھی پسند نہ کریں۔ میں بدنصیب ہوں۔ میں اُن کو رسوا کیا۔
اپنے خاندان کو بدنام کیا۔ اپنے ضمیر کا خون کیا اور اپنے میزبانوں کی
فیاضی کی توہین کی۔ میرے سبب مذہب بھی بدنام ہو گیا ورنہ کیا آج
مجھ سے یہ پوچھا جاتا۔ کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟

اُس نے سرہانے کی طرف دیکھا۔ الماریوں پر مذہبی کتابیں قرینہ
سے چُنی ہوئی تھیں۔ کتابوں کے دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ یہی میرے
مطالعہ کا نتیجہ ہے! میں سچ کی کھوج کرنے چلی تھی اور اِس بُری طرح گری
کہ اب اُٹھنا مشکل ہے۔

سامنے دیوار پر مہاتما بُدھ کی تصویر آویزاں تھی۔ اُن کے چہرہ
پر کتنا نور تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں جُھک گئیں۔ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے
اُسے ندامت ہوتی تھی۔ بُدھ کے زندہ جاوید ہونے کا اُسے پہلے کبھی اتنا
یقین نہ ہوا تھا۔ تاریکی میں لکڑی کا کُندا بھی جاندار ہو جاتا ہے۔ صوفی
کے دل پر ایسی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

ابھی نو بجے کا وقت تھا مگر صوفیہ کو گمان ہو رہا تھا کہ شام ہو رہی
ہے۔ وہ سوچتی تھی۔ کیا سارے دن سوتی رہ گئی؟ کسی نے مجھے جگایا

بھی نہیں؟ کوئی کیوں جگانے لگا؟ یہاں اب میری پرواہ کس کو ہے؟ اور کیوں ہو؟ میں بدذات ہوں۔ میری ذات سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے گا۔ جہاں رہوں گی وہیں آگ لگاؤں گی۔ میں نے بُری ساعت میں اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ میرے ہاتھوں یہ گھر ویران ہو جائے گا۔ میں دنے کو اپنے ساتھ ڈبو دوں گی۔ ماں کی بددعا کا اثر ضرور ہو گا۔ خدایا آج میرے دل میں ایسے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟

یکایک مسز سیہوک کمرہ میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی صوفیہ کو اپنے سینہ میں جذبات کا ایک سیلاب سا آتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ دوڑ کر ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ وہی اب اُس کا آخری سہارا تھا۔ یہیں اب اُس کو وہ ہمدردی مل سکتی تھی جس کے بغیر اُس کا زندہ رہنا دشوار تھا۔ یہیں اب اُس کو وہ آرام وہ سکون۔ وہ سایہ مل سکتی تھی جس کے لئے اُس کی روح تڑپ رہی تھی۔ ماں کی گودی کے سوا یہ روحانی خوشی اور کہاں مل سکتی ہے؟ ماں کے سوا کون اُسے چھاتی سے لگا سکتا ہے کون اُس کے دل پر مرہم رکھ سکتا ہے؟ ماں کی سخت کلامی اور اُس کا دل آزارانہ سلوک۔ یہ سب اُسی خوشی کی خواہش کے جوش میں غائب ہو گئے۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ خدا نے میری بیکسی پر ترس کھا کر ماما کو یہاں بھیجا ہے۔ ماں کی گودی میں اپنے دُکھتے ہوئے سر کو رکھنے پر اُس کو ایک بار پھر اُس سکون اور تقویت کا احساس ہوا جس کی یاد اُس کے دل سے اب تک محو نہ ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن ماں کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ تو مسٹر کلارک کے نوید کا مژدہ جاں فزا سُنانے کے لئے بیقرار ہو رہی تھی۔ جوں ہی صوفیہ کے

آنسو تھے۔ مسز سیوک نے کہا "آج تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ مسٹر کلارک نے تمہیں اپنے یہاں بُلا بھیجا ہے"۔

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا اُس کو ماں کی یہ بات بے موقع معلوم ہوئی۔

مسز سیوک نے پھر کہا "جب سے تم یہاں آئی ہو وہ کئی مرتبہ تمہاری خیر عافیت کا حال دریافت کر چکے ہیں۔ جب ملتے ہیں تمہارا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ ایسا شریف سویلین میں نے نہیں دیکھا! اُن کی شادی کسی انگریز گھرانے میں ہو سکتی ہے اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ تمہیں ابھی تک یاد کرتے ہیں"۔

صوفیہ نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔ ماں کی ثروت پسندی ناقابل برداشت تھی۔ نہ محبت کی باتیں ہیں نہ تشفی کے الفاظ۔ شاید حضرت یسوع نے بھی بلایا ہوتا تو یہ اتنا خوش نہ ہوتیں۔

مسز سیوک بولیں "اب تمہیں انکار نہ کرنا چاہیئے۔ توقف سے محبت سرد ہو جاتی ہے اور پھر اُس پر کوئی چوٹ نہیں پڑ سکتی۔ ایسا سنہرا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ایک دانا کا قول ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں صرف ایک بار اپنی قسمت آزمائی کا موقع ملتا ہے اور وہی اُس کے مستقبل کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ تمہاری زندگی میں یہ وہی موقع ہے۔ اِسے کھو دیا تو ہمیشہ پچھتاؤ گی"۔

صوفیہ نے مغموم ہو کر کہا "اگر مسٹر کلارک نے مجھے مدعو نہ کیا ہوتا تو شاید آپ مجھ کو یاد بھی نہ کرتیں"۔

مسز سیوک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میرے دل میں جو

کچھ ہے وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ پر ایسا کوئی دن نہیں جاتا کہ میں تمہارے اور پربھو کے لئے خدا سے دُعا نہ کرتی ہوں۔ یہ انہیں دعاؤں کا اثر ہے کہ تمہیں یہ موقع نصیب ہوا ہے"۔

یہ کہہ کر مسز سیوک رانی جانھوی سے ملنے گئیں۔ رانی صاحبہ نے اُن کی کوئی خاص عزت نہیں کی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولیں "آپ سے بہت دنوں میں ملاقات ہوئی"۔

مسز سیوک نے سوکھی ہنسی ہنس کر کہا "ابھی میری واپسی کی ملاقات آپ کے ذمّہ باقی ہے"۔

رانی۔ آپ مجھ سے ملنے کے لئے آئیں کب؟ پہلے بھی صوفیہ سے ملنے آئی تھیں اور آج بھی۔ میں تو آج آپ کو ایک خط لکھنے والی تھی۔ اگر بُرا نہ مانئے تو ایک بات پوچھوں۔

مسز سیوک۔ پوچھئے۔ بُرا کیوں مانوں گی۔

رانی۔ مس صوفیہ کی عمر تو زیادہ ہو گئی۔ آپ نے اُس کے بیاہ کی فکر کی یا نہیں؟ اب تو اُس کا جتنی جلدی بیاہ ہو جائے اُتنا ہی اچھا۔ آپ لوگوں میں لڑکیاں بہت سیانی ہونے پر بیاہی جاتی ہیں۔

مسز سیوک۔ اس کی شادی کب کی ہو گئی ہوتی۔ کئی انگریز بے طرح پیچھے پڑے۔ مگر یہ راضی ہی نہیں ہوتی۔ اُس کو مذہبی کتب سے اس قدر دلچسپی ہے کہ شادی کو ایک جنجال سمجھتی ہے۔ آج کل حاکم ضلع مسٹر کلارک کے پیغامات آ رہے ہیں۔ دیکھوں اب بھی راضی ہوتی ہے یا نہیں۔ آج میں اُس کو لے جانے ہی کے ارادہ سے آئی ہوں۔ میں ہندوستانی عیسائیوں سے رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی۔ اُن کا طرزِ معاشرت

مجھے پسند نہیں ہے۔ اور صوفی جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے کوئی انگریز شوہر ملنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہو سکتی ۔

رانی ۔ میری رائے میں شادی ہمیشہ اپنے ہم قوم لوگوں میں کرنی چاہئیے یورو پین لوگ ہندوستانی عیسائیوں کی کچھ بہت وقعت نہیں کرتے اور بے جوڑ شادیوں کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا ۔

مسز سیوک (غرور سے) ایسا کوئی یورپین نہیں ہے جو میرے خاندان میں شادی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھے ۔ ہم اور وہ ایک ہیں ۔ ہم اور وہ ایک ہی خدا کو مانتے ہیں ۔ ایک ہی گرجا میں عبادت کرتے ہیں ۔ اور ایک ہی نبی کی اُمت میں ہیں ۔ ہمارا اور اُن کا طرز معاشرت رسم ورواج خورد و نوش سب ایک ہیں ۔ یہاں انگریزوں کی سوسائٹی میں کلب میں ۔ دعوتوں میں ۔ ہماری ایک سی عزت ہوتی ہے ۔ ابھی تین چار روز ہوئے ۔ لڑکیوں کو انعام تقسیم کرنے کا جلسہ تھا مسٹر کلارک نے خود مجھے اُس جلسہ کا صدر بنایا اور میں نے ہی انعامات تقسیم کئے ۔ کسی ہندو یا مسلمان لیڈی کو یہ اعزاز نہیں حاصل ہو سکتا ۔

رانی ۔ ہندو یا مسلمان جنہیں کچھ بھی اپنی ذاتی عزت کا خیال ہے ۔ انگریزوں کے ساتھ ملنا جلنا اپنے لئے عزت کا باعث نہیں خیال کرتے ۔ یہاں تک کہ ہندوؤں میں جو لوگ انگریزوں کے ساتھ خورد و نوش ۔ کرتے ہیں انہیں لوگ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ۔ شادی بیاہ کا تو ذکر ہی کیا ۔ سیاسی اقتدار کی بات اور ہے ۔ ڈاکوؤں کی ایک جماعت عالموں کی ایک مجلس کو نہایت آسانی سے مغلوب کر سکتی ہے ۔ مگر اُس سے علماء کی عزت کچھ کم نہیں ہوتی ۔ ہر ہندو جانتا ہے کہ حضرت مسیح بد مذہب

کے زمانہ میں یہاں آئے تھے اور اُنہوں نے یہیں تعلیم پائی تھی اور جو علم اُنہوں نے یہاں حاصل کیا ہے اُسی کی اشاعت مغرب میں کی پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ہندو انگریزوں کو اپنے سے بہتر خیال کریں ؟

دونوں عورتوں میں اسی طرح نوک جھونک ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی کچھ نیت کو سمجھتی تھیں۔ احسان مندی یا شکر گزاری کے الفاظ کسی کے منہ سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ جب مسز سیوک رخصت ہونے لگیں نورانی اُن کو پہنچانے کے لئے کمرہ کے دروازہ تک بھی نہ گئیں۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا دیا اور ابھی مسز سیوک کمرہ ہی میں تھیں کہ وہ اپنا اخبار پڑھنے لگیں ؟

مسز سیوک صوفیہ کے پاس گئیں تو وہ تیار تھی۔ کتابوں کے بنڈل بندھے ہوئے تھے۔ کئی خادمائیں اِدھر اُدھر انعام کے لالچ میں کھڑی تھیں۔ دل میں خوش تھیں کہ کسی طرح یہ بلا ٹلی۔ صوفیہ بہت اُداس تھی۔ اس گھر کو چھوڑتے ہوئے اُس کو بہت رنج ہو رہا تھا۔ اُسے اپنی منزلِ مقصود کا پتہ نہ تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ تقدیر کہاں لے جائے گی۔ کیا کیا اذیتیں اُٹھانی پڑیں گی۔ کشتیِ حیات کس گھاٹ لگے گی ؟ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ونے سنگھ سے پھر ملاقات نہ ہو گی۔ اُن سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو رہی ہوں۔ رانی صاحبہ کی اہانت آمیز گفتگو اُن کا شکوہ اور اپنی غلطی سب کچھ بھول گئی۔ دل کے ایک ایک تار سے یہی آواز نکل رہی تھی کہ اب ونے سے پھر ملاقات نہ ہو گی۔ مسز سیوک بولیں "کنور صاحب سے بھی مل لوں ؟"

صوفیہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ماما کو رات کے واقعہ کی خبر نہ مل جائے۔ کنور صاحب کہیں مذاق ہی مذاق میں کہہ نہ ڈالیں۔ بولی "اُن سے ملنے میں دیر ہوگی۔ پھر مل لیجئے گا۔"

مسز سیلوک۔ پھر کسے اتنی فرصت ہے؟

دونوں کنور صاحب کے دیوان خانہ میں پہنچیں۔ وہاں اس وقت والنٹیروں کا ہجوم تھا۔ گڑھوال میں سخت قحط پڑا ہوا تھا۔ نہ اناج تھا نہ پانی۔ جانور مر رہے تھے۔ پر انسانوں کو موت بھی نہ آتی تھی۔ ایڑیاں رگڑتے تھے اور سسکتے تھے۔ یہاں سے پچاس والنٹیروں کا ایک دستہ ان غمزدوں کی امداد کرنے کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ اس وقت کنور صاحب ان کا انتخاب کر رہے تھے۔ اُنہیں ضروری باتیں سمجھا رہے تھے۔ ڈاکٹر گنگولی نے اس بڑھاپے میں بھی اُن کا سردار ہونا منظور کر لیا تھا۔ دونوں اصحاب اس قدر مشغول تھے کہ مسز سیلوک کی طرف کسی نے دھیان نہ کیا۔ آخر وہ خود بولیں "ڈاکٹر صاحب! آپ کا کب جانے کا ارادہ ہے؟"

کنور صاحب نے مسز سیلوک کو دیکھا اور بڑے تپاک سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ خیر و عافیت دریافت کی اور لے جاکر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ صوفیہ اپنی ماں کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔

کنور صاحب۔ یہ لوگ گڑھوال جا رہے ہیں۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ وہاں لوگوں پر کتنی زبردست مصیبت آپڑی ہے۔

مسز سیلوک۔ خدا ان لوگوں کو اپنے پاک مقصد میں کامیاب کرے۔ ان کے ایثار کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں دیکھتی ہوں یہاں اُن

کی خاصی تعداد ہے۔

کنور صاحب۔ مجھے اتنی اُمید نہ تھی۔ ونے کی باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ سوچتا تھا۔ اتنے والنٹیر (خدّامِ وطن) کہاں ملیں گے؟ سبھوں کو نوجوانوں کی پست ہمتی کا رونا روتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ان میں جوش نہیں ہے۔ ایثار نہیں ہے۔ جان نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے ذاتی غرض کے نشہ میں متوالے ہو رہے ہیں۔ کتنی ہی سیوا سمتیاں قایم ہوئیں پر ایک بھی سرسبز نہ ہوئی۔ لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لوگوں کو ہمارے نوجوانوں کے بارہ میں کتنا وہم ہوا تھا۔ اب تک تین سو نام درج ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تمام عمر قومی خدمت کی انجام دہی کا عہد کیا ہے۔ ان میں کئی اشخاص تو ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی پر لات مار کر آئے ہیں۔ ان لوگوں کا حوصلہ دیکھ کر مجھے بہت کچھ اُمید ہو گئی ہے۔

مسز سیوک۔ مسٹر کلارک کل آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ خدا نے چاہا تو آپ کو جلد ہی "سی آئی ای" کا خطاب ملے گا اور مجھے آپ کو مبارکباد دینے کا موقع۔

کنور صاحب (شکریہ کرم) میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں مسٹر کلارک مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو یہ اُن کا حسن ظن ہے مِس سیلوک! تیار رہنا۔ کل تین بجے کی ریل سے یہ لوگ روانہ ہوں گے۔ پربھو نے بھی آنے کا وعدہ کیا ہے۔

مسز سیوک۔ صوفی تو آج گھر جا رہی ہے (مسکرا کر) شاید آپ کو عنقریب ہی اس کا کنیا دان دینا پڑے۔ مسٹر کلارک جال پھیلا رہے ہیں۔

صوفیہ شرم سے گڑ گئی۔ اُس کو اپنی ماں کے اوچھے پن پر غصہ آرہا
تھا۔ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ سمجھتی
ہیں کہ مسٹر کلارک کا نام لینے سے کنور صاحب رعب میں آجائیں گے؟

کنور صاحب۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ صوفی دیکھو ہم لوگوں کو
اور خصوصاً اپنے غریب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ تمہیں ایشور نے جتنا
اچھا دل عطا کیا ہے ویسا ہی اچھا موقع بھی مل رہا ہے۔ ہماری دعائیں
ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ تمہارے احسان سے ہم کبھی سبکدوش
نہیں ہوسکتے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کو بھی یاد کرتی رہنا۔ مجھے پہلے نامعلوم
تھا ورنہ آج آندو کو ضرور بلا بھیجنا۔ خیر ملک کی حالت تم پر واضح
ہے مسٹر کلارک بہت ہی ہونہار آدمی ہیں۔ ایک دن ضرور یہ اس
ملک کے کسی صوبہ کے حاکم ہوں گے۔ میں یقین کے ساتھ یہ پیشینگوئی
کرسکتا ہوں۔ اُس وقت تم اپنے اثر اختیار اور اپنی قابلیت سے
ملک کو بہت کچھ نفع پہنچا سکو گی۔ تم نے اپنے اہالیان ملک کی حالت
دیکھی ہے۔ اُن کی مفلسی کا تمہیں پورا احساس ہے۔ اُن کی حالت
کی اصلاح میں اسی احساس سے کام لینا۔

صوفیہ شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی ماں نے کہا "آپ
رانی صاحبہ کو ضرور ساتھ لائیے گا۔ میں کارڈ بھیجوں گی"۔

کنور صاحب۔ نہیں مسز سیوک! مجھے معاف کیجئے گا۔ مجھے افسوس
ہے کہ میں اُس تقریب میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ میں نے عہد کر لیا ہے
کہ میں حکام سے علاقہ نہ رکھوں گا۔ حکام کی نظرِ التفات ہم لوگوں کو
دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر خودپسند اور خودمختار بنادیتی ہے۔ میں اپنے

کو اس آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا کیونکہ مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے۔ میں اپنی قوم میں حاکم، محکوم ادنٰے۔ اعلےٰ کی تفریق نہیں رکھنا چاہتا۔ ہم سب محکوم ہیں۔ شاہ بھی محکوم ہے اور گدا بھی چھوٹے اقتدار کے غرور سے میں اپنا سر نہیں پھرانا چاہتا۔

مسز سیوک۔ خدا نے آپ کو راجہ بنایا ہے۔ راجوں ہی کے ساتھ تو راجہ کا میل ہو سکتا ہے۔ انگریز لوگ بابوؤں کو منہ نہیں لگاتے کیونکہ اس سے یہاں کے راجاؤں کی توہین ہوتی ہے۔

ڈاکٹر گنگولی۔ مسز سیوک۔ یہ بہت دنوں تک راجہ رہ چکا ہے اب اس کا جی بھر گیا ہے۔ میں اس کا بچپن کا ساتھی ہوں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ دیکھنے میں یہ مجھ سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ پر کئی سال بڑا ہے۔

مسز سیوک۔ (ہنس کر) ڈاکٹر کے لئے یہ تو کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر۔ ہم دوسروں کا دوا کرنا جانتا ہے۔ اپنا دوا کرنا نہیں جانتا۔ کنور صاحب اسی کمبخت (وقت) سے Pessimist (مایوس المزاج) ہے۔ اسی وجہ سے اس کے پڑھنے میں رکاوٹ پڑی۔ اب بھی اس کا وہی حال ہے۔ ہاں اب تھوڑا پھیر پھار ہوگیا ہے پہلے فعل سے بھی مایوسی پسند تھا اور قول سے بھی۔ اب اس کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہے۔ قول سے تو اب بھی ویسا ہی ہے پر کام وہ کرتا ہے جسے کوئی پکا (optimist) امید پر بھروسہ رکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔

کنور صاحب۔ گنگولی تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہے ہو۔ مجھ میں پُر امید ہونے کے اوصاف ہی نہیں ہیں۔ ایسا شخص پرماتما کا

بھگت ہوتا ہے۔ پکا گیانی۔ پورا رشی۔ اُس کو چاروں طرف پرماتما ہی کا جلوہ نظر آتا ہے اسی وجہ سے اُس کو مستقبل پر بے اعتمادی نہیں ہوتی میں شروع ہی سے تن آسانیوں کا غلام رہا ہوں۔ وہ روحانی علم نہیں حاصل کرسکا جسے امید کی کنجی کہنا چاہئے۔ میرے لئے ناامیدی (Pessimism) کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسٹر سیوک ! ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا خلاصہ صرف ایک لفظ ایثار ہے۔ ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں وہ کسی عارف کامل کو بھی دہریہ بنا کر چھوڑتیں جس شخص کے سات بیٹے جوان ہو ہو کر دنیا سے اُٹھ جائیں لیکن وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرے۔ ایسی مثال مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ اُن کی ہمت ٹوٹنا تو جانتی ہی نہیں۔ صدمات کی چوٹیں انہیں اور بھی ٹھوس بنا دیتی ہیں۔ میں کم ہمت اور کمزور شخص ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی حکمران قوم محکوم قوم کے ساتھ انصاف اور مساوات کا برتاؤ کرسکتی ہے۔ انسانی فطرت کو میں کسی ملک میں کسی وقت بھی اس قدر بے لوث اور بے غرض نہیں پاتا۔ جس قوم نے ایک بار اپنی آزادی کھودی۔ وہ پھر اُس درجہ کو نہیں حاصل کرسکتی تھی۔ غلامی ہی اُس کی تقدیر ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب انسانی فطرت کو اتنا خودغرض نہیں سمجھتے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ خونخوار جانوروں کے دل میں بھی ازلی نور کی شعاعیں موجود رہتی ہیں۔ صرف پردہ ہٹانے کی ضرورت ہے۔ میں انگریزوں کی طرف سے مایوس ہوگیا ہوں۔ برخلاف اس کے ان کو کامل یقین ہے۔ کہ ہندوستان کی نجات انگریزوں ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور ہوگی۔

مسز سیوک (روکھے پن سے) تو کیا آپ یہ نہیں مانتے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ شاید کسی قوم نے کسی ملک یا قوم کے ساتھ نہ کیا ہو؟

کنور صاحب۔ نہیں۔ میں یہ نہیں مانتا۔

مسز سیوک۔ (تعجب سے) تعلیم کی اتنی اشاعت اور بھی کسی زمانہ میں ہوئی؟

کنور صاحب۔ میں اُسے تعلیم نہیں کہتا جو انسان کو سراپا خود غرضی بنا دے۔

مسز سیوک۔ ریل۔ تار۔ ڈاک۔ جہاز یہ ساری کرامتیں انگریزوں ہی کے ساتھ آئیں۔

کنور صاحب۔ انگریزوں کے بغیر بھی آ سکتی تھیں اور اگر آئی بھی ہیں تو زیادہ انگریزوں ہی کے فائدہ کے لئے۔

مسز سیوک۔ ایسا قانون پہلے کبھی نہ تھا۔

کنور صاحب۔ بجا ہے۔ ایسا قانون کہاں تھا جو ناانصافی کو انصاف اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھائے۔ یہ انصاف نہیں۔ انصاف کا گورکھ دھندا ہے۔

دفعتاً رانی صاحبہ کمرہ میں آئیں۔ صوفیہ کا چہرہ اُنہیں دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ وہ کمرہ کے باہر نکل گئی۔ رانی کے سامنے کھڑی نہ رہ سکی۔ مسز سیوک کو بھی اندیشہ ہوا کہ کہیں چلتے چلاتے رانی سے پھر نہ بات بڑھ جائے۔ وہ بھی باہر چلی گئیں۔ کنور صاحب نے دونوں کو فٹن پر سوار کرایا۔ صوفیہ نے آب دیدہ ہو کر کنور صاحب کو دست بستہ سلام کیا۔ فٹن

چل دی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ فٹن سڑک پر تیزی سے دوڑی چلی جاتی تھی اور صوفیہ رو رہی تھی۔ اُس کی حالت اُس بچہ کی سی تھی جو ریوڑی کھاتا ہوا مٹھائی والے کی آواز سُن کر اُس کے پیچھے دوڑے۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ پیسہ ہاتھ سے نکل جائے اور وہ روتا ہوا گھر لوٹ جائے ٭

(۱۵)

راجہ مہیندر کمار سنگھ اگرچہ اصولی معاملہ میں حکام سے ذرا بھی نہ دبتے تھے۔ لیکن فروعی امور میں وہ خواہ مخواہ اُن کی مخالفت کرنا محض بیکار ہی نہیں بلکہ قوم کے لئے مضر خیال کرتے تھے۔ اُنکو میانہ روی پر جتنا بھروسہ تھا اتنا پیش دستی پر نہ تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ موجودہ حالات گردوپیش کے ہوتے ہوئے جو کچھ خدمت کر سکتے تھے وہ حکام کا اعتماد رکھ کر ہی کر سکتے تھے۔ اس لئے اُنہیں کبھی کبھی مجبور ہو کر وہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا جس سے انتہا پسندوں کو اُن پر انگشت نمائی کا موقع مل جاتا تھا۔ اُن میں اگر کوئی کمزوری تھی۔ تو یہ کہ وہ عزت کے بھوکے تھے اور ایسے دیگر انسانوں کی طرح وہ اکثر مصلحت کے نقطۂ خیال سے نہیں بلکہ شہرت طلبی کے خیال سے، اپنا طرز عمل قایم کرتے تھے۔ پہلے اُنہوں نے انصاف کا پہلو لیتے ہوئے جان سیوک کو سورداس کی زمین دلانے سے انکار کر دیا تھا مگر اب اُن کو اُس کے خلاف کام کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑ رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کے لئے تو پانڈے پور والوں کا طاہر علی کے گھر میں گھُسنے پر آمادہ ہونا ہی کافی تھا لیکن اصل جان سیوک اور مسٹر کلارک کی باہمی رفاقت نے ہی اُنہیں اپنا پہلا

فیصلہ بیٹ دینے کی ترغیب دی تھی۔ لیکن ابھی اُنھوں نے بورڈ میں اس تجویز کو پیش نہ کیا تھا۔ یہ شک ہوتا تھا کہ کہیں لوگ مجھ پر ایک دولتمند سوداگر کی جانبداری کا الزام نہ لگائیں۔ اُن کی عادت تھی کہ بورڈ میں کوئی تجویز رکھنے سے پہلے وہ اندو سے یا اُس کی عدم موجودگی میں اپنے کسی خاص دوست سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ اُن کے سامنے اپنی بات کو ثابت کرتے ہوئے اُن کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کر کے اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔ اگرچہ اُن کے ارادہ میں اس بحث مباحثہ سے کوئی فرق نہ واقع ہوتا بلکہ وہ اپنی بات پر قایم رہتے تاہم گھنٹہ دو گھنٹہ کے تبادلِ خیالات سے اُن کو بہت تسکین ملتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ سمتی کے والنٹیر گڑھوال جانے کے لئے اسٹیشن پر جمع ہو رہے تھے۔ اندو نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ مطلع ابر آلود ہو رہا تھا اور لحہ بہ لحہ آسمان سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا لیکن والنٹیروں کو رخصت کرنے اسٹیشن پر جانا ضروری تھا۔ رانی صاحبہ نے اُس کو بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا تھا۔ وہ جانے کو تیار تھی کہ راجہ صاحب اندر آئے اور اندو کو جانے پر طیار دیکھ کر بولے "کہاں جاتی ہو؟ بادل گھرا ہوا ہے"۔

اندو۔ سیوا سمتی کے لوگ گڑھوال جا رہے ہیں۔ اُنہیں رخصت کرنے اسٹیشن جا رہی ہوں۔ اماں جی نے بلایا بھی ہے۔

راجہ۔ پانی ضرور برسے گا۔

اندو۔ پردہ ڈال لوں گی اور بھیگ بھی گئی تو کیا۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں جو قومی خدمت کے لئے اتنی دور جا رہے ہیں۔

راجہ۔ نہ جاؤ تو کوئی ہرج ہے؟ اسٹیشن پر مجمع زیادہ ہوگا ۔
اندو۔ ہرج کیا ہوگا۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں وہ لوگ تو جائیں گے ہی لیکن دل نہیں مانتا۔ وہ لوگ گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کریں گے۔ نہ جانیں کب لوٹیں گے مجھ سے اتنا بھی نہ ہو کہ انہیں رخصت کر آؤں۔ آپ بھی کیوں نہیں چلتے؟
راجہ۔ (متحیّر ہوکر) میں؟
اندو۔ ہاں ہاں۔ آپ کے جانے میں کوئی ہرج ہے؟
راجہ۔ میں ایسی جماعتوں میں شریک نہیں ہوتا ۔
اندو۔ کیسی جماعتوں میں؟
راجہ۔ اسی قسم کی جماعتوں میں ۔
اندو۔ کیا سیوا سمتیوں سے ہمدردی رکھنا بھی قابل اعتراض ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایسے مبارک کاموں میں شریک ہونا کسی کے لئے بھی شرم یا اعتراض کا سبب نہیں ہو سکتا ۔
راجہ۔ تمہاری اور میری سمجھ میں بہت فرق ہے۔ اگر میں بورڈ کا صدر نہ ہوتا۔ اگر میں حکومت کا ایک رکن نہ ہوتا۔ اگر میں ایک ریاست کا مالک نہ ہوتا تو آزادی سے ہر ایک جمہوری تحریک میں حصہ لیتا۔ موجودہ حالت میں میرا کسی ایسی جماعت میں شریک ہونا اس بات کا ثبوت سمجھا جائے گا کہ حکام کو بھی اُس جماعت سے ہمدردی ہے۔ میں اس غلط خیال کی اشاعت نہیں کرنا چاہتا۔ سیوا سمتی نوجوانوں کی جماعت ہے اور اگرچہ اس وقت اُس نے خدمتِ عامہ کا معیار اپنے سامنے رکھا ہے اور وہ اسی خدمت کے راستہ پر چلنے کی آرزو رکھتی ہے لیکن

تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ خدمت یا فیض رسانی اکثر ایسی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ جسے کوئی حکومت مقبولیت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ اور علانیہ یا پوشیدہ طریقوں سے اُسے اُس کو برباد کردینے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔

اندو۔ تو آپ اس عہدہ سے سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتے۔ اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہیں؟

راجہ۔ صرف اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ شہر کا انتظام جتنی خوبی سے میں کر سکتا ہوں اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اہلِ شہر کی خدمت کا ایسا عمدہ اور کمیاب موقع پاکر میں اپنی آزادی کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ میں ایک ریاست کا راجہ ہوں اور فطرتاً میری ہمدردی سرکار کے ساتھ ہے۔ مساوات اور جمہوریت کو جائداد سے دشمنی ہے۔ میں اُس وقت تک جمہوریت کا ساتھ نہ دوں گا۔ جب تک میں اپنی جائداد سے دست بردار ہو جانے کا ارادہ نہ کرلوں۔ میں قول سے جمہوریت کا پیرو بن کر اپنے فعل سے اُس کا مخالف نہیں بننا چاہتا۔ قول و فعل میں اتنا زبردست اختلاف ہونا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ میں اُن لوگوں کو فریبی اور مکار سمجھتا ہوں جو اپنی جائداد سے مستفید ہوتے ہوئے جمہوریت کی دُہائی دیتے پھرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جمہوریت کے دیوتا کے پجاری بن کر وہ کس مُنہ سے عظیم الشان محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹر کشتیوں میں سوار ہو کر دریا کی سیر کرتے ہیں اور دُنیا کی نعمتوں کا دل کھول کر لطف اُٹھاتے ہیں۔ اپنے کمرہ سے فرش ہٹا دینا اور سادی پوشاک پہن لینا ہی جمہوریت نہیں ہے۔ یہ بےحیائی اور

دغابازی ہے اپنے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کو غریبوں کے سامنے پھینک دینا جمہوریت کا منہ چڑانا ہے۔ اُسے بدنام کرنا ہے۔

یہ حملہ کنور صاحب پر تھا۔ اندو سمجھ گئی۔ تیوریاں بل گئیں۔ لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا اور اِس ناخوشگوار تفتیہ کو تمام کرنے کے لئے بولی "مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تین بجنے والے ہیں۔ ساڑھے تین بجے گاڑی چھوٹتی ہے۔ اماں جی سے ملاقات ہو جائے گی۔ دنے کی خیر و عافیت کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ ایک سانیتھ روکلج ہوگا"۔

راجہ۔ جن وجوہ سے میرا جانا نامناسب ہے انہیں وجوہ سے تمہارا جانا بھی مناسب نہیں۔ تم جاؤ یا میں جاؤں۔ ایک ہی بات ہے۔

آنندو اُسی پاؤں اپنے کمرہ میں واپس آئی اور سوچنے لگی۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ زبردست ظلم! کہنے کو میں رانی ہوں مگر اتنا اختیار بھی نہیں کہ گھر سے باہر بھی جا سکوں۔ مجھ سے تو لونڈیاں ہی اچھی ہیں۔ دل بہت مغموم ہو گیا۔ آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اُس نے گھنٹی بجائی اور لونڈی سے کہا "گاڑی کھلوا دو۔ میں اسٹیشن نہ جاؤں گی"۔

مہیندر کمار بھی اُس کے پیچھے ہی کمرہ میں آکر بولے "کہیں سیر کیوں نہیں کر آتیں؟"

اندو۔ نہیں۔ بادل گھرا ہوا ہے۔ بھیگ جاؤں گی۔

راجہ۔ کیا ناراض ہو گئیں؟

اندو۔ ناراض کیوں ہوں؟ آپ کی لونڈی ہوں۔ آپ نے حکم دیا نہ جاؤ۔ نہ جاؤں گی۔

راجہ۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میری باتوں کو جان لینے کے بعد بھی تمہیں وہاں جانے میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں معلوم ہوتی تو شوق سے جاؤ۔ میرا مقصد صرف تمہاری معقولیت پسندی کی تحریک سے تھا۔ میں انصاف کی طاقت سے روکنا چاہتا ہوں حکم کی طاقت سے نہیں۔ بولو۔ اگر تمہارے جانے سے میری بدنامی ہو تو تم جانا چاہو گی؟

یہ چڑیا کے پر کاٹ کر اُسے اُڑانا تھا۔ اندو نے اُڑنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ "ہرگز نہیں یہ میرے دھرم کے خلاف ہے۔" لیکن اندو پر اپنی مجبوری اتنی کھل رہی تھی کہ اُس نے اس سوال کو سنا ہی نہیں۔ یا سُنا بھی تو اسے ان سُنا کر دیا۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ میرے زخم پر نمک چھڑک رہے ہیں آماں اپنے دل میں کیا کہیں گی؟ میں نے بلایا اور نہیں آئی۔ کیا وقت کی ہوا لگ گئی؟ کس طرح معافی مانگوں؟ اگر لکھوں کہ طبیعت ناساز ہے تو وہ ابھی یہاں آ پہنچیں گی اور مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ آہ اب تک تو وہاں پہنچ گئی ہوتی۔ پربھو سیوک نے بہت پُر اثر نظم لکھی ہوگی واداجی کا وعظ بھی معرکہ کا ہوگا۔ ایک ایک لفظ محبت اور رغبت میں ڈوبا ہوا! والنٹیر لوگ اپنی خوشنما وردیوں میں کتنے خوب صورت معلوم ہوتے ہوں گے۔

اس قسم کے خیالات نے آندو کو اس قدر خواہش مند بنا دیا کہ وہ ضد کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ میں تو جاؤں گی۔ بدنامی نہیں بہتر ہوگی۔ یہ سب مجھے روک رکھنے کے بہانے ہیں۔ تم ڈرتے ہو ڈرو۔ اپنے کیوں

ے پیل ہو گو گے۔ میں کیوں ڈروں ؟ اپنے دل میں یہ خیالات کرتے
ہوئے اُس نے مصمم لہجہ میں کہا "آپ نے مجھے جانے کی اجازت دے
دی ہے۔ میں جاتی ہوں"۔
راجہ نے بیدلی سے کہا "تمہاری مرضی۔ جانا چاہتی ہو تو شوق سے
جاؤ"۔
اندو چلی گئی تو راجہ صاحب سوچنے لگے۔ عورتیں کتنی بیدرد۔
کتنی خود پسند اور کتنی ضدی ہوتی ہیں۔ چلی جارہی ہے گویا میں کچھ
ہی نہیں ہوں۔ اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ حکام کے کانوں تک یہ
خبر پہنچے گی تو وہ مجھے کیا کہیں گے۔ اخبارات کے نامہ نگار یہ خبر ضرور
ہی لکھیں گے اور وہاں جانے والی عورتوں میں چتاری کی رانی کا نام
جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔ میں جانتا کہ اتنی ضد کریں گی تو
منع ہی کیوں کرتا ؟ خود بھی ساتھ جاتا۔ ایک طرف بدنام ہوتا تو دوسری
طرف نیک نام۔ اب تو دونوں طرف سے گیا۔ ادھر بھی بُرا بنا اور اُدھر
بھی۔ آج معلوم ہوا کہ عورتوں کے سامنے محض صاف گوئی سے کام نہیں
چلتا۔ وہ راضی رہتی ہیں تو دلجوئی سے !
آندو اسٹیشن کی طرف چلی۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتی تھی اُس
کا دل ایک بوجھ سے دبا جاتا تھا۔ میدان میں جسے ہم فتح کہتے ہیں گھر
میں اُسی کا نام کج خلقی۔ بیمروتی اور نااہلیت ہے۔ اندو کو اس فتح پر
غرور نہ تھا۔ اپنی ضد کا ملال تھا۔ سوچتی جاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے دل
میں کتنی خود سر و مغرور سمجھ رہے ہوں گے کہ جب یہ ذرا ذرا سی باتوں
میں یوں آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ ذرا ذرا سے اختلافات میں یوں لڑنے

پر آمادہ ہو جاتی ہے تو کسی نازک موقع پر اس سے ہمدردی و غمگساری کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ اماں جی یہ حال سُنیں گی تو مجھی کو بھلا بُرا کہیں گی۔ بے شک مجھے غلطی ہوئی۔ واپس چلوں اور اُن اپنی اس غلطی کے لئے معافی مانگوں۔ میرے سر پر نہ جانے کیوں بھوت سوار ہو جاتا ہے خواہ مخواہ اُلجھ پڑی۔ بھگوان! مجھے کب اتنی عقل آئے گی کہ اُن کی مرضی پر سر جھکانا سیکھوں گی؟

اندو نے باہر کی طرف سر نکال کر دیکھا۔ اسٹیشن کا سگنل نظر آرہا تھا۔ عورتوں اور مردوں کا ایک انبوہ اسٹیشن کی طرف دوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سواریوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اُس نے کوچوان سے کہا۔ "گاڑی پھیر دو۔ میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔ گھر واپس چلو"۔

کوچوان نے کہا۔ "سرکار! اب تو آگئے۔ وہ دیکھئے۔ کئی آدمی مجھے اشارتاً کہہ رہے ہیں کہ گھوڑوں کو بڑھاؤ۔ گاڑی پہچانتے ہیں"۔

اندو۔ کچھ پرواہ نہیں۔ فوراً گھوڑے پھیر دو۔

کوچوان۔ کیا سرکار کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا؟

اندو۔ بک بک مت کرو۔ گاڑی واپس لے چلو۔

کوچوان نے گاڑی پھیر دی۔ اندو نے ایک لمبی سانس لی اور سوچنے لگی۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ گاڑی دیکھتے ہی پہچان گئے تھے۔ اماں کتنی خوش ہوئی ہوں گی۔ پر گاڑی کو لوٹتے دیکھ کر انہیں اور دوسرے لوگوں کو کتنا تعجب ہوا ہوگا۔ کوچوان سے کہا۔ "ذرا پیچھے منہ پھیر کر دیکھو کوئی آ تو نہیں رہا ہے"؟

کوچوان۔ حضور۔ کوئی گاڑی تو آرہی ہے۔

اندو۔ گھوڑوں کو تیز کردو۔ سرپٹ چھوڑ دو۔
کوچوان۔ حضور گاڑی نہیں۔ موٹر ہے۔ صاف موٹر ہے۔
اندو۔ گھوڑوں کو چابک لگاؤ۔
کوچوان۔ حضور۔ یہ تو اپنی ہی موٹر معلوم ہوتی ہے۔ ہینگن سنگھ چلا رہے ہیں۔ خوب پہچان گیا۔ اپنی ہی موٹر ہے۔
اندو۔ پاگل ہو۔ اپنی موٹر یہاں کیوں آنے لگی؟
کوچوان۔ حضور۔ اپنی موٹر نہ ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔ صاف نظر آتی ہے۔ وہی رنگ ہے۔ ایسی موٹر اس شہر میں دوسری ہے ہی نہیں۔
اندو۔ ذرا غور سے دیکھو۔
کوچوان۔ کیا دیکھوں۔ حضور۔ وہ آپہنچی۔ سرکار بیٹھے ہیں۔
اندو۔ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے!
کوچوان۔ لیجئے حضور۔ یہ برابر آگئی۔
اندو نے گھبرا کر باہر دیکھا تو سچ مچ اپنی ہی موٹر تھی۔ گاڑی کے برابر پہنچ کر وہ رک گئی اور راجہ صاحب اتر پڑے۔ کوچوان نے گاڑی روک دی۔ اندو نے حیرت سے پوچھا "آپ کب آگئے"؟
راجہ۔ تمہارے آنے کے پانچ منٹ بعد میں بھی چل پڑا۔
اندو۔ راستہ میں تو کہیں نہیں دکھائی دیئے۔
راجہ۔ لائن کی طرف سے آیا ہوں۔ ادھر کی سڑک خراب ہے۔ میں نے سمجھا۔ ذرا چکر تو پڑے گا مگر جلد پہنچوں گا۔ تم اسٹیشن کے سامنے سے کیسے لوٹ آئیں؟ کیا بات ہے؟ طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو گھبرا گیا۔ آؤ۔ موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ اسٹیشن پر گاڑی آگئی ہے۔ دس منٹ میں چھوٹ

جائے گی۔ لوگ ملنے کے خواہش مند ہیں ۔

اندو۔ اب میں نہ جاؤں گی۔ آپ تو پہنچ ہی گئے تھے ۔

راجہ۔ تمہیں چلنا پڑے گا ۔

اندو۔ مجھے مجبور نہ کیجئے۔ میں نہ جاؤں گی ۔

راجہ۔ پہلے تو تم یہاں آنے کے لئے اتنی بیقرار تھیں۔ اب کیوں انکار کر رہی ہو؟

اندو۔ آپ کی مرضی کے خلاف آئی تھی۔ آپ نے میری خاطر اپنے اصول کو توڑ دیا تو میں کس منہ سے وہاں جا سکتی ہوں؟ آپ نے مجھے ہمیشہ کے لئے رواداری کا سبق دے دیا ۔

راجہ۔ میں اُن لوگوں سے تمہیں لانے کا وعدہ کر آیا ہوں۔ تم نہ چلو گی تو مجھے کتنا محجوب ہونا پڑے گا ۔

اندو۔ آپ خوامخواہ اصرار کر رہے ہیں۔ آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا یہ آخری موقع تھا۔ اب پھر اتنی جُرأت نہ کروں گی ۔

راجہ۔ انجن سیٹی دے رہا ہے ۔

اندو۔ ایشور کے لئے مجھے جانے دیجئے ۔

راجہ نے مایوس ہو کر کہا۔ جیسی تمہاری مرضی۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے اور تمہارے ستاروں میں کوئی فطری نامناسبت ہے جو ہر وقت اپنا اثر دکھلاتا رہتا ہے ۔

یہ کہہ کر وہ موٹر پر سوار ہو گئے اور بڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف چلے۔ فٹن بھی آگے بڑھی۔ کوچوان نے پوچھا کہ حضور گئیں کیوں نہیں۔ سرکار بُرا مان گئے ۔

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا مجھ سے پھر غلطی ہوئی؟ کیا میرا جانا مناسب تھا؟ کیا وہ سچے دل سے میرے چلنے کے لئے اصرار کر رہے تھے یا ایک تازیانہ لگانا چاہتے تھے؟ ایشور ہی جانے۔ وہی عالم الغیب ہے۔ میں کسی کے دل کی بات کیا جانوں؟

گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل پھٹ رہے تھے۔ لیکن اندو کے دل پر چھائی ہوئی گھٹا لمحہ بہ لمحہ زیادہ گھنی ہوتی جا رہی تھی۔" آہ۔ کیا واقعی ہمارے ستاروں میں کوئی نظری نامناسبت ہے جو قدم قدم پر ہمارے ارادوں کو پامال کرتی رہتی ہے؟ میں کتنا چاہتی ہوں کہ اُن کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہ چلوں مگر یہ طالع کی نحوست مجھے ہمیشہ زک دیتی ہے۔ اگر وہ صاف دل سے اصرار کر رہے تھے تو میرا انکار سراسر بیجا تھا۔ آہ اُنہیں میرے ہاتھوں پھر دُکھ پہنچا۔ اُنھوں نے اپنی جبلی شرافت سے مجھے معاف کر دیا اور میری دل جوئی کے لئے اپنے اصول کی پرداہ نہ کی۔ سمجھے ہوں گے اکیلی جائے گی تو لوگ خیال کریں گے کہ شوہر کی مرضی کے خلاف آئی ہے ورنہ کیا وہ بھی نہ آتے۔ مجھے اس الزام سے بچانے کے لئے اُنھوں نے اپنے اوپر اتنا جبر کیا۔ میری حماقت سے وہ کس قدر مایوس ہوئے ہیں ورنہ اُن کے مُنہ سے یہ جملہ کبھی نہ نکلتا۔ میں سچ مچ ابھاگنی ہوں ؟"

انہیں افسوس ناک خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ چندر بھون پہنچی اور گاڑی سے اُتر کر سیدھے راجہ صاحب کے دیوان خانہ میں جا بیٹھی آنکھیں چُرا رہی تھی کہ کسی نوکر چاکر سے سامنا نہ ہو جائے۔ اُسے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرہ پر کوئی داغ لگا ہوا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ راجہ صاحب آتے ہی آتے مجھ پر بگڑنے لگیں۔ مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیں۔ جگر کو طعنوں کے تیروں سے چھلنی بنا دیں۔ یہی اُن کی صاف دلی کا ثبوت ہوگا۔ اگر وہ آکر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگیں تو سمجھ جاؤں گی کہ میری طرف سے اُن کا دل صاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب محض ظاہرداری ہے۔ وہ اس وقت اپنے شوہر کی سختی گیری کی خواہش مند تھی۔ گرمیوں میں کسان بارش کا نہیں بلکہ حدت کا بھوکا ہوتا ہے ٭

اندو کو بہت دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ پانچ بجتے بجتے راجہ صاحب آپہنچے۔ وہ دروازہ پر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ راجہ صاحب اُس کو دیکھتے ہی محبت آمیز لہجہ میں بولے "تم نے آج قومی سرگرمی کا ایک بے مثل نظارہ دیکھنے کا موقع کھو دیا۔ بڑا ہی دلکش منظر تھا کوئی ہزار آدمیوں نے جس وقت جانے والوں پر پھول برسائے تو ساری زمین پھولوں سے ڈھک گئی۔ والنٹیروں کا قومی گانا اتنا پُراثر کہ تماشائی مست ہو گئے۔ میرا دل قومی غرور سے اُچھلنے لگا۔ بار بار یہی افسوس ہوتا تھا کہ تم نہ ہوئیں۔ یہی سمجھ لو کہ میں اُس لطف کا اظہار نہیں کر سکتا۔ میرے دل میں سیوا سمتی کے متعلق جتنے شکوک تھے وہ سب رفع ہو گئے۔ یہی جی چاہتا تھا کہ میں بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس جماعت کے ساتھ چلا جاتا۔ ڈاکٹر گنگولی کو اب تک میں بالکل بکواسی سمجھتا تھا۔ آج میں اُن کا حوصلہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تم نے سخت غلطی کی۔ تمہاری ماتاجی بار بار پوچھتی تھیں" ٭

اندرو کو جس بات کا خوف تھا وہ پوری ہو گئی۔ سوچا کہ یہ سب ظاہر داری ہے اُن کا دل صاف نہیں ہے۔ یہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں اور بیوقوف بنانا چاہتے ہیں۔ اس شیریں بیانی کے پردہ میں کتنی تلخی چھپی ہوئی ہے۔ چڑھ کر بولی "میں جاتی تو آپ کو ضرور بُرا معلوم ہوتا!!"

راجہ۔ (ہنس کر) محض اس لئے کہ میں نے تمہیں جانے سے رد کا تھا؟ اگر مجھے بُرا معلوم ہوتا تو میں خود ہی کیوں جاتا؟

اندرو۔ معلوم نہیں۔ آپ کیا سمجھ کر گئے۔ شاید مجھے خفیف کرنا منظور تھا؟

راجہ۔ اندرو۔ اتنی بدگمان نہ ہو۔ سچ کہتا ہوں مجھے تمہارے جانے کا ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے پہلے تمہاری ضد بُری معلوم ہوئی۔ لیکن جب میں نے غور کیا تو مجھے اپنا طرز عمل بالکل غیر مناسب معلوم ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ تمہاری آزادی میں اس حد تک مخل ہونا میری زیادتی ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی غرض سے میں اسٹیشن گیا۔ تمہاری وہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ حکام کے دلوں میں اپنا وقار قایم رکھنے کے لئے اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہو؟ نیک نام رہنا اچھی بات ہے لیکن نیک نامی کے لئے سچی باتوں میں دبنا اپنے ضمیر کا خون کرنا ہے۔ اب تو تمہیں میری باتوں کا یقین ہوا؟

اندرو۔ آپ کی دلیلوں کا جواب میں نہیں دے سکتی لیکن آپ سے التجا کرتی ہوں کہ جب مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو تو آپ میری تنبیہ کریں۔ مجھے ملامت کریں۔ جرم اور سزا میں علت اور معلول کا واسط

ہے اور یہی میری سمجھ میں آتا ہے۔ خطا کار کے سر پر نیل چھڑکتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھے یہ بات غیر قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے میرے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

راجہ۔ دیوی رکھنی ہیں تو لوگ انہیں سناتے ہیں۔ اس میں غیر قدرتی بات کیا ہے؟

دونوں میں دیر تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ مہیندر بہیلئے (صیاد) کی طرح دانہ دکھا کر چڑیا کو پھنسانا چاہتے تھے اور چڑیا ڈر کر اُڑ جاتی تھی۔ فریب سے فریب ہی پیدا ہوتا ہے۔ وہ اندو کی تشفی نہ کر سکے تب وہ اُس کی تکلیف کے رفع کرنے کا کام وقت پر چھوڑ کر ایک خط پڑھنے لگے اور اندو دل پر بوجھ رکھے ہوئے اندر چلی گئی۔

دوسرے روز راجہ صاحب نے روزانہ اخبار کھولا تو اُس میں رضا کاروں کی رخصتی کا تذکرہ بہ تفصیل شائع ہوا تھا۔ ضمناً راجہ صاحب کی موجودگی پر بھی رائے زنی کی گئی تھی۔ "اس موقع پر میونسپلٹی کے صدر راجہ مہیندر کمار سنگھ کی موجودگی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تعجب ہے کہ راجہ صاحب جیسے معاملہ فہم شخص نے وہاں جانا کیوں ضروری سمجھا؟ راجہ صاحب اپنی ذات کو اپنے عہدہ سے جدا نہیں کر سکتے۔ اور اُن کی موجودگی گورنمنٹ کو اُلجھن میں ڈالنے کا سبب ہو سکتی ہے تجربہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ سیوا سمتیوں کا آغاز خواہ کتنے ہی نیک ارادوں کو لے کر ہوا ہو لیکن انجام کار وہ بغاوت اور بدامنی کا مرکز بن جاتی ہیں۔ کیا راجہ صاحب اُس کا ذمہ لے سکتے ہیں کہ یہ سیوا سمتی بھی آگے چل کر اپنی پیشرو سمتیوں کے نقشِ قدم پر نہ چلیگی؟

راجہ صاحب نے اخبار بند کرکے رکھ دیا اور خیال میں غرق ہو گئے۔ اُن کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا "وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ آج کلب میں جاتے ہی جاتے مجھ پر چاروں طرف سے مشتبہ نگاہیں پڑنے لگیں گی۔ کل ہی کمشنر صاحب سے ملنے جانا ہے۔ اُنہوں نے اس بارہ میں کچھ پُوچھا تو کیا کہوں گا؟ اس کم بخت اڈیٹر نے مجھے بُرا چرکا دیا۔ پولیس والوں کی طرح اِس فرقہ میں بھی مرّوت نہیں ہوتی۔ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ میں اِس کا منہ بند رکھنے کے لئے اِسے خوش رکھنے کے لئے کتنی کوششیں کیا کرتا ہوں۔ ضروری اور غیر ضروری اعلانات چھپوا کر اس کی مٹھیاں گرم کرتا رہتا ہوں۔ جب کوئی دعوت یا تقریب ہوتی ہے تو سب سے پہلے اِسے مدعو کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ سال گذشتہ میں اِسے میونسپلٹی سے انعام بھی دلا دیا تھا۔ اِنہیں خاطر داریوں کا یہ صلہ ہے۔ کُتّے کی دُم کو سو برس تک گاڑ رکھو۔ پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ اب اپنی پوزیشن کو کیونکر صاف کروں؟ اس کے پاس جانا تو درست نہیں۔ کیا کوئی حیلہ سوچوں؟"

راجہ صاحب بہت دیر تک اسی کشمکش و پیچ میں پڑے رہے۔ کوئی ایسی بات سوچ نکالنا چاہتے تھے جس سے حکام کی نگاہوں میں وقار قائم رہے اور ساتھ ہی عوام کی نگاہوں میں بھی۔ مگر عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ چل کر اندو سے اِس گتھی کے سلجھانے میں مدد لوں۔ پر یہ سمجھ کر کہ کہیں وہ کہہ دے کہ "حکام ناراض ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ تمہیں اُن سے کیا سروکار۔ اگر وہ تمہیں دبائیں تو فوراً استعفےٰ دیدو۔" تو پھر نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہے گا۔ اُس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی ⁂

وہ تمام رات اسی فکر میں ڈوبے رہے۔ اندو بھی کچھ گم گم سی رہی علے الصباح دو چار احباب آگئے اور اُنھوں نے اُسی مضمون کا تذکرہ کیا۔ ایک صاحب بولے "میں کمشنر سے ملنے گیا تھا تو وہ اسی مضمون کو پڑھ رہے تھے اور رہ رہ کر زمین پر پیر پٹکتے جاتے تھے"۔

راجہ صاحب کے ہوش اور بھی اُڑ گئے۔ فوراً اُنہیں ایک تدبیر سوجھ گئی۔ موٹر تیار کرائی اور کمشنر کے بنگلہ پر جا پہنچے۔ یوں تو صاحب بہادر راجہ صاحب کو اُن کا کارڈ پاتے ہی بلا لیا کرتے تھے۔ آج اردلی نے کہا "صاحب ایک ضروری کام کر رہے ہیں۔ میم صاحب بیٹھی ہیں آپ ایک گھنٹہ ٹھہریں"۔

راجہ صاحب سمجھ گئے کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ وہیں بیٹھ کر ایک انگریزی رسالہ کی تصاویر دیکھنے لگے۔ واہ کتنی صاف اور خوشنما تصاویر ہیں۔ ہمارے رسالوں میں کتنی بھدّی تصویریں ہوتی ہیں۔ فضول ہی کاغذ کو لیپ پوت کر خراب کیا جاتا ہے۔ کسی نے بہت کیا تو ملک الشعرا بہاری کے جذبات کی بنا پر کسی خوب صورت نازنین کی تصویر بنوا دی اور اس کے نیچے اُسی نوعیت کا دوہا لکھ دیا۔ کسی نے پدماکر کی کبت پر تصویر بنوالی۔ بس اس کے آگے کسی کی عقل رسا نہیں ہوتی۔

کسی طرح ایک گھنٹہ گزرا اور صاحب نے بلایا۔ راجہ صاحب اندر گئے تو صاحب کے تیور پر بل پڑے ہوئے نظر آئے۔ ایک گھنٹہ کے انتظار سے جھنجھلا گئے تھے۔ کھڑے کھڑے بولے "اگر آپ کو فرصت ہو تو میں کچھ کہوں ورنہ پھر کبھی آؤں گا"۔

کمشنر صاحب نے رکھائی سے پوچھا "میں پہلے آپ سے یہ دریافت

کرنا چاہتا ہوں کہ اس اخبار نے آپ پر جو رائے زنی کی ہے وہ آپ کی نظر سے گذری ہے؟

راجہ صاحب۔ جی ہاں دیکھ چکا ہوں۔

کمشنر۔ آپ اس کا کوئی جواب دینا چاہتے ہیں؟

راجہ صاحب۔ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگر محض اتنی سی بات پہ مجھ پر شک کیا جاسکتا ہے اور میری سالہا سال کی وفاداری کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا تو مجھے مجبور ہو کر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ اگر آپ خود وہاں جاتے تو کیا اس کی اتنی جرأت ہوتی کہ آپ کے بارہ میں بھی اسی قسم کی رائے زنی کرتا؟ یہ میرے ہندوستانی ہونے کی سزا ہے۔ جب تک مجھ پر اس قسم کے بیجا حملے ہوتے رہیں گے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اپنے فرائض کو کس طرح انجام دے سکوں گا۔

کمشنر نے کسی قدر نرمی سے کہا "گورنمنٹ کے ہر ایک عملہ کا فرض ہے کہ اپنے اوپر ایسے الزامات لگائے جانے کا موقع نہ دے"۔

راجہ صاحب۔ میں جانتا ہوں۔ آپ لوگ اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اسی طرح میرے بورڈ کے رفقاء کے لئے یہ بھول جانا بالکل ناممکن ہے کہ میں حکومت کا ایک رکن ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بورڈ کے سامنے مسٹر جان سیوک کو پانڈے پور والی زمین دیئے جانے کی تجویز پیش کرنے والا ہوں۔ لیکن جب تک میں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت نہ کر دوں گا کہ میں نے خود بغیر کسی دباؤ کے صرف رعایا کے مفاد کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے۔ اس وقت اس کی منظوری کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسی وجہ سے میں کل اسٹیشن گیا تھا۔

کمشنر کی باچھیں کھل گئیں ہنس ہنس کر باتیں بنانے لگا ۔

راجہ صاحب۔ ایسی حالت میں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرا جواب دینا ضروری ہے ؟

کمشنر۔ نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں ۔

راجہ صاحب۔ مجھے آپ سے پوری مدد ملنی چاہئے ۔

کمشنر۔ میں حتی الامکان آپ کی مدد کروں گا ۔

راجہ صاحب۔ بورڈ نے منظور بھی کر لیا تو محلہ والوں کی طرف سے فساد کا اندیشہ ہے ۔

کمشنر۔ کچھ پرواہ نہیں۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تاکید کر دوں گا کہ وہ آپ کی مدد کرتے رہیں ۔

راجہ صاحب یہاں سے چلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آسمان پر چل رہے ہیں۔ یہاں سے وہ مسٹر کلارک کے پاس گئے۔ اور وہاں بھی اسی حکمت سے کام لیا۔ دوپہر کو گھر آئے۔ اُن کے دل میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ اس بہانہ سے میرا کام تو نکل گیا لیکن میں سورداس کے ساتھ کہیں ایسی زیادتی تو نہیں کر رہا ہوں کہ بالآخر مجھے شہر والوں کے سامنے نادم ہونا پڑے۔ اسی معاملہ پر گفتگو کرنے کے لئے وہ اندو کے پاس گئے اور بولے "تم کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہی ہو۔ مجھے ایک معاملہ میں تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے"۔

اندو ڈر گئی کہ کہیں مشورہ ہوتے ہوتے تنازعہ کی نوبت نہ آئے۔ بولی "کام تو کچھ نہیں کر رہی ہوں لیکن میں آپ کو کوئی صلاح دینے کے قابل نہیں ہوں۔ ایشور نے مجھ کو اتنی عقل ہی نہیں دی۔ مجھے تو اُس

نے کھانے سونے اور آپ کو دق کرنے کے لئے بنایا ہے"۔
راجہ صاحب۔ تمہارے دق کرنے ہی میں تو مزہ آتا ہے۔ بتلاؤ سورداس کی زمین کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟
اندو۔ آخر آپ نے کیا تجویز کیا؟
راجہ صاحب۔ پہلے تم بتاؤ تو پھر میں بتاؤں گا۔
اندو۔ میری رائے میں تو سورداس سے اُس کے باپ دادوں کی زمین چھین لینا سراسر انصاف کے خلاف ہوگا۔
راجہ صاحب۔ تمہیں معلوم ہے کہ سورداس کو اس زمین سے کوئی نفع نہیں پہنچ رہا ہے۔ صرف اِدھر اُدھر کے مواشی چرا کرتے ہیں۔
اندو۔ اُسے یہ اطمینان تو ہے کہ یہ زمین میری ہے۔ محلہ والے اُس کا احسان تو مانتے ہی ہوں گے۔ اس کی مذہبی خواہش اس کار ثواب سے پوری ہوتی ہوگی۔
راجہ صاحب۔ لیکن میں شہر کے ایک خاص منتظم کی حیثیت سے ایک شخص کے واقعی یا فرضی فائدہ کے لئے شہر کے ہزاروں روپیہ کا نقصان تو نہیں کر سکتا۔ کارخانہ کھلنے سے ہزاروں مزدوروں کی پرورش ہوگی۔ شہر کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس بے شمار دولت کا ایک حصہ ملک میں رہ جائے گا جو سگریٹ کے لئے دوسرے ملکوں کے حوالہ کر دینا پڑتا ہے۔
اندو نے راجہ صاحب کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا بسو...
نگا۔ اِن کا مطلب کیا ہے؟ سرمایہ داروں سے تو اِن کو کوئی خا...

اُنس نہیں ہے۔ یہ تو مشورہ نہیں۔ بحث ہے۔ کیا حکام کے دباؤ سے انھوں نے زمین کو مسٹر سیوک کے حوالہ کر دینے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ سے اپنی تجویز کی تائید کرانی چاہتے ہیں؟ ان کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا ہے۔ بولی " اس نقطۂ خیال سے تو یہی قرین انصاف ہے کہ سورداس سے وہ زمین چھین لی جائے "

راجہ صاحب۔ بھئی۔ اتنی جلدی پہلو بدلنے کی سند نہیں۔ اپنی اسی دلیل پر قایم رہو۔ میں صرف مشورہ نہیں چاہتا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اُس کے متعلق کیا کیا اعتراضات کر سکتی ہو اور میں ان کا معقول جواب دے سکتا ہوں یا نہیں؟ مجھے تو جو کچھ کرنا تھا کر چکا۔ اب تم سے بحث کرکے اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔

اندو۔ اگر میری زبان سے کوئی لفظ خلاف مزاج نکل جائے تو آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟

راجہ صاحب۔ اس کی پرواہ نہ کرو۔ قومی خدمت کا دوسرا نام بے حیائی ہے۔ اگر ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے لگیں تو ہمیں پاگل خانہ جانا پڑے۔

اندو۔ اگر ایک شخص کے ذاتی مفاد کے لئے آپ شہر کا نقصان نہیں کرنا چاہتے تو کیا سورداس ہی ایسا شخص ہے جس کے پاس دس بیگھے زمین ہو؟ شہر میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس اس سے کہیں زیادہ زمین ہے۔ کتنے ہی ایسے بنگلے ہیں جن کا احاطہ دس بیگھے سے زیادہ ہے۔ ہمارے بنگلہ کا احاطہ پندرہ بیگھے سے کم نہ ہوگا۔ مسٹر سیوک کے بنگلہ کا بھی پانچ بیگھے سے کم نہیں ہے اور دادا جی کا بنگلہ تو

بلورا ایک گاؤں ہے۔ آپ اِن میں سے کہیں کی زمین اس کارخانہ کے لئے لے سکتے ہیں۔ سوروا اس کی زمین میں تو محلّہ کے مویشی چرتے ہیں زیادہ نہیں تو ایک محلّہ کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے۔ ان احاطوں سے تو ایک تنہا شخص کے سوا اور کسی کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی اُن میں سیر بھی نہیں کر سکتا۔ ایک پھول یا پتی بھی نہیں توڑ سکتا اگر کوئی جانور اندر چلا جائے تو اُسے فوراً گولی مار دی جائے ؛

راجہ صاحب (مسکرا کر) واقعی وہیل بڑے معرکہ کی ہے۔ قایل ہو گیا۔ میرے پاس اِس کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تم اُس اندھے کو جتنا بے بس و بیکس سمجھتی ہو اتنا نہیں ہے سارا محلّہ اُس کی حمایت پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ لوگ مسٹر سیوک کے گماشتے کے گھر میں گھس گئے۔ اُن کے بھائیوں کو مارا۔ آگ لگا دی۔ عورتوں تک کی بیعزتی کی ؛

اندو۔ میرے خیال میں ایسا ہونا اِس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ وہ زمین چھوڑ دی جائے۔ اُس پر قبضہ کر لینے سے ایسے واقعات کم نہ ہوں گے۔ زیادہ ہی ہوں گے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے ؛

راجہ صاحب۔ جو لوگ عورتوں کی بیعزتی کر سکتے ہیں وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ؛

اندو۔ جن لوگوں کی زمین آپ چھین لیں گے وہ آپ کے پاؤں نہ سہلائیں گے ؛

راجہ صاحب۔ تعجب ہے کہ تم عورتوں کی بیحرمتی کو معمولی بات

سمجھ رہی ہو۔

اندو۔ فوج کے گورے۔ ریل کے ملازمین روز ہی ہماری بہنوں کی بےحرمتی کرتے رہتے ہیں۔ اُن سے تو کوئی نہیں بولتا۔ اسی لئے کہ آپ اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اگر لوگوں نے جرم کیا ہے تو اُن پر مقدمہ چلایئے۔ انہیں سزا دلایئے۔ اُن کی جائداد کیوں ضبط کرتے ہیں؟

راجہ صاحب۔ تم جانتی ہو۔ مسٹر سیوک کا یہاں کے حکام میں کتنا ربط ضبط ہے۔ مسٹر کلارک تو اُن کے دروازہ کے دربان بنے ہوئے ہیں۔ اگر میں اُن کی اتنی خدمت نہ کر سکا تو حکام کا اعتبار مجھ پر سے اُٹھ جائے گا۔

اندو۔ (متفکرانہ لہجہ میں) میں نہیں جانتی تھی کہ چیرمین اس قدر مجبور و معذور ہوا کرتا ہے۔

راجہ صاحب۔ اب تو معلوم ہو گیا۔ بتلاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

اندو۔ عہدہ سے مستعفی ہو جانا۔

راجہ صاحب۔ میرے مستعفی ہو جانے سے زمین نہ بچ سکے گی۔

اندو۔ آپ تو دُکھ پاپ سے بچ جائیں گے۔

راجہ صاحب۔ ایسی معمولی باتوں کیلئے استعفا دے دینا مضحکہ خیز ہے۔

اندو کو اپنے شوہر کے چیرمینی پر بہت ناز تھا۔ اس عہدہ کو وہ نہایت اعلےٰ اور قابل احترام سمجھتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ یہاں راجہ صاحب کامل طور پر خود مختار ہیں۔ بورڈ اُن کے تحت میں ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں۔ کرتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض اُس کا خیال تھا

اُس کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ اُسے آج معلوم ہوا کہ چیرمین صرف حُکام کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ اُن کی مرضی سے جو چاہے کرے۔ اُن کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ بمنزلۂ صفر ہے جس کی قیمت دوسرے عدد کے ساتھ ملنے ہی پر ہے۔ راجہ صاحب کی اس عہدہ پرستی سے اس کے دل پر کڑی چوٹ لگی۔ بولی "مضحکہ اتنا شرمناک نہیں ہے جتنا بے انصافی برتنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس عہدہ کی مشکلات کو جانتے ہوئے بھی اُسے کیوں قبول کیا؟ اگر آپ انصاف کے خیال سے سورداس کی زمین چھین لیتے۔ تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن صرف حُکام کے خوف سے یا بدنامی سے بچنے کے لئے جادۂ انصاف سے منحرف ہونا نہایت اوچھی حرکت ہے۔ آپ کو اہل شہر اور خصوصاً غربا کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اگر حُکام کسی پر زیادتی کریں تو آپ کو مناسب ہے کہ مظلوموں کی مدد کریں۔ اپنے ذاتی نفع یا نقصان کا خیال نہ کر کے حُکام کی مخالفت کریں۔ سارے شہر میں بلکہ سارے ملک میں تہلکہ مچا دیں۔ خواہ اُس کے لئے استعفےٰ ہی نہیں۔ کسی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ میں سیاسی اصولوں سے واقف نہیں ہوں لیکن آپ کا جو انسانی فرض ہے اُسے بتلا رہی ہوں۔ میں آپ کو آگاہ کئے دیتی ہوں کہ اگر آپ نے حُکام کے دباؤ سے سورداس کی زمین لی تو میں چپ چاپ نہ بیٹھی رہونگی۔ عورت ہوں تو کیا۔ پر دکھا دوں گی کہ زیادہ سے زیادہ طاقتور انسان بھی کسی غریب کو آسانی سے پیروں تلے نہیں روند سکتا۔"

یہ کہتے کہتے اندو رُک گئی۔ اُسے خیال آگیا کہ میں جوش میں

کی حدِ مناسب سے تجاوز کر رہی ہوں۔ راجہ صاحب اس قدر نادم ہوئے کچھ کہنے کے لئے الفاظ نہ ملتے تھے۔ بالآخر ندامت سے بولے "تمہیں معلوم نہیں کہ قومی خدمت گزاروں کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو بے خوفی سے ادا کرنے لگیں۔ تو جتنی خدمت وہ اب کر سکتے ہیں اُتنی بھی نہ کر سکیں۔ مسٹر کلارک اور مسٹر سیوک میں گہرا تعلق ہو جانے کے سبب حالات بالکل تبدیل ہو گئے ہیں۔ مس سیوک جس وقت سے تمہارے مکان سے گئی ہیں۔ مسٹر کلارک ہمیشہ اُنہیں کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اجلاس پر نہیں جاتے۔ کوئی سرکاری کام نہیں کرتے۔ کسی سے ملتے تک نہیں۔ مس سیوک نے اُن پر جادو سا ڈال دیا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ سیر کرنے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مس سیوک نے شادی کا وعدہ کر لیا ہے"۔

اندو۔ اس قدر جلد۔ ابھی اُسے ہمارے یہاں سے گئے ایک ہفتہ سے زیادہ نہ ہوا ہوگا۔

راجہ صاحب۔ مسز سیوک نے سب کچھ پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا مس سیوک کے وہاں جاتے ہی عشق کی کارپردازیاں شروع ہو گئیں۔

اندو نے اب تک صوفیہ کو ایک معمولی عیسائی لڑکی سمجھ رکھا تھا۔ اگرچہ وہ اُن سے بہن کا سا برتاؤ کرتی تھی۔ اُس کی قابلیت کی قدر کرتی اُس سے محبت کرتی تھی۔ لیکن دل میں اُسے اپنے سے کمتر سمجھتی تھی۔ مگر مسٹر کلارک سے اُس کی شادی والی بات نے اُس کے دلی جذبات کو متحرک کر دیا۔ وہ سوچنے لگی۔ مسٹر کلارک سے عقد ہو جانے کے بعد جب

صوفیہ مسز کلارک بن کر مجھے ملے گی تو اپنے دل میں مجھے ہیچ سمجھے گی۔ اُس کے ارتباط۔ اخلاق اور الفاظ میں مصنوعی رواداری کی جھلک ہوگی۔ وہ میرے سامنے جتنا ہی جھکے گی اتنا ہی میرا سر نیچا کرے گی۔ یہ ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میں اُس سے نیچی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اس کمبخت کلارک کو کیا کوئی یوروپین لیڈی نہ ملتی تھی کہ صوفیہ پر گر پڑا کسی اونچے خاندان کا ہوگا۔ کوئی انگریز اُس سے اپنی لڑکی کا عقد کرنے پر راضی نہ ہوتا ہوگا۔ دلّے اسی چھچھوری عورت پر جان دیتا ہے۔ ایشور ہی جانے اب اُس غریب کی کیا حالت ہوگی۔ تعجب ہے اور کیا۔ نسل اور خاندان کا اثر کہاں جائے گا؟ خوب صورت ہے؟ تعلیم یافتہ ہے ہوشیار رہے عقلمند ہے۔ سب کچھ سہی مگر ہے تو عیسائن۔ باپ نے لوگوں کو ٹھگ ٹھگا کر کچھ روپیہ اور نام کما لیا ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں تو اب بھی اُس سے وہی پہلے کا سا برتاؤ کروں گی۔ جب تک وہ خود آگے نہ بڑھے گی، ہاتھ نہ بڑھاؤں گی۔ لیکن میں خواہ کچھ بھی کروں اُس پر اپنی فوقیت کا خواہ کتنا ہی اظہار کردوں۔ اُس کے دل میں اِس بات کا گھمنڈ تو ضرور ہی ہوگا کہ میری ایک کڑی نگاہ اُس کے شوہر کے عزّ و اقتدار کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اب اور بھی زیادہ انکسار سے پیش آئے۔ اپنی طاقت کا احساس ہم کو مہذب بنا دیتا ہے۔ اُس سے میرا غرور کرنا اور کھنچنا دل لگی معلوم ہوگی۔ اُس کی عاجزی سے تو اُس کا اوچھاپن ہی اچھا۔ ایشور کرے کہ وہ مجھ سے سیدھے مُنہ بات نہ کرے۔ اُس وقت دیکھنے والے اُس کو اپنے دل میں ملامت کریں گے۔ اسی میں اب میری لاج رہ سکتی ہے مگر وہ اتنی کوتاہ اندیش کب ہے؟

بالآخر اندو نے طے کر لیا کہ میں صوفیہ سے ملوں گی ہی نہیں میں اپنے رانی ہونے کا گھمنڈ تو اس سے کر ہی نہیں سکتی۔ ہاں ایک خادم قوم کی بیوی بن کر اپنی خاندانی شرافت کا غرور دکھا کر اس سے بے اعتنائی کا برتاؤ کر سکتی ہوں ۔

یہ سب خیالات ایک لمحہ میں اندو کے دل میں آ گئے۔ بولی "میں آپ کو کبھی دینے کی صلاح نہ دوں گی "۔

راجہ صاحب۔ اور اگر دینا پڑے ۔

اندو۔ تو اپنے کو ابھاگنی سمجھونگی ۔

راجہ صاحب۔ یہاں تک تو کوئی ہرج نہیں مگر کوئی تحریک تو نہ شروع کرو گی؟ اس لئے پوچھتا ہوں کہ تم نے ابھی مجھے دھمکی دی ہے۔

اندو۔ میں خاموش نہ بیٹھوں گی۔ آپ دیں۔ میں کیوں دلوں؟

راجہ صاحب۔ خواہ میری کتنی ہی بدنامی ہو جائے؟

اندو۔ میں اسے بدنامی نہیں سمجھتی ۔

راجہ صاحب۔ پھر سوچ لو۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ زمین مسٹر سیوک کو ضرور ملے گی۔ میں روکنا بھی چاہوں تو نہیں روک سکتا۔ اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ تمہیں اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا پڑیگا۔

راجہ صاحب اپنی پبلک لائف (عوام سے تعلق رکھنے والی زندگی) میں تحمل اور حسنِ اخلاق کے لئے مشہور تھے لیکن خانگی زندگی میں وہ اتنے رحم دل نہ تھے۔ اندو کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہ تیز لہجہ میں بولی "اگر آپ کو اپنا اعزاز پیارا ہے تو مجھے بھی اپنا دھرم پیارا ہے"

راجہ صاحب غصہ کے مارے وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اندو

تنہا رہ گئی۔

ایک ہفتہ تک دونوں کی زبانوں پر مہر سکوت لگی رہی۔ راجہ صاحب کبھی گھر میں آجاتے تو دو چار باتیں کرکے یوں بھاگتے جیسے پانی میں بھیگ رہے ہوں۔ نہ وہ بیٹھتے اور نہ اندو اُنہیں بیٹھنے کو کہتی۔ انہیں یہ رنج تھا کہ اس کو میری ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ قدم قدم پر میرا راستہ روکتی ہے۔ میں استعفے دے دوں جبھی اس کو تسکین ہوگی۔ اس کی یہی تمنا ہے کہ ہمیشہ کے لئے دُنیا سے مُنہ موڑ لوں۔ سنسار سے قطع تعلق کر دوں اور گھر میں بیٹھا ہوا رام نام جپوں۔ حکّام سے ملنا چھوڑ دوں۔ اُن کی نظروں سے گر جاؤں اور ذلت برداشت کروں۔ میری زندگی کی ساری تمنائیں اور میرے سارے منصوبے اس کی نگاہوں میں ہیچ ہیں۔ وہ دل میں میری نمود طلبی کی خواہش پر ہنستی ہے۔ شاید مجھے کم ظرف خود غرض اور خود پسند سمجھتی ہے۔ اتنے دنوں تک میرے ساتھ رہ کر بھی اس کو مجھ سے کچھ محبت نہیں۔ کوئی میل نہیں۔ نہ وہ جو اپنے خاوند کی بہی خواہ ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ اُس کے کاموں کا مضحکہ اُڑائے اس کی بدگوئی کرے اس نے صاف کہہ دیا ہے۔ کہ میں خاموش نہ بیٹھوں گی۔ نہ جانے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر اخباروں میں ایک چھوٹا سا خط بھی چھپوا دے گی تو میرا کام تمام ہو جائے گا۔ کہیں کا نہ رہوں گا۔ ڈوب مرنے کا موقع ہوگا۔ دیکھوں یہ ناؤ کیسے پار لگتی ہے۔

اِدھر اندو کو افسوس تھا کہ لیشور نے انہیں سب کچھ دیا ہے۔ یہ حُکّام سے کیوں اتنا دبتے ہیں۔ کیوں اتنی خوشامد کرتے ہیں۔ اپنے اصولوں پر قائم کیوں نہیں رہتے۔ اُنہیں کیوں خود غرضی کے تحت میں

رکھتے ہیں۔ قومی خدمت کا سوانگ کیوں بھرتے ہیں؟ وہ بھی کوئی انسان ہے جس نے نام و نمود کے لئے ایمان اور انصاف کا خون کر دیا ہو؟ ایک وہ بہادر لوگ تھے جو بادشاہوں کے سامنے سر نہ جھکاتے تھے۔ اپنی بات اپنی آن پر مر مٹتے تھے۔ آخر لوگ انہیں کیا کہتے ہوں گے؟ دنیا کو دھوکا دینا سہل ہے۔ انہیں چاہے یہ وہم ہو کہ لوگ مجھے قوم کا سچا خادم سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعی بات تو یہ ہے کہ انہیں سبھی لوگ خوب پہچانتے ہیں۔ دل میں سبھی کہتے ہوں گے کتنا بنا ہوا آدمی ہے!

رفتہ رفتہ اُس کے خیالات میں تغیر ہُوا۔ یہ اُن کا قصور نہیں میرا قصور ہے۔ میں کیوں اُن کو اپنے معیار کے مطابق بنانا چاہتی ہوں؟ آج کل زیادہ تر آدمی اسی قماش کے ہیں۔ اُنہیں دنیا چاہے کچھ کہے، کچھ سمجھے۔ مگر اُن کے گھروں میں تو کوئی مین میکھ نہیں نکالتا۔ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کی رفیق بنے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی مرد سے الگ کوئی ذاتی ہستی نہیں ہے؟ اسے تو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ دونو اپنے اپنے اعمال کے موافق سزا و جزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ در اصل یہ ہماری قسمت کا قصور ہے ورنہ ہمارے خیالات میں اتنا فرق کیوں ہوتا؟ کتنا چاہتی ہوں کہ آپس میں کوئی نااتفاقی نہ ہو کتنا پہلو بچاتی ہوں پر آئے دن کوئی نہ کوئی بدمزگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ابھی ایک زخم نہیں بھرنے پایا تھا کہ دوسرا چرکا لگا۔ کیا میری ساری زندگی یوں ہی گذرے گی؟ ہم زندگی میں سکون چاہتے ہیں۔ محبت اور دوستی کے لئے جان دیتے ہیں جس کے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتی ہو اُسے سکون کہاں؟ اندھیر تو یہ ہے کہ مجھے چپ بھی نہیں رہنے دیا جاتا۔ کتنا کہتی تھی کہ مجھے اِس بحث میں

نہ ڈوا لتے۔ ان کانٹوں میں نہ گھسیٹتے مگر اُنہوں نے نہ مانا۔ اب جو میرے پیروں میں کانٹے چُبھ گئے۔ میں درد سے کراہتی ہوں تو کانوں پر اُنگلی رکھتے ہیں مجھے رونے کی بھی آزادی نہیں۔ "جبرا مارے اور رونے نہ دے"۔ والی مثل ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا۔ بات بھی نہ پوچھی کہ مرتی ہے یا جیتی؟ بالکل اُسی طرح پڑی ہوں جیسے کسی سرائے میں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مر جاتی۔ سکھ گیا۔ آرام گیا۔ پلّے کیا پڑا؟ رونا اور جھیکنا! جب یہی حال ہے تو کب تک نبھے گی؟ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ دونوں کے دل ایک دوسرے سے پھر جائیں گے۔ کوئی کسی کی صورت بھی نہ دیکھنا چاہے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ اندو کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ ذرا اماں کے پاس چلوں کہ یکایک راجہ صاحب آکر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ سے وحشت برس رہی تھی جیسے گھر میں آگ لگی ہوئی ہو۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے: "اندو مسٹر کلارک ملنے آئے ہیں۔ ضرور اسی زمین کے متعلق کچھ گفتگو کریں گے۔ اب مجھے کیا صلاح دیتی ہو؟ میں ایک کاغذ لانے کا بہانہ کر کے چلا آیا ہوں"۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے دُکھ بھری نگاہوں سے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا ساری دُنیا کی مصیبت اُنہیں کے سر آپڑی ہو۔ گویا کوئی دہقانی پولیس کے پنجہ میں پھنس گیا ہو۔ ذرا دم لے کر پھر بولے: "اگر میں نے ان کی مخالفت کی تو مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ان انگریز حکّام کو کتنے اختیارات ہوتے ہیں۔ یوں چاہوں تو اِسے نوکر رکھ لوں مگر اس کی ایک شکایت پر میری ساری آبرو پر پانی پھر جائے گا۔ حکّام بالادست اُس

کے خلاف میری ایک بھی نہ سُنیں گے۔ رئیسوں کو اتنی آزادی بھی نہیں جو ایک معمولی کسان کو ہے۔ ہم سب اِن کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں جب چاہیں زمین پر پٹک کر چکنا چور کردیں۔ میں اس کی بات ٹال نہیں سکتا مجھ پر رحم کرو۔"

اندو نے ترحمانہ انداز سے دیکھ کر کہا "مجھے آپ کیا کرنے کو کہتے ہیں؟"

راجہ صاحب۔ یہی کہ یا تو خاموش ہو کر اس بے انصافی اور ستم کوشی کا تماشا دیکھو یا مجھے اپنے ہاتھوں سے تھوڑا سا سنکھیا کھلا دو۔

راجہ صاحب کی اِس بزدلی اور مجبوری اُن کے خوف زدہ چہرہ اور قابل رحم عاجزی والتجا پر اندو کو رحم آ گیا۔ اِس رحم میں ہمدردی یا خاطرداری نہ تھی۔ یہ وہ رحم تھا جو بھکاری کو دیکھ کر کسی فیاض طبع انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ سوچنے لگی:۔ہائے اِس خوف کا بھی کوئی ٹھکانا ہے۔ بچے ہوّا سے بھی اتنا نہ ڈرتے ہوں گے۔ مان لیا۔ کلارک ناراض ہی ہو گیا تو کیا کرے گا؟ عہدہ سے برطرف نہیں کرسکتا۔ یہ اُس کے اختیار سے باہر ہے۔ ریاست ضبط نہیں کرسکتا۔ واویلا مچ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکتا ہے کہ افسروں کو شکایت لکھ بھیجے۔ لیکن اس وقت اِن سے بحث کرنا بیفائدہ ہے۔ ان کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں۔ بولی "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کلارک کی ناراضگی آپ کے لئے ناقابل برداشت ہے تو جس بات پر وہ راضی ہو وہی کیجئے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے کام میں ذرا بھی خلل نہ ڈالوں گی۔ جائیے صاحب کو دیر ہو رہی ہوگی۔ کہیں اسی بات پر ناراض نہ ہو جائیں۔"

راجہ صاحب اس طنز سے دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

ذرا سا مُنہ نکل آیا چپکے سے اُٹھے اور چلے گئے۔ اُسی طرح جیسے کوئی غرض سے باؤلا اسامی مہاجن کے انکار سے مایوس ہو کر اُٹھے۔ اندو کی تشفی سے انہیں اطمینان نہ ہوا۔ سوچنے لگے کہ میں اُس کی نظروں سے گر گیا۔ میں بدنامی سے اس قدر ڈرتا تھا مگر اب گھر ہی میں مُنہ دکھلانے کے قابل نہ رہا۔

راجہ صاحب کے جاتے ہی اندو نے ایک لمبی سانس لی۔ اور فرش پر لیٹ گئی۔ اُس کے مُنہ سے یکایک یہ الفاظ نکلے "اِن کی دل سے کیسے عزت کروں؟ انہیں اپنا دیوتا کیسے سمجھوں؟ معلوم نہیں۔ اس ناعقیدتمندی کی مجھے کیا سزا ملے گی۔ میں اپنے شوہر کی پرستش کرنا چاہتی تھی۔ مگر دل پر میرا قابو نہیں۔ بھگوان! تم مجھے اس کڑی آزمائش میں کیوں ڈال رہے ہو؟"

(۱۶)

آراولی کی پہاڑیوں میں ایک برگد کے درخت کے نیچے ونے سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ برسات نے اُس سنسان۔ سخت۔ خشک اور پتھریلے مقام کو بیں کشش فرحت اور رونق پیدا کر دی ہے گویا کوئی اُجڑا ہوا گھر آباد ہو گیا۔ لیکن ونے کی نگاہ اِس قدرتی حُسن کی طرف نہیں ہے وہ تفکر کی اُس حالت میں ہے جب آنکھیں کُھلی رہتی ہیں اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ کان کھلے رہتے ہیں اور کچھ نہیں سُنائی پڑتا۔ ظاہری حواس معطل ہو گئے ہیں۔ اُن کا چہرہ اُترا ہوا ہے جسم اتنا لاغر ہے کہ پسلیوں کی ایک ایک ہڈی گنی جا سکتی ہے۔

ہماری خواہشات ہی زندگی کی منبع ہیں۔ اُنہیں پر پالا پڑ جائے

تو زندگی کی رفتار کیوں سست پڑ جائے؟ اُن کے دل میں ہر وقت ایک کشمکش قائم رہتی ہے۔ قومی خدمت اُن کا مقصد تھا۔ محبت کے کانٹے اُس میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس مقصد کے آڑے آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ دردِ دل سے بیقرار ہو کر سوچتے ہیں۔ صوفی نے مجھے اُس آتش کدہ سے نکالا کیوں؟ بیرونی آگ صرف جسم کو فنا کرتی ہے جو خود ہی فانی ہے۔ مگر اندرونی آگ روح کو خاکِ سیاہ کر دیتی ہے

ونے کو یہاں آئے کئی مہینے ہو گئے مگر اُن کے دل کی بےچینی وقت کے ساتھ ہی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ غیرت کے سبب آنے کو تو یہاں آ گئے تھے مگر ایک ایک لمحہ ایک ایک مدت کی طرح گزر رہا تھا۔ پہلے اُنہوں نے یہاں کی تکالیف کی طولانی داستانیں لکھ لکھ کر اپنی ماں کے پاس بھیجیں۔ اُنہیں یقین تھا کہ اماں جی مجھے بلا لیں گی۔ مگر وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اتنے ہی میں صوفیہ کا خط مل گیا جس نے اُن کے صبر کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ایک دم ٹھنڈا کر دیا۔ اب اُن کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ اس اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹولتے پھرتے تھے مگر راستہ نہ ملتا تھا۔ اب اُن کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ کوئی مقررہ راستہ نہیں ہے۔ وہ بے ملاح کی ناؤ تھے جسے صرف امواج کے رحم کا بھروسہ ہو۔

لیکن اس تفکر اور تشویش کی حالت میں بھی وہ حتے الامکان اپنے فرض کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ جسونت نگر کے علاقہ میں ایک بچہ بھی نہیں ہے جو اُنہیں نہ پہچانتا ہو۔ دیہات کے لوگ اُن کے اتنے معتقد ہو گئے ہیں کہ جوں ہی وہ کسی گاؤں میں جا پہنچتے ہیں سارا گاؤں اُنکی زیار

کے لئے جمع ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے اُن کو اپنی مدد آپ کرنا سکھایا ہے
اس علاقہ کے لوگ اب جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لئے پولیس کے
پاس نہیں دوڑے جاتے بلکہ خود جمع ہو کر اُنہیں بھگاتے ہیں۔ ذرا
ذرا سی بات پر عدالتوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹائے جاتے ۔
پنچائتوں میں تصفیہ کر لیتے ہیں۔ جہاں کبھی کنوئیں نہ تھے وہاں اب پختہ
کنوئیں تیار ہو گئے ہیں۔ صفائی کی طرف بھی لوگ دھیان دینے لگے ہیں
دروازوں پر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر نہیں جمع کئے جاتے۔ خلاصہ یہ کہ ہر
شخص صرف اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی ہے۔ وہ اب اپنے
کو مخالفین سے گھرا ہوا نہیں بلکہ معاونین سے گھرا ہوا سمجھتا ہے ۔
اجتماعی زندگی کا پھر احساس پیدا ہو گیا ہے ؞
ونے سنگھ کو طبابت میں بھی کافی دخل ہے۔ اُن کے ہاتھوں
سینکڑوں مریض صحت یاب ہو چکے ہیں۔ کتنے ہی گھر جو باہمی نزاع سے
بگڑ گئے تھے پھر آباد ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اُن کی جتنی خاطر و
مدارات کرنے کے لئے لوگ تیار رہتے ہیں اُس کا قیاس کر لینا مشکل
نہیں۔ دوسروں کی خدمت کرنے والوں کے نصیبوں میں آرام کہاں
ونے کو خشک روٹیوں اور درخت کے سایہ کے علاوہ اور کسی چیز سے
سروکار نہیں ہے۔ اس فقر و استغنا نے اُنہیں اس نواح میں نہایت
ممتاز اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے ؞
لیکن جوں جوں اُن سے رعایا کی عقیدت ہوتی جاتی ہے اُسی
نسبت سے ریاست کے حکام اُن سے بدگمان ہوتے جا رہے ہیں۔ اِن
کے خیال میں رعایا روز بروز سرکش ہوتی جاتی ہے۔ داروغہ جی کی مٹھیاں

اب گرم نہیں ہوتیں۔ کامدار اور دیگر حاکموں کے یہاں مقدمے نہیں جاتے۔ کچھ بتّھے نہیں چڑھتا۔ رعایا میں یہ آثار بغاوت نہیں تو اور کیا ہیں؟ یہی بغاوت کے ننھے پودے ہیں۔ انہیں اُکھاڑ دینے ہی میں بہتری ہے۔

جسونت نگر سے روزانہ دربار کو نئی نئی اطلاعیں کچھ اصلی کچھ فرضی۔ بھیجی جاتی تھیں اور ونے سنگھ کو ضابطہ کے شکنجہ میں جکڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ دربار نے اِن اطلاعوں سے بدظن ہو کر کئی جاسوسوں کو ونے سنگھ کی حرکات وسکنات کی دیکھ بھال کے لئے تعینات کر دیا ہے مگر اُن کی بے لوث خدمات کسی کو گرفت کا موقع نہیں دیتیں۔

ونے کے پیروں میں بوائیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ برگد کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ فوراً اُٹھ بیٹھے۔ لکڑی سنبھالی اور آگے بڑھے آج اُنہوں نے جسونت نگر میں مقام کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ دن بھاگا چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کے بعد سورج کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ شام ہوتی جاتی تھی اور ابھی جسونت نگر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اِدھر بوائیوں کے سبب ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ حیران تھے کہ کیا کروں۔ کسی کسان کا جھونپڑا ابھی نظر نہ آتا تھا کہ وہیں رات کاٹیں۔ پہاڑوں میں سرِشام ہی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ دفعتاً اُنہیں دور سے ایک آدمی آتا ہوا نظر پڑا۔ اُسے دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوئے کہ اپنی راہ چھوڑ کر کئی قدم اُس کی طرف چلے۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکیہ ہے۔ وہ ونے سنگھ کو پہچانتا

تھا۔ سلام کر کے بولا۔ "اس چال سے تو آدھی رات تک بھی جسونت نگر نہ پہنچیں گے"۔

وِنے۔ پیروں میں بوائیاں پھٹ گئی ہیں۔ چلنا مشکل ہے۔ تم خوب ملے۔ میں بہت گھبرا رہا تھا کہ تنہا کیسے جاؤں گا۔ اب ایک سے دو ہو گئے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا بھی کوئی خط ہے؟

ڈاکیہ نے ونے سنگھ کے ہاتھ میں ایک خط رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کا خط تھا۔ اگرچہ اندھیرا ہو رہا تھا۔ مگر ونے سنگھ نے فرطِ اشتیاق سے فوراً لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگے۔ ایک لمحہ میں انہوں نے اس کو پڑھ ڈالا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر لفافہ میں رکھ دیا۔ ان کے سر میں ایسا چکر آیا کہ گرتے گرتے بچے۔ زمین پر بیٹھ گئے۔ ڈاکیہ نے گھبرا کر پوچھا "کیا کوئی بری خبر ہے؟ آپ کا منہ پیلا پڑ گیا ہے"۔

وِنے۔ نہیں۔ کوئی ایسی خبر نہیں۔ پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ شاید میں آگے نہ جا سکوں گا۔

ڈاکیہ۔ یہاں اس بیہڑ میں اکیلے کیسے پڑے رہئے گا؟

وِنے سنگھ۔ ڈر کیا ہے؟

ڈاکیہ۔ اِدھر جانور بہت ہیں۔ ابھی کل ایک گائے اُٹھا لے گئے۔

ونے سنگھ۔ مجھے جانور بھی نہ پوچھیں گے۔ تم جاؤ۔ مجھے یہیں چھوڑ دو۔

ڈاکیہ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی یہیں پڑا رہوں گا۔

ونے سنگھ۔ تم میرے لئے کیوں اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہو؟ چلے جاؤ۔ گھڑی رات گئے تک پہنچ جاؤ گے۔

ڈاکیہ۔ میں تو جبھی جاؤں گا جب آپ بھی چلیں گے۔ میری جان کی کون حقیقت ہے؟ اپنا پیٹ پالنے کے سوا اور کیا کرتا ہوں۔ آپ کے دم سے تو ہزاروں کا بھلا ہوتا ہے۔ جب آپ کو اپنی فکر نہیں ہے تو مجھے اپنی کیا فکر ہے؟

وِنے سنگھ۔ بھائی میں تو مجبور ہوں۔ چلا ہی نہیں جاتا۔

ڈاکیہ۔ میں آپ کو کندھے پر بٹھا کر لے چلوں گا۔ پر یہاں نہ چھوڑونگا

وِنے سنگھ۔ بھائی! تم بہت دق کر رہے ہو۔ چلو۔ مگر میں آہستہ آہستہ چلوں گا۔ تم نہ ہوتے تو آج میں یہیں پڑ رہتا۔

ڈاکیہ۔ آپ نہ ہوتے تو میری جان کی خیریت نہ تھی۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں صرف آپ کی خاطر اتنی ضد کر رہا ہوں۔ میں اتنا دھرماتما نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کے لئے آپ کو ساتھ لئے چلتا ہوں (آہستہ سے) اس وقت میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں۔ دوپہر کو ایک جگہ سو گیا۔ بس دیر ہو گئی۔ آپ میرے بھاگ سے مل گئے نہیں تو ڈاکوؤں سے جان نہ بچتی

وِنے سنگھ۔ یہ تو بڑے جوکھم کی بات ہے تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟

ڈاکیہ۔ میرے ہتھیار آپ ہیں۔ آپ کے ساتھ مجھے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ آپ کو دیکھ کر کسی ڈاکو کی مجال نہیں کہ مجھ پر ہاتھ اُٹھا سکے۔ آپ نے ڈکیتوں کو بھی بس میں کر لیا ہے۔

دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کان میں آئی۔ ڈاکیہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ پانچ سوار بھالے اُٹھائے گھوڑے بڑھائے چلے آتے تھے اس کے ہوش اُڑ گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ بولا "لیجئے۔ سب آ ہی

پہنچے۔ ان سب کے مارے ادھر راستہ چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ بڑے خونی ہیں۔ سرکاری ملازموں کو تو چھوڑنا ہی نہیں جانتے۔ اب آپ ہی بچائیں تو میری جان بچ سکتی ہے"۔

اتنے میں پانچوں سوار سر پر آ پہنچے۔ اُن میں سے ایک نے پکارا "اُبے ڈاکیئے! اِدھر آ۔ تیرے تھیلے میں کیا ہے"؟

ونے سنگھ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لکڑی کے سہارے اُٹھے کہ اتنے میں ایک سوار نے ڈاکیہ پر بھالے کا وار کیا۔ ڈاکیہ فوج میں رہ چکا تھا۔ اُس نے وار کو تھیلے پر روکا۔ بھالا تھیلے کے پار ہو گیا۔ دوسرا وار کرنے ہی والا تھا۔ کہ ونے سنگھ سامنے آ کر بولے "بھائیو! یہ کیا اندھیر کرتے ہو؟ کیا تھوڑے سے روپیوں کے لئے ایک غریب کی جان لے لوگے"؟

سوار۔ جان اتنی پیاری ہے تو روپے کیوں نہیں دیتا؟

ونے سنگھ۔ جان بھی پیاری ہے۔ اور روپے بھی پیارے ہیں۔ دو میں سے ایک بھی نہیں دے سکتا۔

سوار۔ تو دونوں ہی دینے پڑیں گے۔

ونے سنگھ۔ تو پہلے میرا کام تمام کر دو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہارا مقصد نہ پورا ہوگا۔

سوار۔ ہم سادھوؤں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔

ونے سنگھ۔ جب تک میری ہڈیاں تمہارے گھوڑوں کے پیروں تلے نہ روندی جائیں گی۔ میں سامنے سے نہ ہٹوں گا۔

سوار۔ ہم کہتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔ کیوں ہمارے سر ہتیا (خون)

ناحق) کا پاپ لگاتے ہو؟

ونے سنگھ۔ میرا جو دھرم ہے وہ میں کرتا ہوں۔ تمہارا جو دھرم ہو وہ تم کرو۔ گردن جھکائے ہوئے ہیں ٭

دوسرا سوار۔ تم کون ہو؟

تیسرا سوار۔ بیدھا ہوا ہے۔ مارو ایک ہاتھ گر پڑے۔ پرائسچت (کفارہ) کر لیں گے ٭

پہلا سوار۔ آخر تم ہو کون؟

ونے سنگھ۔ میں کوئی ہوں۔ تمہیں اس سے مطلب؟

دوسرا سوار۔ تم تو ادھر کے رہنے والے نہیں جان پڑتے۔ کیوں بے ڈاکئے! یہ کون ہے؟

ڈاکیہ۔ یہ تو نہیں جانتا پر ان کا نام ونے سنگھ ہے دھرماتما اور پر اُپکاری آدمی ہیں۔ اس علاقہ میں کئی مہینوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں ٭

ونے سنگھ کا نام سنتے ہی پانچوں سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے۔ اور ونے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ سردار نے کہا مہاراج ہمارا اپرادھ چھما کیجئے۔ ہم نے آپ کا نام سنا ہے۔ آج آپ کا درشن پاکر ہمارا جینا سپھل ہو گیا۔ اس علاقہ میں آپ کا جس گھر گھر گایا جا رہا ہے۔ میرا لڑکا گھوڑے سے گر پڑا تھا۔ پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ جینے کی کوئی امید نہ تھی۔ آپ ہی کے ساتھ کے ایک مہاراج ہیں۔ اندورت اُنہوں نے آکر لڑکے کو دیکھا تو فوراً مرہم پٹی کی اور ایک مہینہ تک روز آکر اس کی دوا دارو کرتے رہے۔ لڑکا چنگا ہو گیا۔ میں تو جان بھی دے دوں تو آپ سے اُرِن نہیں ہو سکتا۔ اب ہم پاپیوں کا اُدھا

کیجئے۔ ہمیں آ گیا دیجئے کہ آپ کے چرنوں کی دھول ماتھے پر لگائیں۔ ہم تو اس لایق بھی نہیں ہیں "۔

ونے نے مسکرا کر کہا "اب تو ڈاکوئے کی جان نہ لوگے ؟ ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے "۔

سردار۔ مہاراج ! ہمیں شرمندہ نہ کیجئے۔ ہمارا قصور معاف کیجئے۔ ڈاکیہ جی تم آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اُٹھے ہو نہیں تو اب تک تمہاری جان نکل گئی ہوتی۔ میرا نام سنا ہے نہ ؟ بیرپال سنگھ میں ہی ہوں جس نے راج کے نوکروں کو نیست و نابود کر دینے کی قسم کھائی ہے "۔

ونے سنگھ۔ راج کے نوکروں پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو ؟

بیرپال۔ مہاراج ! آپ تو کئی مہینوں سے اس علاقہ میں ہیں۔ کیا آپ کو اِن لوگوں کی کرتوتیں معلوم نہیں ہیں ؟ یہ لوگ رعایا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ اِن میں نہ دَیا ہے نہ دھرم۔ ہیں ہمارے ہی بھائی بند۔ پر ہماری ہی گردن پر چھُری چلاتے ہیں۔ کسی نے ذرا صاف کپڑے پہنے اور یہ لوگ اُس کے سَر ہوئے۔ جسے رشوت نہ دیجئے وہی آپ کا دشمن ہے۔ چوری کیجئے۔ ڈاکے ڈالئے۔ گھروں میں آگ لگائیے۔ غریبوں کا گلا کاٹئے۔ کوئی آپ سے نہ بولے گا۔ بس سرکاری نوکروں کی مٹھیاں گرم کرتے رہئے۔ دن دہاڑے خون کیجئے پر پولیس کی پوجا کر دیجئے۔ آپ بیداغ چھوٹ جائیں گے اور آپ کے بدلے کوئی بے قصور پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ کوئی فریاد نہیں سُنتا۔ کون سُنے ؟ سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہی سمجھ لیجئے کہ خونخوار جانوروں کا ایک غول ہے۔ سب کے سب مل کر شکار کرتے ہیں اور پھر مل جل کر

کھاتے ہیں۔ راجہ ہے وہ کاٹھ کا اُلّو۔ اُسے ولایت میں جاکر علماء کے سامنے لمبی چوڑی تقریریں کرنے کا خبط ہے۔ میں نے سنا ہے کہا۔ یہ ہی نے وہ کہا۔ بس کوری ڈینگیں مارنا اس کا کام ہے۔ یا تو ولایت کی سیر کرے گا۔ یا وہاں انگریزوں کے ساتھ شکار کھیلے گا۔ سارے دن اُنھیں کی جوتیاں سیدھی کرے گا۔ اس کے سوا اُسے کوئی کام نہیں۔ رعایا مرے یا جیئے۔ اُس کی بلا سے۔ بس خیریت اسی میں ہے کہ عملے جس کل بٹھائیں اسی کل بیٹھیئے۔ شکایت نہ کیجیے۔ زبان نہ ہلائیے۔ روئیے تو مُنہ بند کرکے۔ ہم نے مجبور ہو کر اس خونیں راستہ پر قدم رکھا ہے۔ کسی طرح تو ان بدمعاشوں کی آنکھیں کھلیں۔ انہیں معلوم ہو کہ ہمیں بھی سزا دینے والا کوئی ہے یہ حیوان سے انسان بن جائیں ؎

ونے سنگھ۔ مجھے یہاں کے حالات سے کچھ تو واقفیت تھی مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ اتنی بُری حالت ہے۔ میں اب خود راجہ صاحب سے ملوں گا۔ اور یہ ساری باتیں اُن سے کہوں گا ؎

بیر پال۔ مہاراج کہیں ایسی غلطی بھی نہ کیجیے گا نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ راجہ میں اتنا ہی گیان ہوتا تو راج کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ وہ اُلٹا آپ ہی کے سر ہو جائے گا ؎

ونے سنگھ۔ اس کی فکر نہیں۔ اطمینان تو ہو جائے گا کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ مجھے تم سے بھی کچھ کہنا ہے۔ تمہارا یہ خیال کہ اس قتل و غارت گری سے حکام میں رعایا پروری آجائے گی۔ میری رائے میں محض بے بنیاد اور صرف وہم ہے۔ مرض کو دور کرنے کے لئے مریض ہی کو ختم کر دینا نہ تو قرین مصلحت ہے اور نہ قرین انصاف۔ آگ آگ سے

ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ پانی سے ٹھنڈی ہوتی ہے ٭

بیر پال۔ مہاراج! ہم آپ سے بحث تو نہیں کر سکتے۔ مگر اتنا جانتے ہیں کہ زہر کا اثر زہر ہی سے زایل ہوتا ہے۔ جب انسان بُرائی کے انتہائی درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جب اُس میں دیا اور دھرم کا نام و نشان نہیں رہ جاتا جب اُس کی انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ حیوانیت کے کام کرنے لگتا ہے۔ جب اُس میں روحانیت کی روشنی دُھندلی پڑ جاتی ہے۔ تب اُس کے لئے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے سزائے موت۔ شیر جیسا خونخوار درندہ خدمت سے تابع ہو سکتا ہے مگر خود غرضی کو کوئی خدائی طاقت نہیں مِٹا سکتی ٭

ونے سنگھ۔ ایسی طاقت ہے تو۔ ہاں اُس کا مناسب استعمال ضروری ہے ٭

ونے سنگھ نے ابھی بات بھی نہ پوری کی تھی کہ دفعتاً کسی طرف سے بندوق کی آواز کانوں میں آئی٭ سواروں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور ایک طرف گھوڑے چھوڑ دیئے۔ دم کے دم میں گھوڑے پہاڑوں میں جا کر غائب ہو گئے٭ ونے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بندوق کی آواز کہاں سے آئی۔ اور پانچوں سوار کیوں بھاگے٭ ڈاکیئے سے پوچھا "یہ سب کدھر کو جا رہے ہیں؟"

ڈاکیہ۔ بندوق کی آواز نے کسی شکار کی خبر دی ہو گی۔ اُسی طرف گئے ہیں۔ آج کسی سرکاری نوکر کی جان پر ضرور بنے گی ٭

ونے سنگھ۔ اگر یہاں کے سرکاری ملازموں کی یہی کیفیت ہے۔ جیسا کہ انہوں نے بیان کیا تو مجھے بہت جلد مہاراج کی خدمت میں جانا پڑیگا"

ڈاکیہ۔ مہاراج۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ سچ مچ یہی حال ہے۔ ہم لوگ تو ٹکے کے ملازم ٹھہرے۔ چار پیسے اوپر سے نہ کمائیں تو بال بچوں کو کیسے پالیں؟ تنخواہ ہے سو سال بھر تک نہیں ملتی۔ لیکن یہاں تو جتنے ہی اونچے عہدہ پر ہے اس کا پیٹ بھی اُتنا ہی بڑا ہے۔

دس بجتے بجتے دونوں آدمی جسونت نگر پہنچ گئے۔ دسیئے لبتی کے باہر ہی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ڈاکیہ سے جانے کو کہا۔ ڈاکیہ نے اُن سے اپنے گھر چلنے کے لئے بہت اصرار کیا۔ جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو اپنے گھر سے اُن کے واسطے کھانا بنوا لایا۔ کھانے کے بعد دونوں آدمی اُسی جگہ لیٹے۔ ڈاکیہ اُنہیں تنہا چھوڑ کر گھر نہ گیا۔ وہ تو تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا پر وِنے کو نیند کہاں؟ رانی جی کے خط کا ایک ایک لفظ اُن کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ رانی نے لکھا تھا۔ تم نے میرے ساتھ اور قوم کے ساتھ دغا کی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ تم نے میری تمناؤں کو برباد کر دیا۔ تم اتنی آ[illegible]نی سے نفس کے غلام بن جاؤ گے۔ اِس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ تمہارا وہاں رہنا بیفائدہ ہے۔ گھر لوٹ آؤ اور شادی کر کے عیش و عشرت میں زندگی بسر کرو۔ قومی خدمت کے لئے جس طرزِ عمل کا ہونا ضروری ہے۔ جس دل و دماغ کا ہونا لابدی ہے۔ وہ تم نے نہیں پایا اور نہ اُسے پا سکو گے شباب کے زمانہ میں ہم لوگ اپنی قابلیتوں کا غلط اندازہ کر لیتے ہیں۔ تم بھی اُسی مغالطہ میں پڑ گئے۔ میں تمہیں بُرا نہیں کہتی۔ تم شوق سے لوٹ آؤ۔ دنیا میں سبھی اپنی اپنی غرض میں لگے ہیں۔ تم بھی اُسی کے خیال میں محو ہو جاؤ۔ ہاں۔ اب مجھے تمہارے اوپر وہ گھمنڈ نہ ہوگا جس پر میں

پھولی ہوئی تھی۔ تمہارے والد ماجد کو ابھی یہ حال معلوم نہیں ہے۔ وہ سنیں گے تو نہ جانے اُن کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن اگر تمہیں یہ بات ابھی معلوم نہیں ہے تو میں بتلائے دیتی ہوں کہ تمہیں اپنی عشقبازیوں کے لئے کوئی دوسرا میدان تلاش کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مس صوفیہ کی منگنی مسٹر کلارک سے ہوگئی ہے اور دو چار روز میں شادی بھی ہونے والی ہے۔ یہ اس لئے لکھتی ہوں کہ تمہیں صوفیہ کے بارہ میں کسی قسم کا وہم نہ رہے اور تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ جس کے لئے تم نے اپنی زندگی کا اور اپنے والدین کی آرزوؤں کا خون کیا ہے اُس کی نگاہوں میں تمہاری کتنی وقعت ہے۔

ونے سنگھ کے دل میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ اس وقت صوفیہ سامنے آجاتی تو اُسے اِن الفاظ میں ملامت کرتا۔ یہی میرے بے حد دلی محبت کا صلہ ہے؟ تمہارے اوپر مجھے کتنا اعتماد تھا مگر اب معلوم ہوا کہ وہ تمہاری محبت کا اظہار محض ایک تماشہ تھا۔ تم میرے لئے آسمان کی دیوی تھیں میں نے تمہیں ایک آسمانی اجالا ایک روحانی نور سمجھ رکھا تھا۔ آہ میں اپنا مذہب تک تمہارے قدموں پر نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ کیا اسی لئے تم نے مجھے آگ کے مُنہ سے نکالا تھا؟ خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ ایشور نے میرے مذہب کی حفاظت کی۔ یہ رنج بھی دور ہو جائے گا۔ میں تمہیں بے فائدہ کوس رہا ہوں۔ تم نے وہی کیا جو اس حالت میں ہر ایک عورت کرتی۔ مجھے رنج اس لئے ہو رہا ہے کہ میں تم سے کچھ اور ہی اُمید رکھتا تھا۔ یہ میری خام خیالی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں تھا۔ مجھ میں وہ اوصاف کہاں ہیں جن کی تم قدر کرسکتیں؟ مگر یہ بھی جانتا ہوں۔

کہ جتنی عقیدت مجھے تم سے تھی اور اب بھی ہے۔ اُتنی شاید ہی کسی کو ہو سکتی ہو۔ مسٹر کلارک عالم بیدار مغز قابل اور اوصاف کے مخزن ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر مَیں نے تمہیں پہچاننے میں دھوکا نہیں کھایا ہے تو تم اُن کے ساتھ خوش و خرم نہ رہ سکو گی ۔

مگر اُس وقت اُنہیں اِس مایوسی سے کہیں زیادہ رنج اس خیال سے ہو رہا تھا کہ میں اپنی ماں کی نظروں سے گر گیا۔ اُنہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا صوفی نے میرا خط تو نہیں دکھا دیا؟ اگر اُس نے ایسا کیا ہے تو مجھ پر اس سے زیادہ سخت چوٹ نہ کر سکتی تھی۔ کیا عشق بیدرد ہو کر نفرت انگیز بھی ہو جاتا ہے؟ نہیں۔ صوفی پر ایسا شبہ کر کے میں اُس کے ساتھ زیادتی نہ کروں گا۔ میں سمجھ گیا۔ اندو کی سادہ مزاجی نے یہ آگ لگائی ہے اُس نے ہنسی ہنسی میں ماتاجی سے کہہ دیا ہو گا۔ نہ جانے اُسے کبھی عقل آئے گی یا نہیں؟ اُس کی تو دل لگی ہوئی اور یہاں میری جان پر بن گئی ۔

یہ سوچتے سوچتے ونے کے دل میں بدلہ کا خیال پیدا ہوا۔ مایوسی میں محبت بھی نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اُن کی زبردست خواہش ہوئی کہ صوفی کو ایک طویل خط لکھوں اور اُسے خوب طعنے دوں۔ وہ مضمون سوچنے لگے۔ تریا چرتر کی داستانیں کتابوں میں بہت پڑھی تھیں مگر کبھی یقین نہ آتا تھا۔ مجھے یہ گمان ہی نہ ہوتا کہ عورت جسے پرماتما نے پاکیزہ لطیف اور نازک جذبات کا مخزن بنایا ہے۔ اتنی بیدرد اور کج ادا ہو سکتی ہے۔ مگر یہ تمہارا قصور نہیں ہے۔ یہ تمہارے مذہب کا قصور ہے۔ جس میں وفا کا کوئی معیار نہیں۔ اگر تم نے ہندوؤں کی

ہبی کتب کا مطالعہ کیا ہے تو تم کو ایک نہیں بلکہ ایسی کئی دیویاں ملی
ں گی جنھوں نے ایک مرتبہ عہد وفا کر لینے کے بعد زندگی بھر دوسرے
د کا خیال تک نہیں کیا۔ ہاں تمہیں ایسی دیویاں بھی ملی ہوں گی
ہوں نے عہد وفا کر لینے پر تمام عمر بیوگی میں گزار دی۔ مسٹر کلارک کی
ی بن کر تم ایک ہی چھلانگ میں مفتوح سے فاتح قوم کے زمرہ میں
مل ہو جاؤ گی اور بہت ممکن ہے کہ اسی خواہش نے تمہیں میرے دل
جلیاں گرانے پر آمادہ کیا ہو۔ مگر تمہاری آنکھیں بہت جلد کھلیں
، اور تمہیں معلوم ہو گا کہ تم نے اپنا وقار بڑھایا نہیں بلکہ کھو دیا ہے؟
اس طرح ونے سنگھ نے خیالی شکوہ و شکایت کے ذریعہ اپنے دل
غبار خوب نکالا۔ اگر ان زہریلے خیالات کا ذرا بھی علم صوفیہ کو ہو جاتا
اس دکھیا کی نہ جانے کیا حالت ہوتی۔ شاید اس کی جان ہی پر بن
تی۔ مگر ونے سنگھ کو خود ہی ایسے خیالوں سے نفرت ہوتی۔ اُنھوں
سوچا۔ میرے دل میں ایسے بُرے خیالات کیوں پیدا ہو رہے
ں؟ اُس کا نازک دل ایسی سخت چوٹیں برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس
جھ سے محبت تھی۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اب بھی میری ہمدرد ہے۔
میری ہی طرح وہ بھی مذہب فرض اور رسم و رواج کی زنجیروں سے
ھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کے والدین نے اُسے مجبور کیا ہو۔
اُس نے خود کو اُن کی مرضی پر قربان کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ماتا
نے اُس کو میرے محبت کے راستہ سے ہٹانے کے لئے یہ تدبیر نکالی
۔ وہ جتنی ہی رحم دل ہیں اُتنی غصہ ور بھی۔ میں بلا سمجھے بوجھے صوفیہ
ایسے جھوٹے الزامات لگا کر اپنا اوچھا پن دکھلا رہا ہوں ✦

اسی بیقراری کی حالت میں کہ :ٹیں بدلتے بدلتے وئے کی آنکھیں جھپک گئیں۔ کوہستانی علاقوں میں راتیں بڑی سہادنی ہوتی ہیں۔ ایک ہی جھپکی میں تڑکا ہوگیا۔ معلوم نہیں وہ کب تک پڑے سویا کرتے۔ لیکن پانی کی بوندیں منہ پر پڑیں تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ جسونت نگر جانے کا ارادہ کر کے اُٹھے تھے۔ کہ کئی آدمیوں کو گھوڑے بھگاتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ سمجھے شاید بیرپال سنگھ اور اُن کے ساتھی ہوں گے مگر قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ریاستی پولیس کے آدمی ہیں۔ ڈاکیہ اُن کے پاس ہی سویا ہوا تھا پر اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پہلے ہی اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

افسر نے پوچھا۔ تمہارا ہی نام وئے سنگھ ہے؟

وئے سنگھ۔ جی ہاں۔

افسر۔ کل رات کو تمہارے ساتھ کئی آدمیوں نے یہاں قیام کیا تھا۔

وئے سنگھ۔ جی نہیں۔ میرے ساتھ یہاں کے ڈاک خانہ کا صرف ایک ڈاکیہ تھا۔

افسر۔ تم بیرپال سنگھ کو جانتے ہو؟

وئے سنگھ۔ اتنا ہی جانتا ہوں کہ مجھے راستہ میں مل گیا تھا۔ وہاں سے کہاں گیا۔ یہ میں نہیں جانتا۔

افسر۔ تمہیں یہ معلوم تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔

وئے سنگھ۔ اُس نے یہاں کے سرکاری نوکروں کی شان میں اسی ڈاکو لفظ کا استعمال کیا تھا۔

افسر۔ اس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم کو یہ بات معلوم تھی۔

ونے سنگھ۔ آپ اِس کا جو مطلب بھی چاہیں سمجھیں ٭

افسر۔ اُس نے یہاں سے تین میل پر سرکاری خزانہ کی گاڑی لوٹ لی ہے اور ایک سپاہی کو قتل کر ڈالا ہے۔ پولیس کو شک ہے کہ یہ سنگین جُرم تمہارے ایماء سے ہوا ہے۔ اس لئے ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں ٭

ونے سنگھ۔ یہ مجھ پر سراسر زیادتی ہے۔ مجھے اِس ڈاکہ اور قتل کی ذرا بھی خبر نہیں ہے ٭

افسر۔ اِس کا فیصلہ عدالت سے ہوگا ٭

ونے سنگھ۔ کم سے کم مجھے اتنا پُوچھنے کا حق تو ہے کہ پولیس کے مجھ پر یہ شک کرنے کا کیا سبب ہے؟

افسر۔ اُسی ڈاکیہ کا بیان ہے جو رات کو تمہارے ساتھ یہاں سویا تھا ٭

ونے سنگھ۔ (حیرت سے) یہ اُسی ڈاکیہ کا بیان ہے؟

افسر۔ ہاں اُس نے ایک گھڑی رات باقی رہنے کے وقت اس کی اطلاع دی۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ریاست کی پولیس آپ جیسے بھلے آدمیوں سے کتنی چوکس رہتی ہے ٭

فطرت انسانی کتنی پیچیدہ اور نا قابلِ فہم ہے اُس کا ونے کو زندگی میں اول مرتبہ تجربہ ہوا۔ اس قدر اعتقاد و اعتبار کے پردے میں اس قدر فریب اور دغا بازی!

دو سپاہیوں نے ونے سنگھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اُنہیں ایک گھوڑے پر سوار کر دیا اور جسونت نگر کی طرف چلے ٭

(۱۷)

ونے سنگھ چھ ماہ سے جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہ ڈاکوؤں کا کچھ پتہ ملتا ہے۔ نہ اُن پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ حکام کو اب بھی وہم ہے کہ انہیں کے ایماء سے ڈاکہ پڑا تھا۔ اس لئے وہ اُن پر انواع واقسام کے مظالم کرتے ہیں۔ جب اس طریقہ سے کام چلتا ہوا نہیں دکھائی دیتا تو ترغیب سے کام لیتے ہیں اور پھر وہی پُرانا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ونے سنگھ پہلے اور قیدیوں کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ لیکن جب قیدیوں کو اُن کی طرف مائل ہوتا دیکھا گیا تو اس خوف سے کہ کہیں جیل میں کوئی شورش نہ برپا ہو جائے انہیں سب سے الگ ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھڑی بہت تنگ تھی۔ ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ دوپہر کو بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ بدبو اتنی کہ ناک پھٹتی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دروازہ کھلتا۔ محافظ کھانا رکھ کر پھر دروازہ بند کر دیتا۔ ونے سنگھ کو تکلیف برداشت کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بھوک پیاس سہ سکتے تھے۔ اوڑھنے اور بچھانے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ اس سے انہیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوتی تھی لیکن تاریکی اور تعفن میں قید رہنا اُن کے لئے بالکل نئی سزا تھی۔ اندر اُن کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ صاف ستھری ہوا میں سانس لینے کے لئے وہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ تازہ ہوا کتنی بیش قیمت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ انہیں اب ہو رہا تھا۔ مگر ان بدسلوکیوں کے باوجود بھی وہ مغموم اور دل شکستہ نہ ہوتے تھے۔ اس سخت آزمایش ہی میں انہیں قوم کی نجات نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دل میں کہتے تھے۔ یہ کٹھن تپسیا بے اثر

نہیں جا سکتی۔ جب تک ہم سختیاں اُٹھانا نہ سیکھیں گے۔ جب تک ہم عیش و عشرت کو ترک نہ کریں گے اُس وقت تک ہم سے قوم کی کچھ بھلائی نہیں ہو سکتی۔ یہی خیال اُن کو ڈھارس دیتا ہے۔

لیکن جب صوفیہ کی بیوفائی کا خیال آجاتا تو اُن کا سارا صبر، حوصلہ اور ایثار حسرت و یاس کے ہجوم میں غائب ہو جاتا۔ وہ اپنے کو کتنا ہی سمجھاتے کہ صوفیہ نے جو کچھ کیا مجبور ہو کر کیا ہوگا۔ لیکن اس دلیل سے اُن کی تشفی نہ ہوتی تھی۔ "کیا صوفیہ صاف صاف نہ کہہ سکتی تھی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی؟ شادی کے بارہ میں لڑکی کی رائے ہمارے یہاں فیصلہ کُن ہے۔ لیکن عیسائیوں میں عورت کی منظوری ایک خاص اور ضروری بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر صوفیہ کو کلارک سے محبت نہ تھی تو کیا وہ انہیں ٹکا سا جواب نہ دے سکتی تھی؟ دراصل صنف نازک کا رشتۂ محبت بھی نازک ہوتا ہے جو ایک ہلکے جھٹکے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جب صوفیہ جیسی دوراندیش۔ آن پر جان دینے والی۔ اصولوں کی پابند اور نیک دل عورت یوں بیوفائی کر سکتی ہے تو دوسری عورتوں سے کیا اُمید؟ اس صنف کا اعتبار کرنا ہی فضول ہے۔ صوفی نے مجھے ہمیشہ کے لئے ہوشیار کر دیا۔ ایسا سبق یاد کرا دیا جو کبھی نہ بھولے گا۔ جب صوفیہ دغا کر سکتی ہے تو ایسی کون عورت ہے جس پر اعتبار کیا جا سکے؟ آہ کیا معلوم تھا کہ اتنی بے لوثی۔ اتنی سادگی۔ اتنی نیکنامی بھی بالآخر غرض کے سامنے سر جھکا دے گی!! اب تمام عمر عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔ اُس سے یوں دور رہوں گا جیسے کالی ناگن سے اُس سے یوں بچ کر چلوں گا۔

جیسے بڑے نوک دار کانٹے سے۔ کسی سے نفرت کرنا مصلحت اور شرافت کے خلاف ہے مگر اب اِس جنس سے نفرت کروں گی ؎

اس مایوسی۔ رنج اور تفکر میں پڑا ہوا کبھی کبھی وہ اتنا مضطرب ہو جاتا کہ جی میں آتا کہ چل کر اُس سنگدل کے سامنے دیوار سے سر ٹکرا کر جان دے دوں جس میں اُسے بھی پشیمان ہونا پڑے۔ میں یہاں آگ کے کُنڈ میں جل رہا ہوں۔ دل میں پھپھولے پڑے ہوئے ہیں۔ وہاں کسی کو خبر بھی نہیں۔ سیر و تفریح کا لطف اُٹھایا جا رہا ہے۔ اُس اُس کی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتا تو اسے بھی اپنی کج ادائی اور بیدردی پر شرم آتی۔ ایشور! مجھے اِن بدانیشیوں کے لئے معاف کرنا۔ میں دل جلا ہوں۔ وہ بھی میری طرح مایوسی کی آگ میں جلتی! کلارک اس کے ساتھ اُسی طرح دغا کرتا جس طرح اُس نے میرے ساتھ کی ہے۔ اگر میری بد دعا میں کچھ بھی اثر ہے ایک دن ضرور ہی اُسے بھی رنج و غم کے آنسو بہاتے ہوئے دیکھوں گا۔ یہ غیر ممکن ہے کہ خونِ ناحق رنگ نہ لائے ؎

لیکن یہ مایوسی سراپا درد انگیز ہی نہ تھی۔ اُس میں روحانی ترقی کے آثار بھی پوشیدہ تھے۔ ونے کے دل میں پھر دہی نیک خیالی پیدا ہو گئی۔ جسے محبت کے خیالات نے ناپید کر دیا تھا۔ مایوسی نے غرض کو فنا کر دیا ؎

ایک روز ونے سنگھ رات کے وقت لیٹے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ جانے میرے ساتھیوں پر کیا گذری؟ میری طرح وہ بھی تو آفتوں میں نہیں مبتلا ہو گئے؟ کسی کی کچھ خبر ہی نہیں ملتی۔ یہ سوچ ہی رہے

تھے کہ دفعتاً اُن کو اپنے سرہانے کی جانب ایک دھما کا سُنائی دیا۔ وہ چونک پڑے اور کان لگا کر سُننے لگے۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ دیوار کھود رہے ہیں۔ دیوار پتھر کی تھی مگر بہت پُرانی۔ جوڑوں میں لونی لگ گئی تھی۔ پتھر کی سلیں آسانی سے اپنی جگہ چھوڑتی جاتی تھیں۔ وِنے سنگھ کو تعجب ہوا "یہ کون لوگ ہیں؟ اگر چور ہیں تو جیل کی دیوار توڑنے سے انہیں کیا ملے گا؟ شاید سمجھتے ہیں کہ جیل کے داروغہ کا یہی مکان ہے" وہ اسی حیص بیص میں تھا کہ اندر روشنی کی ایک جھلک آئی۔ معلوم ہوا کہ چوروں نے اپنا کام پورا کر لیا۔ وہ نقب کے سامنے جا کر بولے "تم کون ہو؟ یہ دیوار کیوں کھود رہے ہو"

باہر سے آواز آئی "ہم آپ کے پرانے خادم ہیں۔ میرا نام بیرپال سنگھ ہے"

وِنے سنگھ نے حقارت سے کہا "کیا تمہارے لئے کسی خزانہ کی دیواریں نہیں ہیں جو جیل کی دیوار کھود رہے ہو؟ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گا"

بیرپال۔ مہاراج! ہم سے اُس دن بڑا اپرادھ ہوا۔ چھما کیجئے۔ ہمیں نہ معلوم تھا کہ صرف چند منٹ ہمارے ساتھ رہنے کے سبب آپ پر بھی آفت آ جائے گی ورنہ ہم سرکاری خزانہ نہ لوٹتے۔ ہمیں رات دن یہی چنتا لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح آپ کے درشن کریں۔ اور آپ کو اس آفت سے چھڑائیں۔ آئیے! آپ کے لئے گھوڑا حاضر ہے

وِنے سنگھ۔ میں پاپیوں کے ہاتھوں اپنی حفاظت نہیں کرانا چاہتا

اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اتنا بڑا الزام سر پر رکھے ہوئے جیل سے بھاگ کر اپنی جان بچاؤں گا تو تم دھوکے میں ہو۔ مجھے اپنی جان اتنی پیاری نہیں ہے ۔

بیر پال۔ خطاوار تو ہم ہیں۔ آپ تو بالکل بے خطا ہیں۔ آپ پر تو حاکموں نے یہ محض بیجا ظلم کیا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو یہاں سے نکل جانے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے ۔

ونے سنگھ۔ جبتک عدالت مجھے رہا نہ کر دے۔ میں کسی طرح بھی نہیں جا سکتا ۔

بیر پال۔ یہاں کی عدالتوں سے انصاف کی امید رکھنا چڑیا سے دودھ نکالنا ہے۔ ہم سب کے سب انہیں عدالتوں کے مارے ہوئے ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ میں اپنے گاؤں کا مکھیا تھا۔ لیکن میری ساری جائداد صرف اس لئے ضبط کر لی گئی کہ میں نے علاقہ دار کے ہاتھوں سے ایک بیکس نوجوان لڑکی کو بچایا تھا۔ اُس کے گھر میں اُس کی بُڑھیا ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ حال ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ علاقہ دار کی بُری نگاہ اُس پر پڑ گئی اور وہ لڑکی کو اُس کے گھر سے نکال لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے خبر مل گئی۔ رات کو جوں ہی علاقہ دار کے آدمیوں نے بڑھیا کے گھر میں گھسنا چاہا میں اپنے کئی دوستوں کو ساتھ لے کر وہاں جا پہنچا اور اُن بدمعاشوں کو مار کر وہاں سے نکال دیا۔ بس علاقہ دار اُسی دن سے میرا جانی دشمن ہو گیا۔ مجھ پر چوری کا مقدمہ چلا کر قید کرا دیا۔ عدالت اندھی تھی۔ جیسا علاقہ دار نے کہا۔ ویسا ہی حاکم نے کیا۔ ایسی عدالتوں سے آپ ناحق انصاف کی اُمید

رکھتے ہیں ؞

وِنے سنگھ۔ تم لوگ اُس دن مجھے باتیں کرتے کرتے بندوق کی آواز سُن کر ایسا بھاگے کہ مجھے تم پر اب اعتبار نہیں ہوتا ؞

بیرپال۔ مہاراج! کچھ نہ پوچھئے۔ بندوق کی آواز سنتے ہی ہم پاگل سے ہو گئے۔ ہمیں جب ریاست سے بدلہ لینے کا کوئی موقع ملتا ہے تو ہم اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ ہمارے اوپر کوئی بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ ریاست نے ہم کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ہمارے پُرکھوں نے اپنے خون سے اس ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ آج وہی ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔ ہم آپ کے پاس سے بھاگے تو تھوڑی دور پر اپنے غول کے کئی آدمیوں کو ریاست کے سپاہیوں سے لڑتے پایا۔ ہم پہنچتے ہی سرکاری آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کی بندوقیں چھین لیں۔ ایک آدمی کو مار گرایا اور روپیوں کی تھیلیاں گھوڑوں پر لاد کر بھاگ نکلے۔ جب سے سُنا ہے کہ آپ ہماری مدد کرنے کے شبہ میں گرفتار کئے گئے ہیں تب سے اِسی دوڑ دھوپ میں ہیں کہ آپ کو یہاں سے نکال لے جائیں۔ یہ جگہ آپ جیسے دھرماتما۔ نڈر اور آزاد آدمیوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں اُسی کا نباہ ہے جو پتلے سرے کا گھاگ۔ مکار اور بدمعاش ہو اور اپنا کام نکالنے کے لئے بُرے سے بُرا طریقہ اختیار کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکے ؞

ونے سنگھ نے غرور کے ساتھ جواب دیا۔ "اگر تمہاری باتیں لفظ بہ لفظ سچ ہوں تو بھی میں کوئی ایسا کام نہ کروں گا۔ جس سے ریاست کی بدنامی ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پینا منظور ہے۔

مگر وہ کر اُن کو مصیبت میں ڈالنا منظور نہیں۔ اس ریاست کو ہم نے ہمیشہ فخر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور مہاراجہ صاحب کو ہم آج بھی اُسی احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُسی سانگا اور پرتاب کے ورثا میں سے ہیں۔ جنہوں نے ہندو قوم کی حفاظت میں اپنی جانیں تک دے دی تھیں۔ ہم مہاراجہ صاحب کو اپنا محافظ اپنا خیر اندیش اور چھتری قوم کا سردار سمجھتے ہیں۔ اُن کے ملازم سب ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ پھر یہاں کی عدالتوں پر کیوں نہ اعتبار کریں؟ وہ ہمارے ساتھ بے انصافی بھی کریں تو بھی ہم زبان نہ کھولیں گے۔ ریاست کو مطعون کر کے ہم اپنے آپ کو اُس درجہ کے ناقابل ثابت کرتے ہیں جو ہماری زندگی کی معراج ہے۔

بیر پال۔ دھوکا کھائیے گا۔

ونے سنگھ۔ اس کی کوئی فکر نہیں۔

بیر پال۔ میرے سر سے بدنامی کیسے دور ہو گی؟

ونے سنگھ۔ نیک اعمال سے۔

بیر پال سمجھ گیا کہ اپنے اصولوں سے منحرف نہ ہوں گے پانچوں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ایک لمحہ میں موسم سرما کی گھنی کہر نے اُنہیں اپنے پردہ میں چھپا لیا۔ ٹاپوں کی آواز کچھ دیر تک کانوں میں آتی رہیں۔ پھر وہ بھی نہ سنائی دیں۔

اب ونے سنگھ سوچنے لگے۔ صبح جب لوگ یہ نقب دیکھیں گے تو دل میں کیا خیال کریں گے؟ اُنہیں یقین ہو جائے گا کہ میں ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہوں اور پوشیدہ طریقہ پر بھاگنے کی کوشش کر رہا ہوں

لیکن نہیں۔ جب دیکھیں گے کہ میں بھاگنے کا موقع پا کر بھی نہیں بھاگا تو اُن کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اُنہوں نے پتھر کے ٹکڑے چُن چُن کر نقب کو بند کرنا شروع کیا۔ اُن کے پاس صرف ایک ہلکا سا کمبل تھا۔ اور سرما سرد ہوا اس شگاف کی راہ سے سن سن کرتی آرہی تھی۔ کُھلے میدان میں شاید اُنہیں کبھی اتنی سردی نہ معلوم ہوئی تھی۔ ہر ہر رونگٹے میں یہ ہوا سُوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔ شگاف بند کر کے وہ لیٹ گئے۔

صبح ہوئی تو جیل خانہ میں ہل چل مچ گئی۔ ناظم۔ علاقہ دار۔ سبھی موقع واردات پر پہنچ گئے۔ تحقیقات ہونے لگی۔ دنے سنگھ نے سارا حال کہہ سُنایا۔ افسروں کو بڑی فکر ہوئی کہ کہیں دہی ڈاکو انہیں نکال نہ لے جائیں۔ اُن کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ طے ہو گیا کہ اِن پر آج ہی مقدمہ چلایا جائے۔ مسلح پولیس اُنہیں عدالت کی طرف لے چلی۔ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ ساتھ ہو گئی۔ سب لوگ یہی کہہ رہے تھے۔ حاکم لوگ ایسے شریف۔ نیک دل اور پر اُپکاری شخص پر مقدمہ چلاتے ہیں۔ بُرا کرتے ہیں۔ بیچارہ نے نہ جانے کس بُری ساعت میں یہاں قدم رکھا تھا۔ ہم تو بھاگے ہیں ہی۔ اپنے پچھلے کرموں کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیتے۔ ناحق اس آگ میں کود دئے کتنے ہی لوگ رو رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ حاکم اُنہیں سخت سزا دے گا۔ لمحہ بہ لمحہ تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ اور پولیس کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ بگڑ نہ اُٹھیں۔ دفعتاً ایک موٹر آئی

اور موٹر ڈرائیور نے پولیس کے افسر کو ایک رقعہ دیا۔ سب لوگ غور سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟ اتنے میں ونے سنگھ موٹر میں سوار کرائے گئے اور موٹر ہوا ہو گئی۔ سب کے سب تاکتے رہ گئے۔

جب موٹر کچھ دور نکل گئی تو ونے نے شوفر (گاڑی چلانے والے) سے پوچھا "مجھے کہاں لئے جاتے ہو؟"

شوفر نے کہا "آپ کو دیوان صاحب نے بلایا ہے"۔

ونے سنگھ نے اور کچھ نہ پوچھا۔ انہیں اس وقت خوف کے بجائے خوشی تھی کہ دیوان سے ملنے کا یہ اچھا موقع ملا۔ اب اُن سے یہاں کے متعلق کافی گفتگو ہوگی۔ سنا ہے۔ قابل آدمی ہیں۔ دیکھوں یہاں کے موجودہ طریقوں کا جواز کیونکر ثابت کرتے ہیں؟

یکایک شوفر نے کہا "یہ دیوان ایک ہی پاجی ہے۔ رحم کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ ایک دن بچہ کو اسی موٹر سے ایسا گراؤں گا کہ ہڈی پسلی کا پتہ نہ چلے گا"۔

ونے سنگھ۔ ضرور گراؤ۔ ایسے ظالموں کی یہی سزا ہے۔

شوفر نے حیرت سے ونے کی طرف دیکھا۔ اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ونے سنگھ کے منہ سے ایسی بات سننے کی اُسے امید نہ تھی۔ اُس نے سنا تھا کہ وہ اعلےٰ ترین اوصاف کے مخزن ہیں۔ اُن کا دل بہت پاک ہے۔ بولا "تو آپ کی بھی یہی مرضی ہے"۔

ونے سنگھ۔ کیا کیا جائے۔ ایسے آدمیوں پر اور کسی بات کا تو اثر ہی نہیں ہوتا۔

شوف۔ اب تک مجھے یہی اندیشہ ہوتا تھا کہ لوگ مجھے قاتل کہیں گے لیکن جب آپ سے جیسے فرشتہ خصلت شخص کی یہ خواہش ہے تو مجھے کیا ڈر؟ بچے بہت رات کو گھومنے نکلا کرتے ہیں۔ ایک ٹھوکریں تو کام تمام ہو جائے گا۔

ونے سنگھ یہ سن کر ایسا چونکے گویا کوئی خوفناک خواب دیکھا ہو انہیں معلوم ہوا کہ میں نے ایک نفرت انگیز خیال کی تائید کر کے کتنی بڑی بُرائی کی ہے۔ اب اُن کی سمجھ میں آیا کہ مخصوص آدمیوں کو کتنی احتیاط سے کچھ کہنا چاہئے کیونکہ اُن کا ایک ایک لفظ ترغیب وتحریک سے معمور رہتا ہے۔ وہ دل میں پچھتا رہے تھے کہ میرے مُنہ سے ایسی بات نکلی ہی کیوں؟ اور کسی طرح کمان سے نکلے ہوئے تیر کو پھیر لانے کی تدبیر سوچ رہے تھے کہ اتنے میں دیوان صاحب کا گھر آگیا۔ بڑے پھاٹک پر دو مسلح جوان کھڑے ہوئے تھے اور پھاٹک سے ذرا فاصلہ پر دو پیتل کی توپیں رکھی ہوئی تھیں۔ پھاٹک پر موٹر رک گئی۔ اور دونوں سپاہی ونے سنگھ کو اندر لے چلے۔ دیوان صاحب دیوان خاص میں موجود تھے۔ اُنھوں نے خبر پاتے ہی ونے کو بُلا لیا۔

دیوان صاحب کا قد اونچا بدن گٹھیلا اور رنگ گورا تھا۔ ادھیڑ ہو جانے پر بھی اُن کے چہرہ کی رونق کسی کھِلے ہوئے پھول کی طرح تھی۔ تنی ہوئی مونچھیں تھیں۔ سر پر مختلف رنگوں کا اودے پوری صافہ۔ بدن پر ایک چست شکاری کوٹ۔ نیچے اودے پوری پاجامہ اور اوپر ایک بھاری اوورکوٹ۔ سینہ پر کئی تمغے اور دیگر عزّت افزا نشانات موجود تھے۔ اودے پوری رسالہ کے ساتھ یوروپ کی جنگ عظیم میں شریک

ہوئے تھے۔ اور وہاں کئی نازک موقعوں پر اپنی غیر معمولی شجاعت سے فوجی افسروں کو متحیر کر دیا تھا۔ یہ اُسی کام کا نتیجہ تھا کہ وہ اس عہدہ پر مقرر ہوئے تھے۔ سردار نیل کنٹھ سنگھ نام تھا۔ ایسا وجیہ شخص دسنے کی نظر سے کبھی نہ گزرا تھا۔

دیوان صاحب نے دسنے سنگھ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے اُنہیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے "یہ زیور تو آپ کے جسم پر بہت زیبا نہیں ہیں لیکن عوام کی نگاہوں میں اُن کی جتنی وقعت ہے اُتنی میرے اِن تمغوں اور پٹیوں کی ہرگز نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر میں آپ پر رشک کروں تو کیا نامناسب ہے؟"

دسنے سنگھ نے سمجھا تھا کہ دیوان صاحب جاتے ہی جاتے گرج پڑیں گے۔ لال پیلی آنکھیں دکھائیں گے۔ وہ اُس برتاؤ کے لئے تیار تھے۔ اور جو دیوان صاحب کی یہ ہمدردانہ گفتگو سنی تو پس و پیش میں پڑ گئے۔ اُس سخت جوابی کے لئے یہاں ذرا بھی گنجایش نہ تھی۔ جسے اُنہوں نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا۔ بولے "یہ تو کوئی ایسی نایاب چیز نہیں ہے جس کے لئے آپ کو رشک کرنا پڑے"۔

دیوان صاحب (ہنس کر) آپ کے لئے نایاب نہیں پر میرے لئے نایاب ہی ہے۔ مجھ میں وہ سچی ہمت وہ سچا حوصلہ نہیں ہے جس کے صلہ میں یہ چیزیں ملتی ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ کنور بھرت سنگھ کے سپوت بیٹے ہیں۔ اُن سے میری پُرانی ملاقات ہے۔ اب وہ شاید مجھے بھول گئے ہوں۔ کچھ تو اس رشتہ سے کہ آپ میرے پُرانے دوست کے بیٹے ہیں اور کچھ اس رشتہ سے کہ آپ نے عین عالم شباب میں

نفسانی خواہشات کو ترک کر کے قومی خدمت کا ذمہ لیا ہے۔ میرے دل میں آپ کی خاص عزت و محبت ہے۔ شخصی حیثیت سے میں آپ کی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور تھوڑے سے وقت میں آپ نے ریاست کو جو نفع پہنچایا ہے۔ اُس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ بے قصور ہیں اور ڈاکوؤں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس کا مجھے وہم و گمان تک نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب سے بھی آپ کے متعلق ابھی ایک گھنٹہ تک گفتگو ہوئی۔ وہ ابھی کھلے دل سے آپ کے مدّاح ہیں۔ لیکن موجودہ حالات ہمیں آپ سے یہ التجا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ بہت اچھا ہو اگر آپ ...... اگر آپ رعایا سے اپنے کو جدا رکھیں۔ مجھے آپ سے یہ کہتے ہوئے دلی افسوس ہوتا ہے کہ اب یہ ریاست آپکی مہمانداری کا لطف نہیں اُٹھا سکتی"۔

دنے سنگھ نے اپنے اُٹھتے ہوئے غصہ کو ضبط کر کے کہا "آپ نے میرے متعلق جس میں حسنِ ظن کا اظہار کیا ہے اُس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن افسوس کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ قومی خدمت میری زندگی کا خاص مدّعا ہے اور قوم سے جدا ہو کر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا"۔

دیوان صاحب ۔ اگر آپ کی زندگی کا خاص مدّعا یہی ہے تو آپ کو کسی ریاست میں آنا مناسب نہ تھا۔ ریاستوں کو آپ سرکار کی محلسرا سمجھئے جہاں آفتاب کی روشنی کا بھی گذر نہیں ہو سکتا۔ ہم سب اس حرم سرا کے حبشی خواجہ سرا ہیں۔ ہم کسی کی عشق آمیز نگاہوں کو ادھر

اُٹھنے نہ دیں گے۔ کوئی منچلا جوان ادھر قدم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہو تو ہم اپنے عہدہ کے ناقابل خیال کئے جائیں۔ ہماری شوقین مزاج سرکار اپنی حسب خواہش تفریح کے لئے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتی ہے۔ حرم سرا کے سوئے ہوئے بھاگ اُس دن جاگتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بیگمات کی دلی تمنّاؤں کا انحصار اُن کی خوب صورتی، ناز و انداز، بناؤ اور سنگار پر ہوا کرتا ہے۔ ورنہ ہماری رسیلی سرکار اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ ہماری سرکار کو مشرقی آرایش و زیبایش پسند ہے۔ اُس کا حکم ہے کہ بیگمات کا لباس اور زیور مشرقی ہو۔ بناؤ سنگار مشرقی ہو۔ ناز و کرشمہ مشرقی ہو۔ اُن کی آنکھیں شرمیلی ہوں۔ مغرب کی شوخی اُن میں نہ آنے پائے۔ اُن کی رفتار ہنسوں کی چال کی طرح دھیمی ہو۔ مغربی بیگمات کی طرح اچھلتی کودتی نہ چلیں۔ وہی کنیز ہوں۔ وہی حرم کا داروغہ ہو۔ وہی حبشی غلام اور وہی اونچی چہار دیواری جس میں پرندہ پر نہ مار سکے۔ آپ نے اس محلسرا میں گھسنے کی جرأت کی ہے۔ یہ بات ہماری عاشق مزاج سرکار کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور آپ تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ خادمانِ قوم کا ایک گروہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ نادر شاہی حکم ہے کہ جتنی جلد ہو سکے یہ گستاخ گروہ حرم سرا سے دور بھگا دیا جائے۔ یہ دیکھئے۔ پولٹیکل ایجنٹ نے آپ کے رفقا کے کارناموں کی داستان لکھ بھیجی ہے۔ کوئی گڑھ میں کسانوں کی انجمن قایم کرتا پھر رہا ہے۔ کوئی بیکانیر میں بیگار کی جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ کوئی میواڑ میں ریاست کے ان ٹیکسوں

کی مخالفت کر رہا ہے جو زمانۂ قدیم سے وصول ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ لوگ جمہوریت کا ڈنکا بجاتے پھرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر انسان کو کھانے پہننے اور آرام سے زندگی بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ اس حرم سرا میں اِن خیالات اور اصولوں کی اشاعت کرکے آپ سرکار بہادر کو بدگمان کر دیں گے اور اُس کی آنکھیں پھر گئیں تو ہمارا دُنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ ہم آپ کو عشق و محبت کے کنج میں آگ نہ لگانے دیں گے۔

ہم اپنی کمزوریوں کو طنز کے پردہ میں چھپاتے ہیں۔ دیوان صاحب نے طنزیات کو مستعمل کرکے دنے کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی تھی۔ لیکن دنے سنگھ اتنے بیوقوف نہ تھے وہ چال بھانپ گئے اور بولے "ہمارا خیال تھا کہ ہم اپنی بےغرضانہ خدمت سے آپ کو اپنا ہمدرد بنا لیں گے"۔

دیوان صاحب۔ اس میں آپ کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ ہم کو آپ سے دلی ہمدردی ہے لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ ریزیڈنٹ صاحب کی مرضی کے خلاف ہم ایک تنکا بھی نہیں ہلا سکتے۔ آپ ہمارے اوپر رحم کیجئے۔ ہمیں اسی حالت میں چھوڑ دیجئے۔ ہم جیسے گرے ہوؤں کو اُٹھانے میں آپ کو نیک نامی کے بجائے بدنامی ہی ملے گی۔

دنے سنگھ۔ آپ ریزیڈنٹ کے مداخلت بیجا کی مخالفت کیوں نہیں کرتے؟

دیوان صاحب۔ اس لئے کہ ہم آپ کی طرح بےنفس اور بےلوث نہیں ہیں۔ سرکار کی حفاظت میں ہم من مانے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

من مانے قانون بناتے ہیں۔ من مانی سزائیں دیتے ہیں۔ کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ یہی ہماری کارگزاری سمجھی جاتی ہے۔ اسی کے صلہ میں ہم کو بڑے بڑے خطابات ملتے ہیں اور عہدہ کی ترقی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم مخالفت کیوں کریں؟

دیوان صاحب کی بے غیرتی پر ونے سنگھ نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس سے تو یہ بہتر تھا کہ ریاستوں کا نشان ہی نہ رہتا"۔

دیوان صاحب۔ اسی لئے تو ہم آپ سے التجا کر رہے ہیں کہ اب کسی اور علاقہ کی جانب اپنی توجہ مبذول فرمایئے۔

ونے سنگھ۔ اگر میں جانے سے انکار کروں؟

دیوان صاحب۔ تو مجھے کمال افسوس کے ساتھ آپ کو اسی عدالت کے سپرد کرنا پڑے گا جہاں انصاف کا خون ہوتا ہے۔

ونے سنگھ۔ بیگناہ؟

دیوان صاحب۔ آپ پر ڈاکوؤں کی اعانت کا جرم لگا ہوا ہے۔

ونے سنگھ۔ ابھی آپ نے کہا ہے کہ آپ کو میری نسبت ذرا بھی شک نہیں ہے۔

دیوان صاحب۔ وہ میری ذاتی رائے ہے۔ یہ میری منصبی رائے ہے۔

ونے سنگھ۔ آپ کو اختیار ہے۔

ونے سنگھ پھر موٹر پر بیٹھے تو سوچنے لگے۔ جہاں ایسے ایسے بے غیرت اپنی بدنامیوں پر بغلیں بجانے والے ناخدا ہیں۔ اُس کشتی کو ایشور ہی پار لگائے۔ چلو۔ اچھا ہی ہوا۔ جیل میں رہنے سے ماتاجی کو تو تسکین

ہو گی۔ یہاں سے جان بچا کر بھاگتا تو وہ میری طرف سے بالکل مایوس ہو جاتیں۔ اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اُن کا لکھنا بالکل بے اثر نہیں ہوا۔ چلوں۔ اب عدالت کا سوانگ بھی دیکھ لوں"۔

(۱۸)

صوفیہ گھر آئی تو اُس کا غرور پامال ہو چکا تھا۔ وہ اپنی ہی نگاہوں میں ذلیل ہو چکی تھی۔ اُسے اب نہ رانی صاحب پر غصہ آتا تھا نہ اپنے والدین پر۔ غصہ تھا تو صرف اپنے نفس پر۔ جس کے ہاتھوں اُس کی اتنی رسوائی ہو چکی تھی۔ جس نے اُس کو کانٹوں میں گھسیٹا تھا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ نفس کو پیروں تلے کچل ڈالوں گی۔ اُس کا نشان مٹا دوں گی۔ دُبدھا میں پڑ کر وہ اپنے نفس کو اپنے اوپر غالب آنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھی۔ اُس نے ہمیشہ کے لئے اُس کا منہ بند کر دینے کا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نفس کا منہ بند کر دینا بہت مشکل ہے لیکن وہ چاہتی تھی کہ اب اگر نفس جادۂ فرض سے منحرف ہو تو وہ اپنے اس انحراف پر نادم ضرور ہو۔ جس طرح کوئی تلک لگائے ہوئے وشنو دیوتا کا پوجاری شراب کی بھٹی میں جاتے ہوئے جھجھکتا ہے اور شرم سے گردن نہیں اُٹھا سکتا اُسی طرح اُس کا نفس بھی خوش اطواری کی بندشوں میں پڑ کر بڑی باتوں سے جھجکے۔ اس نفس کشی کے لئے وہ بیوفائی اور مکاری کا الزام سر پر لینے کو تیار رہتی۔ تمام عمر مایوسی اور فراق کی آگ میں جلنے کو تیار تھی۔ وہ نفس سے اُس ذلت کا بدلہ لینا چاہتی تھی جو رانی کے ہاتھوں اُسے برداشت کرنی پڑی تھی۔ اُس کا دل شراب پینا چاہتا تھا۔ وہ اُسے زہر پلا کر اُس کی پیاس بجھانا

چاہتی تھی۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے کو مسٹر کلارک کے سپرد کر دونگی۔ نفس کشی کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔

لیکن باطن میں اُس کا وقار کتنا ہی مٹ گیا ہو مگر ظاہر میں وہ اس وقت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اپنے گھر میں اُس کی اتنی خاطر مدارات کبھی نہ ہوئی تھی۔ مسز سیوک کی آنکھوں میں وہ کبھی اتنی پیاری نہ تھی۔ اُن کے مُنہ سے اُس نے کبھی اتنی میٹھی باتیں نہ سُنی تھیں۔ یہاں تک کہ اب وہ اُس کی مذہبی تحقیقات سے بھی ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں۔ عبادت کے معاملہ میں بھی اب اُس پر کوئی جبر نہ کیا جاتا تھا۔ وہ اب اپنی مرضی کی مالک تھی اور مسز سیوک یہ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں کہ صوفیہ سب سے پہلے گرجا گھر پہنچ جاتی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ مسٹر کلارک کی صحبت کا یہ اثر ہے۔

لیکن صوفیہ کے سوا یہ اور کون جان سکتا تھا کہ اس کے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔ اُس کو روز عشق و محبت کا سوانگ بھرنا پڑتا تھا جس سے اُس کو دلی نفرت ہوتی تھی۔ اُسے اپنی مرضی کے خلاف مصنوعی جذبات کی نقل کرنی پڑتی تھی۔ اُسے عشق و محبت کے وہ الفاظ ہمہ تن گوش ہو کر سُننے پڑتے تھے جو اُس کے دل پہ ہتھوڑے کی ضرب کی طرح پڑتے تھے۔ اُسے اُن ہوسناک اور محبت بھری نگاہوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ جن کے سامنے وہ آنکھیں بند کر لینا چاہتی تھی۔ مسٹر کلارک کی باتیں کبھی کبھی اتنی عشقیہ ہوتی تھیں کہ صوفی کا دل چاہتا تھا کہ اس خود ساختہ طرز کا پردہ فاش کر دوں۔ اس مصنوعی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے دل کے

درد و سوز میں ایک حاسدانہ مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ پاپی اتیرا یہی سزا ہے۔ تو اسی قابل ہے۔ تو نے مجھے جتنا ذلیل کیا ہے اُس کا تجھے کفارہ کرنا پڑے گا۔

اُسی طرح وہ ہجراں نصیب رو رو کر زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ اس پر طُرّہ یہ کہ یہ تکلیف کم ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ صوفیہ نامعلوم طریقہ پر مسٹر کلارک سے کچھ کشیدہ خاطر رہتی تھی۔ دل بہت دبانے پر بھی اُن سے نہ ملتا تھا۔ اُس کی یہ کشیدگی کلارک کی آتش عشق کو اور بھی مشتعل کر رہی تھی۔ صوفیہ اگر اِس حالت میں بھی اُنہیں مُنہ نہ لگاتی تھی تو اُس کا خاص سبب مسٹر کلارک کی مذہبی رغبت تھی۔ اُس کی نگاہ میں مذہب سے بڑھ کر کوئی بُری بات نہ تھی۔ وہ اسے تنگ خیالی۔ نفرت اور غرور کا نشان سمجھتی تھی۔ کلارک دل ہی دل میں سمجھتے تھے کہ صوفیہ کو میں ابھی نہیں پاسکا ہوں اور اس لئے بہت زیادہ مشتاق ہونے پر بھی اُنہیں صوفیہ سے شادی کے متعلق گفتگو کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اُنہیں یقین کامل نہ تھا کہ میری التجا قبول ہوگی لیکن امید کا تار اُنہیں صوفیہ کے دامن سے باندھے ہوئے تھا۔

اسی طرح ایک سال سے زیادہ وقت گذر گیا اور مسز سیوک کو اب شک ہونے لگا کہ صوفیہ کہیں ہمیں سبز باغ تو نہیں دکھا رہی ہے۔ آخر ایک روز اُنہوں نے صوفیہ سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو رات دن مسٹر کلارک کے ساتھ بیٹھی بیٹھی کیا کیا کرتی ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا وہ شادی کی بات چیت ہی نہیں کرتے؟ یا تو ہی اُن

سے بھاگی بھاگی پھرتی ہے؟"

صوفیہ شرم سے سرخ ہو کر بولی۔"وہ کہنا ہی نہیں چاہتے تو کیا میں اُن کی زبان ہو جاؤں؟"

مسز سیوک۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ عورت چاہے اور پھر بھی مرد نہ کہے۔ وہ تو آٹھوں پہر موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ تو ہی انہیں پھٹکنے نہ دیتی ہو گی۔

صوفیہ۔ ماما! ایسی باتیں کرکے مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔

مسز سیوک۔ یہ قصور تمہارا ہی ہے اور اگر تم دو چار دن میں مسٹر کلارک کو شادی کے لئے کہنے کا موقع نہ دو گی تو پھر میں تمہیں رانی صاحبہ کے پاس بھیج دوں گی اور دوبارہ بُلانے کا نام بھی نہ لوں گی۔

صوفی کانپ گئی۔ رانی کے پاس لوٹ کر جانے سے مرجانا کہیں بہتر تھا۔ اُس نے دل میں ٹھان لیا۔ آج وہ کروں گی جو آج تک کسی عورت نے نہ کیا ہو گا۔ صاف کہہ دوں گی کہ میرے گھر کا دروازہ میرے لئے بند ہے۔ اگر آپ مجھے پناہ دینا چاہتے ہیں تو دیجئے۔ ورنہ میں اپنے لئے کوئی اور راستہ نکالوں۔ مجھ سے محبت کی امید نہ رکھئے۔ آپ میرے شوہر ہو سکتے ہیں۔ معشوق نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر مجھے قبول کرتے ہوں تو کیجئے ورنہ پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھائیے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ ماگھ کا مہینہ تھا۔ اُس پر ہوا اور بادل۔ سردی سے ہاتھ پیر اکڑے جاتے تھے۔ نہ کہیں زمین کا پتہ تھا۔ نہ آسمان کا۔ چاروں طرف کہرا چھایا ہوا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ عیسائی عورت مرد صاف شفاف کپڑے اور دبیز لبادے پہنے ہوئے ایک ایک کرکے گرجا گھر

میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک لمحہ میں جان سیڈک۔ مسنر سیوک۔ پربھو سیوک فٹن سے اُترے۔ اور لوگ تو فوراً اندر چلے گئے صرف صوفیہ باہر رہ گئی۔ دفعتاً پربھو سیوک نے باہر آکر پوچھا "کیوں صوفی! مسٹر کلارک اندر گئے؟"

صوفیہ۔ ہاں۔ ابھی ابھی گئے ہیں ۔

پربھو سیوک۔ اور تم؟

صوفیہ نے بیکسانہ انداز سے کہا "میں بھی چلی جاؤں گی"

پربھو سیوک۔ آج تم بہت اُداس معلوم ہوتی ہو

صوفیہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولی "ہاں پربھو۔ آج میں بہت اُداس ہوں۔ آج میری زندگی میں سب سے بڑی مصیبت کا دن ہے کیونکہ آج میں کلارک کو اس امر پر مجبور کر دوں گی کہ وہ مجھ سے شادی کے خواستگار ہوں۔ میرا اخلاقی اور روحانی زوال ہو چکا۔ اب میں اپنے اصولوں پر جان دینے والی اپنے ضمیر کی آواز کو حکم خدا سمجھنے والی مذہبی عقاید کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے والی صوفیہ نہیں ہوں۔ وہ صوفیہ اب دنیا میں نہیں ہے۔ اب میں جو کچھ ہوں اُسے اپنی زبان سے کہتے ہوئے مجھے خود شرم آتی ہے"

پربھو سیوک شاعر ہونے پر بھی اُس خیالی قوت سے بے بہرہ تھے جو دوسروں کے دل میں سما کر اُن کی حالت کا احساس کرتی ہے۔ وہ خیالی دُنیا میں ہمیشہ گھومتے رہتے تھے اور دُنیا کے آرام و تکلیف سے اپنے کو متفکر بنانا اُنہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ یہ دنیا کے جھمیلے ہیں۔ اِن میں کیوں سر کھپائیں؟ انسان کو کھانا اور خوش رہنا

چاہیئے۔ وہی الفاظ صوفیہ کی زبان سے کئی مرتبہ سُن چکے تھے جھنجھلا کر بولے "تو اس میں رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے؟ ماما سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں؟ انہوں نے تمہیں مجبور تو نہیں کیا ہے"؟

صوفیہ نے حقارت کے لہجہ میں کہا "پر بھو! ایسی باتوں سے دل نہ دکھاؤ۔ تم کیا جانو میرے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ اپنی خوشی سے کوئی زہر کا پیالہ نہیں پیتا۔ شاید ہی کوئی ایسا دن جاتا ہو کہ میں تم سے اپنی سیکڑوں بار کی کہی ہوئی کہانی نہ کہتی ہوں۔ پھر بھی تم کہتے ہو۔ تمہیں مجبور کس نے کیا؟ تم تو شاعر ہو۔ خدا تنے بے حس کیسے ہو گئے؟ مجبوری کے سوا آج مجھے کون یہاں کھینچ لایا؟ آج میری یہاں آنے کی ذرا بھی خواہش نہ تھی پر یہاں موجود ہوں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ مذہب کی رہی سہی عزت بھی میرے دل سے اٹھ گئی جھلا کر یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ مذہب خدا کی برکت ہے۔ میں کہتی ہوں۔ یہ خدائی قہر ہے جو انسانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے دُنیا میں نازل ہوا ہے۔ اسی کے باعث آج میں زہر کا گھونٹ پی رہی ہوں رانی جانھوی جیسی نیک دل عورت کا مجھ سے برگشتہ ہو جانے کا اور کیا سبب تھا؟ میں اُس فرشتہ خصلت انسان سے کیوں بیوفائی کرتی جس کی پرستش آج بھی دل میں کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی؟ اگر یہ سبب نہ ہوتا کہ مجھے اپنی روح کو یہ بیرحمانہ سزا دینی ہی کیوں پڑتی میں اِس معاملہ میں جتنا ہی غور کرتی ہوں اتنی ہی مذہب کے متعلق بے اعتباری زیادہ ہوتی ہے۔ آہ۔ میری بیوفائی سے ونے کو کتنا رنج ہو ہوگا۔ اس کے خیال ہی سے میری جان سوکھ جاتی ہے۔ وہ دیکھو منہ

کلارک بلا رہے ہیں۔ شاید سرمن (وعظ) شروع ہونے والا ہے۔ جانا ہی پڑے گا ورنہ ماما جیتا نہ چھوڑیں گی۔"

پر بھوسیوک تو قدم بڑھاتے ہوئے جا پہنچے۔ صوفیہ دو ہی چار قدم چلی تھی کہ یکایک اُسے سڑک پر کسی کے گانے کی آہٹ ملی۔ اُس نے سر اُٹھا کر چہار دیواری کے اوپر سے دیکھا کہ ایک اندھا آدمی ہاتھ میں کھنجڑی لئے یہ گیت گاتا ہوا چلا جا رہا ہے :-

بھئی کیوں رن سے مُنہ موڑیں

بیروں کا کام ہے مرنا   کچھ نام جگت میں کرنا

کیوں بیچ مرجادا چھوڑیں

کیوں جیت کی تجھ کو اِچھا   کیوں ہار کی تجھ کو چنتا

کیوں دُکھ سے ناتا جوڑیں

تو رنگ بھوم میں آیا   دِکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں

صوفیہ نے اندھے کو پہچان لیا۔ سورداس تھا۔ وہ اس گیت کو کچھ اس طرح مست ہو کر گاتا تھا کہ سُننے والوں کے دلوں پر چوٹ سی لگتی تھی۔ لوگ راہ چلتے سُننے کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ صوفیہ محو ہو کر یہ گیت سُنتی رہی۔ اُسے گیت کے تیسرے پد میں زندگی کا پورا فلسفہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

تو رنگ بھوم میں آیا   دِکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں   بھئی کیوں رن سے مُنہ موڑیں؟

راگ اتنا سریلا۔ اتنا شیریں۔ اتنا جوش افزا تھا کہ سماں بندھ

گیا۔ راگ پر کھنجڑی کی تال اور بھی غضب کرتی تھی۔ جو سنتا تھا۔ سر دھنتا تھا ۔

صوفیہ بھول گئی کہ میں گرجا میں جا رہی ہوں۔ سرمن کی ذرا بھی یاد نہ رہی۔ وہ بڑی دیر تک پھاٹک پر کھڑی اسی سرمن کو سنتی رہی یہاں تک کہ سرمن ختم ہو گیا۔ معتقدین باہر نکل کر چلے مسٹر کلارک نے آکر آہستہ سے صوفیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی ۔

کلارک۔ لارڈ بشپ کا سرمن ختم ہو گیا اور تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو!

صوفیہ۔ اتنی جلد؟ ذرا میں اس اندھے کا گانا سننے لگی۔ سرمن کتنی دیر تک ہوا ہوگا؟

کلارک۔ نصف گھنٹہ سے کم نہ ہوا ہوگا۔ لارڈ بشپ کے سرمن مختصر ہوتے ہیں مگر نہایت دلکش۔ میں نے ایسا نورانی اور دانش مندانہ سرمن آج تک نہ سنا تھا۔ انگلستان بھی نہیں! افسوس کہ تم نہ آئیں ۔

صوفیہ۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میں یہاں نصف گھنٹہ تک کھڑی رہی

اسی اثنا میں مسٹر ایشور سیوک اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ آ کر کھڑے ہو گئے۔ مسز سیوک نے کلارک کو مادرانہ محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیوں ولیم۔ صوفی آج کے سرمن کے بارہ میں کیا کہتی ہے"؟

کلارک۔ یہ تو اندر گئی ہی نہیں ۔

مسز سیوک نے صوفیہ کو قہرآلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا "صوفیہ۔ یہ تمہارے لئے شرم کی بات ہے"!

صوفیہ شرمندہ ہو کر بولی "مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں اس اندھے

سننے کے لئے ذرا رُک گئی ۔ اتنے میں سرمن ختم ہوگیا "

رسیوک ۔ بیٹی ۔ آج کا سرمن آبِ حیات کی طرح تھا ۔ جس نے
آسودہ کر دیا ۔ جس نے نہیں سُنا وہ تمام عمر پچھتائے گا ۔ پربھو
نے دامن میں چھپا ۔ ایسا سرمن آج تک نہ سُنا تھا ۔ نی

بیوک ۔ تعجب ہے کہ اُس روحانی نغمہ کے سامنے نہیں یہ دہقا
یادہ دلکش معلوم ہوا ۔

رسیوک ۔ ماما یہ نہ کہئے ۔ دہقانی نغموں میں اکثر ایسی تاثیر ہوتی
ستند شعراء کے کلاموں میں بھی نہیں ہوتی ۔

بیوک ۔ ارے یہ تو وہی اندھا ہے ۔ جس کی زمین ہم نے لی ہے
ں کیسے آپہنچا ؟ ابھاگے نے روپے نہ لئے ۔ اب گلی گلی بھیک
رتا ہے ۔

ختہ سورداس نے بلند آواز میں کہا " دوہائی ہے ! پنچو ۔ دوہائی
سیوک صاحب اور راجہ صاحب نے میری زمین زبردستی چھین لی
ے دکھیا کی فریاد کوئی نہیں سُنتا ۔ دوہائی ہے !

دُربل کو نہ ستائیے جا کی موٹی ہائے
موئی کھال کی سانس سوں سار بھسم ہو جائے "

لارک نے مسٹر سیوک سے پوچھا " اُس کی زمین تو معاوضہ دے
ی تھی نا ؟ اب یہ کیسا جھگڑا ہے ؟ "

سیوک ۔ اُس نے معاوضہ نہیں لیا ۔ روپے خزانہ میں جمع کر
یئے ہیں ۔ بدمعاش آدمی ہے ۔

چتاری کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تھے۔ سورداس سے پوچھا "کیوں اندھے کیسی زمین تھی؟ راجہ صاحب نے کیسے لے لی؟"

سورداس۔ ہجور۔ میرے باپ دادوں کی جمین (زمین) ہے بیکوک صاحب وہاں چُرٹ بنانے کا کارکھانا کھول رہے ہیں اُن کے کہنے سے راجہ صاحب نے وہ جمین مجھ سے چھین لی ہے دہائی ہے سرکار کی۔ دوہائی پنچو۔ گریب کی کوئی نہیں سنتا۔

عیسائی بیرسٹر نے کلارک سے کہا "میرے خیال میں خانگی فائدہ کے لئے کسی کی زمین پر قبضہ کرنا خلافِ قانون ہے"۔

کلارک۔ بہت معقول معاوضہ دیا گیا ہے۔

بیرسٹر۔ آپ کسی کو معاوضہ لینے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے جب تک آپ یہ ثابت نہ کر دیں کہ آپ زمین کو عوام کے فایدہ کے لئے لے رہے ہیں۔

"کاشی آئرن ورکس" کے مالک مسٹر جان برڈ نے جو جان سیوک کے پرانے مخالف تھے کہا: "بیرسٹر صاحب! کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ سگریٹ کا کارخانہ کھولنا کار ثواب ہے۔ سگریٹ پینے والے آدمی کو بہشت میں داخل ہونے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی"۔

پروفیسر چارلس سیمین۔ جنہوں نے سگریٹ نوشی کے خلاف ایک پیمفلٹ لکھا تھا۔ بولے "اگر سگریٹ کے کارخانہ کے لئے سرکار زمین دلا سکتی ہے تو کوئی سبب نہیں کہ چکلوں کے لئے نہ دلائے۔ سگریٹ کے کارخانہ کے لئے زمین پر قبضہ کرنا اُس قانونی دفعہ کا بیجا طور پر استعمال کرنا ہے۔ میں نے اپنے پیمفلٹ میں دنیا کے بڑے بڑے علماء اور حکماء کی

رائیں درج کی تھیں۔ خرابی صحت کا خاص سبب سگریٹ نوشی کی کثرت ہے۔ افسوس کہ اُس پمفلٹ کے عوام نے قدر نہ کی"۔

"کاشی ریلوے یونین" کے سکرٹری مسٹر نیل منی نے کہا "یہ سارے قاعدے سرمایہ داروں کی نفع رسانی کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور سرمایہ داروں ہی کو یہ تجویز کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ اُن قواعد کا استعمال کب اور کہاں ہو۔ کتّے کو کھال کی پاسبانی سپرد کی گئی ہے۔ کیوں اندھے تیری زمین کُل کتنی ہے"؟

سورداس۔ ہجور دس بیگھے سے کچھ جیادہ (زیادہ) ہوگی۔ سرکار باپ دادوں کی یہی نشانی ہے۔ پہلے راجہ صاحب مجھ سے مول مانگتے تھے۔ جب میں نے نہ دیا تو جبر جستی (زبردستی) چھین لی۔ ہجور۔ اندھا اپاہج ہوں۔ آپ کے سوائے کس سے پھر یاد (فریاد) کروں۔ کوئی سُنے گا تو سُنے گا نہیں بھگوان تو سُنیں گے۔

جان سیوک اب یہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکے۔ باتوں باتوں میں جھگڑا ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اتفاق سے اُن کے سبھی مخالفین یکجا ہو گئے تھے مسٹر کلارک بھی صوفیہ کے ساتھ اپنی موٹر پر آ بیٹھے۔ راستہ میں جان سیوک نے کہا "کہیں راجہ صاحب نے اس اندھے کی فریاد سُن لی تو اُن کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے"۔

مسنر سیوک۔ پاجی آدمی ہے۔ اسے پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کرا دیتے؟

ایشور سیوک۔ نہیں بیٹا۔ ایسا بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ اخبار والے اس بات کا بتنگڑ بنا کر تمہیں بدنام کر دیں گے۔ یسوع! میرا مُنہ اپنے دامن میں چھپا اور اس نابکار کی زبان بند کر دے!

مسز سیوک۔ دو چار روز میں آپ ہی خاموش ہو جائے گا۔ ٹھیکہ دار والے ٹھیکہ کر لیا نہ؟

جان سیوک۔ ہاں۔ کام تو آج کل میں شروع ہو جانے والا ہے مگر اس موذی کو چپ کرانا سہل نہیں ہے۔ محلہ والوں کو تو میں نے توڑ لیا۔ وہ سب اس کی مدد نہ کریں گے۔ مگر مجھے اُمید تھی۔ کہ اُس طرف سے مدد نہ پاکر اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ یہ اُمید پوری نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے۔ بڑے جیوٹ کا آدمی ہے۔ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے راجہ صاحب کا میونسپل بورڈ میں اب وہ زور نہیں رہا ورنہ کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اُنہیں پورے سال بھر تک ممبران بورڈ کی خوشامد کرنی پڑی۔ تب جاکر یہ تجویز منظور کرا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ممبر لوگ پھر کوئی چال چلیں"

اتنے میں راجہ مہیندر کمار کا موٹر سامنے آکر رُکا۔ راجہ صاحب بولے "آپ سے خوب ملاقات ہوئی۔ میں آپ کے بنگلہ سے واپس آرہا ہوں۔ آیئے ہم اور آپ سیر کر آئیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات چیت کرنی ہے"۔

جب جان سیوک موٹر پر بیٹھ گئے تو باتیں ہونے لگیں۔ راجہ صاحب نے کہا "آپ کا سورداس تو ایک ہی بدمعاش نکلا۔ کل سے سارے شہر میں گھوم گھوم کر گاتا ہے اور ہم لوگوں کو بدنام کرتا ہے۔ اندھے گانے میں اچھے ہوتے ہی ہیں۔ اُس کا راگ بہت ہی لوچدار ہے۔ بات کی بات میں اُسے ہزاروں آدمی گھیر لیتے ہیں۔ جب خوب مجمع ہو جاتا ہے تو وہ دُہائی دیتا ہے اور ہم لوگوں کو بدنام کرتا ہے"۔ جان سیوک ابھی گرجا میں آپہنچا تھا۔ بس وہی دُہائیاں دیتا تھا۔ پروفیسر سیمین

مسٹر نیل منی وغیرہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں یہ لوگ اس کو اور بھی اکساتے ہیں۔ شاید ابھی وہیں کھڑا ہو"۔

راجہ صاحب۔ مسٹر کلارک سے تو کوئی بات چیت نہیں ہوئی؟

جان سیوک۔ موجود تو وہ بھی تھے۔ اُن کی رائے ہے کہ اندھے کو پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔ میں منع نہ کرتا تو وہ اسی وقت تھانہ دار کو لکھتے۔

راجہ صاحب۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اُن کو منع کر دیا۔ اُسے پاگل خانہ یا جیل خانہ بھیج دینا آسان ہے لیکن عوام کو یہ یقین دلانا مشکل ہے کہ اُس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی گئی۔ مجھے تو اس کی دہائیوں تہائیوں کی پرواہ نہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ہمارے کتنے دشمن ہیں۔ اگر اس کا یہی رویہ رہا تو دس پانچ دن میں ہم سارے شہر میں نکو بنجائیں گے"۔

جان سیوک۔ اقتدار اور بدنامی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اس کی فکر نہ کیجئے۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ میں نے محلہ والوں کو قابو میں لانے کے لئے بڑے بڑے وعدے کر لئے۔ جب اندھے پر کسی کا کچھ اثر ہی نہ ہوا تو میرے سارے وعدے بیکار ہو گئے۔

راجہ صاحب۔ ابھی آپ کی تو جیت ہی جیت ہے۔ ہر طرف سے گیا تو میں۔ اتنی زمین آپ کو دس ہزار سے کم میں نہ ملتی۔ دھرم سالا بنوانے میں آپ کے اسی قدر روپے لگیں گے۔ مٹی تو میری خراب ہوئی شاید زندگی میں یہ پہلا ہی موقع ہے کہ میں عوام کی نگاہوں سے گرتا ہوا نظر آتا ہوں۔ چلئے ذرا پانڈے پور تک تو چلیں۔ ممکن ہے محلہ والوں کے سمجھانے کا اب بھی کچھ اثر ہو۔

موٹر پانڈے پور کی طرف چلا۔ سڑک خراب تھی۔ راجہ صاحب نے

انجینیر کو تاکید کر دی تھی کہ سڑک کی مرمت کا بندوبست کر دیا جائے۔ مگر ابھی تک کہیں کنکر بھی نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے اپنی نوٹ بک میں درج کیا کہ جواب طلب کیا جائے۔ چنگی گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کا منشی آرام سے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور سڑک پر کئی گاڑیاں روانہ کے لئے کھڑی ہیں۔ منشی جی نے دل میں تجویز کر لیا ہے کہ نئی گاڑی ایک روپیہ لئے بغیر روانہ نہ ہونے دونگا ورنہ انہیں رات بھر یہیں کھڑا رکھوں گا۔ راجہ صاحب نے وہاں جاتے ہی گاڑی والوں کو روانہ دلا دیا۔ اور منشی کے رجسٹر میں یہ بات نوٹ کر دی۔ پانڈے پور پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ موٹر رُکا۔ دونوں صاحب اُتر کر مندر میں گئے۔ نایک رام لنگی چڑھائے بھنگ گھوٹ رہے تھے دوڑے ہوئے آئے۔ بجرنگی ناند میں پانی بھر رہا تھا۔ آکر کھڑا ہو گیا۔ سلام بندگی کے بعد جان سیوک نے نایک رام سے کہا "اندھا تو بہت بگڑا ہوا ہے"۔

نایک رام۔ سرکار۔ بگڑا تو اتنا ہے کہ جس دن سے ڈونڈی پٹی اُس دن سے گھر نہیں آیا۔ سارا دن شہر میں گھومتا ہے۔ بھجن گاتا ہے۔ اور دوہائی دیتا ہے۔

راجہ صاحب۔ تم لوگوں نے اُسے کچھ سمجھایا نہیں؟

نایک رام۔ گریب پرور۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ دوسرا آدمی ہو تو مار پیٹ کی دھمکی سے سیدھا ہو جائے مگر اُسے تو ڈر جیسے چھو ہی نہیں گیا۔ اُسی دن سے گھر نہیں آیا۔

راجہ صاحب۔ تم لوگ اُسے سمجھا بجھا کر یہاں لاؤ۔ ساری دنیا چھان ڈالی اور ایک جاہل کو قابو میں نہیں لا سکتے؟

ب رام۔ سرکار سمجھانا بجھانا تو میں نہیں جانتا۔ حکم ہو تو ہاتھ پیر
ر بٹھادوں۔ آپ ہی چپ ہو جائے گا۔
ہ صاحب۔ چھی چھی۔ کیسی باتیں کرتے ہو! میں دیکھتا ہوں
ں پانی کا نل نہیں ہے۔ تم لوگوں کو تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔
ڑ سیلوک۔ آپ یہاں نل پہنچانے کا ٹھیکہ لے لیجئے۔
ب رام۔ بڑی دیا ہے۔ گریب پرور۔ نل آجائے تو کیا کہنا ہے۔
بہ صاحب۔ تم لوگوں نے کبھی اس کے لئے درخواست ہی نہیں
ی۔

ب رام۔ سرکار یہ بستی حد سے باہر ہے۔
جہ صاحب۔ کوئی ہرج نہیں۔ نل لگا دیا جائے گا۔

اتنے میں ٹھاکر دین نے آکر کہا: "سرکار میری بھی کچھ خاطری
جائے۔" یہ کہہ کر اس نے چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے پان کے
ے دونوں صاحبوں کی خدمت میں پیش کئے۔ مسٹر سیلوک کو انگریزی
ع رکھنے پر بھی پان سے نفرت نہ تھی۔ شوق سے کھا لیا۔

راجہ صاحب منہ میں پان رکھتے ہوئے بولے "کیا یہاں لالٹینیں
ں ہیں؟ اندھیرے میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

ٹھاکر دین نے نایک رام کی طرف پُرمعنی نگاہوں سے دیکھا۔
کہہ رہا تھا کہ میرے بیڑوں نے رنگ جما دیا۔ بولا: "سرکار۔ ہم لوگوں
ون سنتا ہے؟ اب ہجور کی نگاہ ہوگئی ہے تو ٹنگ ہی جائے گی۔ بس
ر کہیں نہیں۔ اسی مندر پر ایک لالٹین لگا دی جائے۔ سادھو
اتما آتے ہیں تو اندھیرے میں انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ لالٹین سے

مندر کی سوبھا بڑھ جائے گی۔ سب آپ کو آسرباد دیں گے ۔

دونوں آدمی موٹر پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ سُبھاگی ایک سُرخ ساڑی پہنے گھونگھٹ نکالے آکر ذرا فاصلہ پر کھڑی ہو گئی گویا کچھ کہنا چاہتی ہے۔ راجہ صاحب نے پوچھا "یہ کون ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہے؟"

نایک رام۔ سرکار۔ ایک پاسن ہے۔ گیا ہے سُبھاگی۔ کچھ کہنے آئی ہے؟

سُبھاگی۔ (آہستہ سے) کوئی سُنے گا؟

راجہ صاحب۔ ہاں ہاں کہہ کیا کہتی ہے؟

سُبھاگی۔ کچھ نہیں مالک یہی کہنے آئی تھی کہ سورداس کے ساتھ بڑا انیائے (بے انصافی) ہوا ہے۔ اگر اُن کی پھریاد (فریاد) نہ سنی گئی تو وہ مرجائیں گے ۔

جان سیوک۔ اُس کے مرجانے کے ڈر سے سرکار اپنا کام چھوڑ دے؟

سُبھاگی۔ حجور سرکار کا کام پرجا کا پالنا ہے کہ اُجاڑنا؟ جب سے یہ دھرتی نکل گئی ہے۔ اُسے نہ کھانے کی سُدھ ہے نہ پینے کی۔ ہم گریب عورتوں کا تو وہی ایک سہارا ہے نہیں تو محلّہ کے مرد کبھی عورتوں کو جیتا نہ چھوڑتے۔ اور مردوں کی تو ملی بھگت ہے۔ مرد چاہے عورت کے انگ انگ۔ پور پور کاٹ ڈالے۔ اس کو کوئی منع نہیں کرتا۔ چور چور موسیرے بھائی ہو جاتے ہیں۔ وہی ایک بیچارہ سورداس تھا جو ہم گریبوں کی پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تھا ۔

بھیرو بھی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ بولا "حجور۔ سورداس نہ ہوتا تو یہ سرکار کے سامنے کھڑی نہ ہوتی۔ اسی نے جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی ۔

راجہ صاحب۔ آدمی جیوٹ کا معلوم ہوتا ہے *

نایک رام۔ جیوٹ کیا ہے سرکار۔ بس یہ سمجھئے کہ ہتیا کے بل جیتا ہے *

راجہ صاحب۔ بس یہ بات تم نے بہت ٹھیک کہی۔ ہتیا ہی کے بل جیتا ہے۔ چاہوں تو آج پکڑ وا دوں مگر سوچتا ہوں۔ اندھا ہے۔ اس پر کیا غصہ دکھاؤں۔ تم لوگ اُس کے پڑوسی ہو۔ تمہاری بات کچھ نہ کچھ سنے گا ہی۔ تم لوگ اُسے سمجھاؤ۔ نایک رام! ہم تم سے تاکید کر کے کہے جاتے ہیں *

ایک گھنٹہ رات جا چکی تھی۔ کہرا اور بھی گھنا ہو گیا تھا دو کالون کے چراغوں کے چاروں طرف کوئی موٹا کاغذ سا پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا دونوں اصحاب رخصت ہوئے مگر دونوں ہی فکر میں محو تھے۔ راجہ صاحب سوچ رہے تھے کہ دیکھیں لالٹین اور تل کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ جان سیوک کو فکر تھی کہ کہیں مجھے جیتی ہوئی بازی نہ کھونی پڑے *

(۱۹)

صوفیہ اپنے تفکرات میں اس قدر محو تھی کہ سورداس کو بالکل بھول سی گئی تھی۔ اُس کی فریاد سُن کر اُس کا دل کانپ اُٹھا۔ اس غریب آدمی پر اتنا زبردست ظلم۔ اُس کا دردمند دل اسے برداشت نہ کر سکا۔ سوچنے لگی۔ سورداس کو اس مصیبت سے کیونکر نجات دلاؤں؟ اگر پاپا سے کہوں تو وہ ہرگز نہ سنیں گے۔ انہیں اپنے کارخانہ کی ایسی دُھن سوار ہے کہ وہ اس بارہ میں میری زبان سے ایک لفظ بھی سننا پسند نہ کریں گے بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے طے کیا کہ چل کر اندو سے عرض کروں

اگر وہ راجہ صاحب سے زور دے کر کہے گی تو ممکن ہے کہ راجہ صاحب مان جائیں۔ باپ سے مخالفت کرتے اُسے بہت افسوس ہوتا تھا لیکن اُس کی مذہبی نگاہ میں رحم کی عظمت اس قدر مسلّمہ تھی جس کے مقابلہ میں باپ کے نفع یا نقصان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راجہ صاحب غریب نواز ہیں اور انہوں نے سورداس پر صرف مسٹر کلارک کی خاطر سے یہ ظلم کیا ہے۔ جب اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں اِس کام کے لئے اُن کی ذرا بھی ممنون نہ ہوں گی تو شاید وہ اپنے فیصلہ کی نظرثانی پر آمادہ ہو جائیں۔ یہاں جوں ہی یہ بات کھلے گی۔ سارا گھر میرا دشمن ہو جائے گا مگر اُس کی کیا پروا؟ اس خیال سے میں اپنا فرض تو نہیں ترک کر سکتی ؞

اسی حیص بیص میں تین روز گزر گئے۔ چوتھے روز علی الصباح وہ اندو سے ملنے کو چلی۔ سواری کرایہ کی تھی۔ وہ سوچتی جاتی تھی کہ میں جوں ہی قدم اندر رکھوں گی اندو دوڑ کر گلے سے لپٹ جائے گی۔ اور شکایت کرے گی کہ اتنے دنوں بعد کیوں آئیں؟ ممکن ہے وہ آج مجھے آنے بھی نہ دے۔ وہ راجہ صاحب کو ضرور رضامند کر لے گی۔ نہ جانے پاپا نے راجہ صاحب کو کیونکر چکمہ دیا ؞

یہی سوچتے سوچتے وہ راجہ صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔ اندو کو خبر دی۔ اُس کو یقین تھا کہ اندو خود آکر اُسے لے جائے گی لیکن پندرہ منٹ تک انتظار کرنے پر ایک خادمہ آئی اور اُسے اندر لے گئی ؞

صوفیہ نے جا کر دیکھا کہ اندو اپنے نشستگاہ میں دوشالہ اوڑھے انگیٹھی کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ صوفیہ نے اندر قدم رکھا

تو بھی اندو کرسی سے نہ اُٹھی۔ صوفیہ نے ہاتھ بڑھایا تو بھی بیرخی سے ہاتھ بڑھا دینے کے سوا اندو مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ صوفیہ نے سمجھا اُس کی طبیعت ناساز ہے۔ بولی "سر میں درد ہے کیا؟"

اُس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ بیماری کے سوا اس بے اعتنائی کا اور بھی کوئی سبب ہو سکتا ہے ؞

اندو نے دھیمی آواز میں کہا "نہیں۔ اچھی تو ہوں۔ اس ٹھنڈ میں تو تمہیں بڑی تکلیف ہوئی"؞

صوفیہ خود دار عورت تھی۔ اندو کی اس بے اعتنائی سے اُس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ اُلٹے قدم واپس جاؤں مگر یہ سوچ کر کہ ایسا کرنا بہت مضحکہ خیز ہوگا اس نے ہمت کر کے ایک کرسی کھینچی اور اُسی پر بیٹھ گئی ؞

صوفیہ۔ آپ سے ملے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ؞

اندو۔ ہاں مجھے آنے جانے کی فرصت کم رہتی ہے۔ منڈیا ہوں کی رانی صاحبہ ایک مہینہ میں تین مرتبہ آ چکی ہیں پر میں ایک دفعہ بھی نہیں جا سکی ؞

صوفیہ دل میں ہنستی ہوئی طنز سے بولی "جب رانیوں کو یہ بات نہیں حاصل ہوتی تو میں کس شمار میں ہوں۔ کیا کچھ ریاست کا کام بھی دیکھنا پڑتا ہے"؟

اندو۔ کچھ نہیں بلکہ سب کچھ۔ راجہ صاحب کو قومی کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تو گھر کا کام دیکھنے والا بھی تو کوئی چاہئے۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ جب اُنہیں کاموں کے بدولت اُن کی وہ عزت ہے جو بڑے

ست بڑے حکام کو بھی نہیں ملتی تو اُن سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتی۔
صوفیہ ہنوز نہ سمجھ سکی کہ اندو کی ناراضگی کا سبب کیا ہے۔ بولی۔
"آپ بڑی خوش نصیب ہیں کہ اس طرح اُن کے نیک کاموں میں شریک ہو سکتی ہو۔ راجہ صاحب آج سارے میں نیک نام ہو رہے ہیں مگر بُرا نہ مانئے گا۔ کبھی کبھی وہ بھی منہ دیکھی کر جاتے ہیں اور بڑوں کے سامنے چھوٹوں کا خیال نہیں کرتے۔"
اندو۔ غالباً یہ اُن کی پہلی شکایت ہے جو میرے کان تک پہنچی ہے۔
صوفیہ۔ ہاں بدقسمتی سے یہ کام میرے ہی سر پڑا۔ سورداس کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ راجہ صاحب نے اُس کی زمین پا کو دے دی ہے اندھا بیچارہ آج کل کوچہ کوچہ دُوہائی دیتا پھرتا ہے۔ باپ کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا میرے لئے باعثِ شرم ہے۔ یہ میں خوب سمجھتی ہوں۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اس موقع پر راجہ صاحب کو ایک بیکس شخص پر زیادہ رحم کرنا چاہئے تھا۔
اندو نے صوفیہ کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھ کر کہا "آج کل باپ سے بھی اَن بَن ہے کیا؟"
صوفیہ نے غرور سے کہا "انصاف اور فرض کے سامنے باپ لڑکا یا شوہر کی جانبداری نہ کی جائے تو کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔"
اندو۔ تو تمہیں پہلے اپنے آپ ہی کو ٹھیک راستہ پر لانا چاہئے تھا۔ راجہ صاحب نے جو کچھ کیا تمہاری خاطر سے کیا اور تمہیں اُن پر الزام رکھتی ہو۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ انہیں مسٹر سیوک، مسٹر کلارک یا دنیا کے کسی اور شخص سے دبنے کی ضرورت نہیں ہے مگر اُس وقت انہوں

نے تمہارے پاپا کا خیال نہ کیا ہوتا تو شاید سب سے پہلے تمہیں اُن پر احسان فراموشی کا الزام عاید کرتیں۔ سورداس پر یہ ستم اِس لئے ڈھایا گیا کہ تم نے ایک نازک موقع پر رونے کی حفاظت کی ہے اور تم اپنے پاپا کی بیٹی ہو۔

صوفیہ یہ سخت الفاظ سُن کر تلملا گئی۔ بولی "اگر میں جانتی کہ میری ناچیز خدمت کا صلہ اس طرح دیا جائے گا تو شاید ونے سنگھ کے نزدیک نہ جاتی۔ معاف کیجئے مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ تمہارے پاس یہ شکایت لے کر آئی۔ سُنا کرتی تھی کہ امراء کے مزاج میں تلوّن ہوتا ہے آج اُس کی تصدیق ہو گئی۔ لیجئے جاتی ہوں مگر اتنا کہے جاتے ہوں کہ خواہ پاپا میری صورت سے بھی بیزار ہو جائیں لیکن میں اس معاملہ میں ہرگز خاموش نہ بیٹھوں گی"۔

اندو کچھ نرم ہو کر بولی "آخر تم راجہ صاحب سے کیا چاہتی ہو؟"

صوفیہ۔ کیا ثروت سے عقل بھی کم ہو جاتی ہے۔

اندو۔ میں پیادہ سے وزیر نہیں بنی ہوں۔

صوفیہ۔ افسوس کہ آپ نے اب تک میرا مطلب نہ سمجھا۔

اندو۔ افسوس کرنے سے تو مطلب میری سمجھ میں نہ آئے گا۔

صوفیہ۔ میں چاہتی ہوں کہ سورداس کی زمین اُس کو لوٹا دی جائے۔

اندو۔ تم جانتی ہو۔ اِس میں راجہ صاحب کی کتنی سُبکی ہوگی۔

صوفیہ۔ سُبکی بے انصافی سے بہتر ہے۔

اندو۔ یہ بھی جانتی ہو کہ جو کچھ ہوا وہ تمہارے...... مسٹر کلارک کی ترغیب سے ہُوا؟

صوفیہ۔ یہ تو نہیں جانتی کیونکہ اس بارہ میں میری اُن سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ لیکن جانتی بھی تو راجہ صاحب کی بدنامی کے خیال سے پہلے راجہ صاحب ہی سے منت سماجت کرنا ٹھیک سمجھتی۔ اپنی غلطی اپنے ہی ہاتھوں درست ہو جائے تو یہ اُس سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی دوسرا اُسے درست کرے۔

اندر کو چوٹ لگی۔ سمجھی کہ یہ مجھے دھمکی دے رہی ہے۔ مسٹر کلارک کے بل پر اتنا گھمنڈ! تن کر بولی "میں نہیں سمجھتی کہ کسی سرکاری افسر کو بورڈ کے فیصلہ میں بھی دخل دینے کا مجاز ہے اور چاہے ایک غریب اندھے پر ظلم کیوں نہ کرنا پڑے۔ راجہ صاحب اپنے فیصلہ کو بحال رکھنے کے لئے کوئی بات اُٹھا نہ رکھیں گے۔ حقیر انصاف کے مقابلہ میں راجہ کی عزت کہیں زیادہ وقعت کی چیز ہے"۔

صوفیہ نے دردناک لہجہ میں کہا "اسی حقیر انصاف کے لئے صادق پسند لوگوں نے سر کٹا دیئے ہیں"۔

اندو نے کرسی کے بازو پر ہاتھ ٹیک کر کہا "انصاف کا سوانگ بھرنے کا زمانہ اب نہیں رہا"۔

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "اس تکلیف دہی کے لئے معاف فرمائیے گا"۔

اندو انگیٹھی کی آگ کو اکسانے لگی۔ اُس نے صوفیہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

صوفیہ وہاں سے چلی تو اندو کی کج خلقی سے اس کا نازک دل زخمی ہو رہا تھا۔ سوچتی جاتی تھی کہ وہ شگفتہ رو، خلیق اور خوش مزاج

اندو کہاں ہے؟ کیا دولت و ثروت سے انسان کا مزاج بھی اتنا بگڑ جاتا ہے؟ میں نے تو آج تک اس کا دل دکھانے والی بات نہیں کہی کیا میں ہی کچھ اور ہو گئی ہوں یا وہی کچھ اور ہو گئی ہے؟ اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ بات کرنا تو دور۔ اُس نے اور صلواتیں سُنائیں۔ میں اس پر کتنا اعتبار کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ دیوی ہے۔ آج اس کی اصلی صورت نظر آئی۔ لیکن میں اُس کی ثروت کے سامنے کیوں سر جھکاؤں؟ اس نے بلا سبب اور بلا واسطہ میری تحقیر کی۔ شاید رانی صاحبہ نے اُس کے کان بھرے ہوں۔ لیکن شرافت بھی تو کوئی چیز ہے:

صوفیہ نے اُسی وقت اس توہین کا پورا بلکہ پورے سے بھی زیادہ بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اُس نے یہ خیال نہ کیا کہ ممکن ہے اس وقت کسی سبب سے اس کا دل مغموم رہا ہو یا کسی حادثہ کے باعث اُس کے سکون میں فرق آ گیا ہو۔ اس نے سوچا۔ ایسی ناشائستگی ایسی بدسلوکی کے لئے سخت سے سخت دماغی تکلیف بڑے سے بڑے مالی نقصان۔ شدید سے شدید جسمانی درد کا عذر بھی کافی نہیں۔ اِسے اپنی امارت کا غرور ہے۔ میں دکھا دوں گی۔ کہ یہ آفتاب کی ذاتی روشنی نہیں بلکہ ماہتاب کی عارضی ضیا ہے۔ اِس کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ راجہ اور رئیس سب کے سب حکمران قوت کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں جنہیں وہ اپنی مرضی کے موافق بناتی یا بگاڑتی رہتی ہے:

دوسرے ہی روز صوفیہ نے اپنی چال چلنا شروع کر دیا۔ مسٹر کلارک سے اُس کی محبت بڑھنے لگی۔ نفرت کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی

بن گئی۔ اب اُن کی محبت بھری باتوں کو سر جھکا کر سنتی۔ اُن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتی کہ تم نے یہ محبت کرنا کس سے سیکھا؟ دونوں اب ہمیشہ ساتھ نظر آتے۔ صوفیہ دفتر میں بھی صاحب بہادر کا گلا نہ چھوڑتی۔ بار بار خط بھیجتی "جلد آؤ۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں"۔ اور سارا عشق و محبت کا کھیل صرف اس لئے تھا کہ اندو سے ہتک کا انتقام لے سکوں۔ انصاف کوشی کا اب اُس کو ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ صرف اندو کا گھمنڈ توڑنا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ مسٹر کلارک کو پانڈے پور کی طرف سیر کرانے لے گئی۔ جب موٹر گودام کے سامنے سے ہو کر گزرا تو اُسے اینٹ اور کنکر کے ڈھیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا "پاپا نہایت عجلت سے کام کر رہے ہیں"۔

کلارک۔ ہاں مستعد آدمی ہیں۔ مجھے تو اُن کی محنت و جفاکشی پر رشک ہوتا ہے۔

صوفی۔ پاپا نے دھرم۔ ادھرم کا خیال نہیں کیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو یہی کہوں گی کہ اندھے کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔

کلارک۔ ہاں بے انصافی تو ہوئی۔ میرا جی تو بالکل نہ چاہتا تھا۔

صوفی۔ تو آپ نے کیوں اپنی منظوری دے دی؟

کلارک۔ کیا کرتا؟

صوفی۔ نامنظور کر دیتے۔ صاف لکھ دینا چاہئے کہ اس کام کے لئے کسی کی زمین ضبط نہیں کی جاسکتی۔

کلارک۔ تم ناراض نہ ہو جاتیں؟

صوفی۔ ہرگز نہیں۔ آپ نے شاید مجھے اب تک نہیں پہچانا ۔

کلارک۔ تمہارے پاپا تو ضرور ہی ناراض ہو جاتے ۔

صوفی۔ میں اور پاپا ایک نہیں ہیں۔ میرے اور اُن کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔

کلارک۔ اتنی عقل ہوتی تو اب تک تمہیں کب کا اپنا ہی بنا لیا ہوتا میں تمہارے مزاج یا اصولوں سے واقف نہ تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہ منظوری میرے لئے نفع بخش ہو ۔

صوفی۔ تو خلاصہ یہ کہ میں ہی اس ناانصافی کا سبب ہوں۔ راجصاحب نے مجھے خوش کرنے کے لئے بورڈ میں یہ تجویز پیش کی۔ آپ نے بھی مجھی کو خوش رکھنے کے لئے یہ منظوری دے دی۔ آپ صاحبوں نے میری مٹی ہی پلید کر دی ۔

کلارک۔ تم میرے اصولوں سے واقف ہو۔ میں نے اپنے اوپر بہت جبر کرکے یہ تجویز منظور کی ہے ۔

صوفی۔ آپ نے اپنے اوپر جبر نہیں کیا ہے بلکہ میرے اوپر کیا ہے اور آپ کو اس کا کفارہ کرنا ہوگا ۔

کلارک۔ میں نہ جانتا تھا کہ تم اتنی انصاف پسند ہو ۔

صوفی۔ میری تعریف کر دینے سے اُس گناہ کا کفارہ نہ ہوگا ۔

کلارک۔ میں اندھے کو کسی دوسرے گاؤں میں اتنی ہی زمین دلا دونگا ۔

صوفیہ۔ کیا اُسی کی زمین اُسی کو واپس نہیں دی جا سکتی ؟

کلارک۔ مشکل ہے ۔

صوفیہ۔ ناممکن تو نہیں ہے ۔

کلارک۔ ناممکن سے کچھ ہی کم ہے ÷

صوفی۔ تو سمجھ گئی۔ ناممکن نہیں ہے۔ آپ کو یہ کفارہ کرنا ہی ہوگا۔ کل ہی اس تجویز کو منسوخ کر دیجئے ÷

کلارک۔ پیاری تمہیں معلوم نہیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا ÷

صوفیہ۔ مجھے اس کی فکر نہیں۔ پاپا کو برا لگے گا۔ لگے۔ راجہ صاحب کی سبکی ہوگی۔ ہو۔ میں کسی کے نفع یا عزت کے خیال سے اپنے اوپر گناہ کا بوجھ کیوں لوں؟ کیوں خدائی سزا کی مستوجب بنوں؟ آپ لوگوں نے میری مرضی کے خلاف میرے سر پر ایک گناہ عظیم کا بار رکھ دیا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کو اندھے کی زمین لوٹا دینی ہوگی ÷

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سید طاہر علی نے صوفیہ کو موٹر پر بیٹھے جاتے ہوئے دیکھا۔ فوراً آکر سامنے کھڑے ہوگئے اور سلام کیا۔ صوفی نے موٹر روک کر پوچھا "کہئے منشی جی۔ عمارت بننے لگی"؟

طاہر۔ جی ہاں۔ کل داغ بیل پڑے گی پر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی ÷

صوفیہ۔ کیوں۔ کیا کوئی واردات ہوگئی؟

طاہر۔ حضور جب سے اس اندھے نے شہر میں آہ و فریاد شروع کی ہے اس وقت سے عجیب مصیبت کا سامنا ہوگیا۔ محلہ والے تو اب نہیں بولتے مگر شہر کے شہدے لچے روزانہ آکر مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ کوئی گھر میں آگ لگانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ کوئی لوٹ لینے کو دوڑتا ہے اور کوئی مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ آج صبح کئی سو آدمی لاٹھیاں لئے

آگئے اور گودام کو گھیر لیا۔ کچھ لوگ سیمنٹ اور چونہ کے ڈھیروں کو بکھیرنے لگے اور کئی آدمی پتھر کی سلوں کو توڑنے لگے۔ میں تنہا کیا کر سکتا تھا؟ یہاں کے مزدور خوف کے مارے جان لے کر بھاگے۔ قیامت کا سامنا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ اب آن کی آن میں محشر برپا ہو جائے گا۔ دروازہ بند کئے بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ ہنگامہ فرو ہو۔ بارے دعا قبول ہوئی۔ عین اسی وقت وہ اندھا نہ جانے کدھر سے آنکلا اور بجلی کی طرح کڑک کر بولا "بھائیو! تم لوگ اودھم مچا کر مجھے کیوں کلنک لگا رہے ہو؟ آگ لگانے سے میرے دل کی آگ نہ بجھے گی۔ لہو بہانے سے میرا دل شانت نہ ہوگا۔ آپ لوگوں کی دعا سے یہ آگ اور یہ جلن شانت ہوگی۔ پرماتما سے کہئے میرا دکھ مٹائیں۔ بھگوان سے بنتی کیجئے۔ میرا سنکٹ ہریں۔ جنہوں نے مجھ پر جلم (ظلم) کیا ہے ان لوگوں کے دل میں دیا دھرم جاگے۔ بس میں آپ لوگوں سے اور کچھ نہیں چاہتا" اتنا سنتے ہی کچھ لوگ تو ہٹ گئے مگر کتنے ہی لوگ بگڑ کر بولے "تم دیوتا ہو تو بنے رہو۔ ہم دیوتا نہیں ہیں۔ ہم تو جیسے کے ساتھ تیسا کریں گے۔ انہیں بھی تو غریبوں پر ظلم کرنے کا مزہ مل جائے"۔ یہ کہہ کر وہ لوگ پتھروں کو اٹھا اٹھا کر پٹکنے لگے۔ اس وقت اس اندھے نے وہ کام کیا جو اولیا ہی کر سکتے ہیں۔ حضور مجھے تو یہ یقین کامل ہوگیا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے۔ اس کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اس کی تصویر ابھی تک آنکھوں میں کھنچی ہوئی ہے۔ اس نے زمین سے ایک بڑا پتھر کا ٹکڑا اٹھا لیا اور اسے اپنی پیشانی کے سامنے رکھ کر بولا "اگر تم لوگ اب بھی میری بنتی نہ سنو گے تو

اسی دم اس پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دوں گا۔ مجھے مرجانا منظور ہے پر یہ اندھیر نہیں دیکھ سکتا"۔ اُس کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا وہ وہیں بُت بن گیا۔ ذرا دیر میں لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے اور کوئی نصف گھنٹہ میں سارا مجمع غائب ہو گیا۔ پھر سورداس اُٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا۔ حضور مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ انسان نہیں۔ کوئی فرشتہ ہے۔

صوفیہ۔ اُس کو کسی سے ان مفسدوں کی یورش کی خبر مل گئی ہوگی۔

طاہر۔ حضور میرا تو گمان ہے کہ اُسے علم غیب ہے۔

صوفیہ۔ (مسکرا کر) آپ نے پاپا کو اس کی اطلاع نہیں دی؟

طاہر۔ حضور جب سے موقع ہی نہیں ملا۔ خود بال بچوں کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ آدمی سب پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ اسی فکر میں کھڑا تھا کہ حضور کا موٹر نظر آیا۔

کلارک۔ یہ اندھا ضرور کوئی غیر معمولی انسان ہے۔

صوفیہ۔ تم اُس سے دو چار باتیں کر کے دیکھو۔ اُس کے روحانی اور فلسفیانہ خیالات معلوم کر کے دنگ رہ جاؤ گے۔ فقیر بھی ہے اور فلسفی بھی۔ کاش ہم اُس کے فلسفہ پر عمل کر سکتے تو یقیناً یہ زندگی آرام سے گزرتی۔ جاہل ہے۔ بالکل اَن پڑھ۔ لیکن اُس کا ایک ایک فقرہ علماء کی بڑی بڑی کتب سے زیادہ وزن دار ہے۔

موٹر چلا تو صوفیہ بولی "آپ لوگ ایسے سادھوؤں پر بھی ظلم کرنے سے باز نہیں آتے جو اپنے دشمنوں پر ایک کنکر بھی اُٹھا کر نہیں

پھینکتا۔ حضرت یسوع میں بھی تو یہی بہترین صفت تھی"۔

کلارک۔ پیاری۔ اب شرمندہ نہ کرو۔ اس کی تلافی ضرور ہوگی۔

صوفیہ۔ راجہ صاحب اُس کی پُر زور مخالفت کریں گے۔

کلارک۔ اوہ۔ اُن میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں۔ ہمارا رُخ دیکھ کر کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُنہیں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ ہاں اُن میں یہ خاص صفت ہے کہ وہ ہماری تجاویز میں کچھ ترمیم کرکے اپنا کام بنا لیتے ہیں اور اُنہیں عوام کے سامنے ایسی ہوشیاری سے پیش کرتے ہیں کہ عوام کی نگاہوں میں اُن کی وقعت زیادہ ہوجاتی ہے۔ ہندوستانی رئیسوں اور مدبروں میں اپنے پر بھروسہ رکھنے والی قوت کی بہت کمی ہے۔ وہ ہماری مدد سے وہ کر سکتے ہیں جو ہم نہیں کرسکتے مگر بلا ہماری مدد کے وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے"۔

موٹر بنگلہ آپہنچا۔ صوفیہ اُتر پڑی۔ کلارک نے اُسے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

(۳۰)

مسٹر کلارک نے موٹر سے اُترتے ہی اردلی کو حکم دیا کہ ڈپٹی صاحب کو فوراً ہمارا سلام دو۔ ناظر۔ اہلمد اور دیگر اہلکاروں کو بھی طلب کیا گیا۔ سب کے سب گھبرا گئے۔ "یہ آج خلاف معمول طلبی کیسی؟ کسی غلطی کی گرفت تو نہیں کی گئی؟ کسی نے رشوت کی شکایت تو نہیں کردی؟" بیچاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ڈپٹی صاحب برہم ہوکر بولے "میں کوئی صاحب کا ذاتی ملازم نہیں ہوں کہ جب چاہا طلب کرلیا۔ کچہری کے وقت کے اندر جتنی

بار چاہیں طلب کریں لیکن یہ کون سی بات ہے کہ جب جی میں آیا سلام بھیج دیا۔" ارادہ کیا کہ نہ جاؤں پر اتنی ہمت کہاں کہ صاف صاف انکار کردیں۔ بیماری کا حیلہ کرنا چاہا مگر اردلی نے کہا "حضور اس وقت نہ چلیں گے تو صاحب سخت ناراض ہوں گے۔ کوئی بہت ضروری کام ہے جبھی تو موٹر سے اترتے ہی آپ کو سلام دیا۔"

آخر ڈپٹی صاحب کو مجبوراً جانا پڑا۔ چھوٹے عملاؤں نے ذرا بھی چون و چرا نہ کیا۔ اردلی کی صورت دیکھتے ہی حقہ چھوڑا۔ چپکے سے کپڑے پہنے۔ بچوں کو دلاسا دیا اور "حکم حاکم مرگ مفاجات" سمجھ کر رواں دواں بنگلہ پر جا پہنچے۔ صاحب کے سامنے جاتے ہی ڈپٹی صاحب کا سارا غصہ کافور ہوگیا۔ اشاروں پر دوڑنے لگے۔ مسٹر کلارک نے سورداس کے زمین والے مقدمہ کی مسل منگوائی۔ اُسے نہایت غور سے پڑھوا کر سنا۔ پھر ڈپٹی صاحب سے راجہ مہیندر کمار کے نام ایک پروانہ لکھوایا جس کا مطلب یہ تھا "پانڈے پور میں سگریٹ کے کارخانہ کے لئے جو زمین لی گئی ہے وہ اُس قانونی دفعہ کے منشاء کے خلاف ہے اس لئے میں اپنے حکم کو منسوخ کرتا ہوں۔ مجھے اس معاملہ میں دھوکا دیا گیا ہے اور ایک شخص کے ذاتی نفع کے لئے قانون کا ناجائز استعمال کیا گیا ہے۔"

ڈپٹی صاحب نے دبی زبان سے اعتراض کیا "حضور۔ اب آپ کو اُس حکم منسوخ کر دینے کا اختیار نہیں کیونکہ سرکار نے اُس کی تصدیق کردی ہے۔"

مسٹر کلارک نے سخت لہجہ میں کہا "ہمیں سرکار ہیں۔ ہم نے وہ قانون

بنا بات ہے۔ ہم کو سب اختیار ہے۔ آپ ابھی راجہ صاحب کو پروانہ لکھ دیں۔ کل لوکل گورنمنٹ کو اُس کی نقل بھیج دیجئے گا۔ ضلع کے مالک ہم ہیں۔ صوبہ کی سرکار نہیں۔ یہاں بلوہ ہو جائے گا تو ہم کو اُس کا انتظام کرنا پڑے گا۔ صوبہ کی سرکار یہاں دوڑی نہ آئے گی "۔

عمال تھرا اُٹھے۔ ڈپٹی صاحب کو دل ہیں کو سنے لگے۔ یہ کیوں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں۔ انگریز ہیں۔ کہیں غصہ میں آکر مار بیٹھے تو اُس کا کیا ٹھکانا؟ ضلع کا بادشاہ ہے جو چاہے کرے۔ ہم سے کیا واسطہ؟

ڈپٹی صاحب کا سینہ بھی دہل گیا۔ پھر زبان نہ کھلی۔ پروانہ تیار ہو گیا۔ صاحب نے اُس پر دستخط کئے۔ اُسی وقت ایک اردلی پروانہ لے کر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا۔ ڈپٹی صاحب یہاں سے اُٹھے تو مسٹر جان سیوک کو اس حکم سے مطلع کر دیا۔

جان سیوک کھانا کھا رہے تھے۔ یہ خبر سُنی تو بھوک غائب ہو گئی۔ بولے "یہ مسٹر کلارک کو کیا سُوجھی؟" مسز سیوک نے صوفیہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "تو نے انکار تو نہیں کر دیا؟ ضرور کچھ گول مال کیا ہے"۔

صوفیہ نے سر جھکا کر کہا "بس آپ کا غصہ مجھی پر رہتا ہے۔ جو کچھ کرتی ہوں میں ہی کرتی ہوں"۔

ایشور سیوک۔ خداوند یسوع! مجھ گنہگار کو اپنے دامن میں چھپا! میں آخیر تک منع کرتا رہا کہ بڑھے کی زمین نہ لو مگر کون سنتا ہے؟ دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ تو سٹھیا گیا ہے مگر میں نے دنیا دیکھی ہے راجہ ڈر کر کلارک کے پاس گیا ہوگا۔

پربھوسیوک - میرا بھی یہی خیال ہے - راجہ صاحب نے خود مسٹر کلارک سے کہا ہوگا - آج کل اُن کا شہر میں نکلنا مشکل ہو رہا ہے - اندھے نے سارے شہر میں ہل چل مچا دی ہے ۔

جان سیوک - میں سوچ رہا تھا کہ کل حفظِ امن کے لئے پولیس کا دستہ مانگوں گا - اِدھر یہ گل کھلا - کچھ عقل کام نہیں کرتی کہ کیا بات ہو گئی ۔

پربھوسیوک - میں تو سمجھتا ہوں - ہمارے لئے اس زمین کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا - آج سورداس نہ پہنچ جاتا تو گودام کی خیریت نہ تھی - ہزاروں روپے کا سامان خراب ہو جاتا یہ فساد رفع ہونیوالا نہیں ہے ۔

جان سیوک نے اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا "ہاں بہت اچھی بات ہے - ہم سب مل کر اس اندھے کے پاس چلیں اور اس کے قدموں پر سر جھکائیں - آج اس کے خوف سے زمین چھوڑ دوں - کل چمڑے کی آڑھت چھوڑ دوں اور اس کے بعد منہ چھپا کر یہاں سے کہیں چلا جاؤں - کیوں - یہی صلاح ہے نہ؟ پھر امن ہی امن ہے - نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا - یہ صلاح تمہیں مبارک ہو - دنیا امن کی جگہ نہیں بلکہ کارزار کی جگہ ہے - یہاں دلیر دل اور بہادروں کی فتح ہوتی ہے - کمزور اور بزدل مارے جاتے ہیں - مسٹر کلارک اور راجہ مہیندر کمار کی ہستی ہی کیا ہے - ساری دنیا بھی اب اس زمین کو میرے ہاتھوں سے نہیں چھین سکتی - میں سارے شہر میں ہل چل مچا دوں گا - اور ہندوستان بھر کو ہلا ڈالوں گا - حکام کی خود مختارانہ روش کی یہ مثال ملک کے

سبھی اخباروں میں شائع ہو گی۔ کونسلوں اور مجلسوں میں ایک نہیں ہزار ہزار آوازوں کے ذریعہ مشتہر کی جائے گی۔ اور اُس کی گونج انگریزی پارلیمنٹ تک پہنچے گی۔ یہ تو می حرفت اور تجارت کا سوال ہے۔ اس معاملہ میں کُل ہندوستان کے کارخانہ دار کیا ہندوستانی اور کیا انگریز میرے معاون و مددگار ہوں گے اور سرکار ایسی نافہم نہیں ہے کہ وہ کارخانہ داروں کی مشترکہ آواز پر کان بند کر لے۔ یہ سرمایہ کی حکومت کا دور ہے۔ یورپ میں بڑی بڑی سلطنتیں سرمایہ داروں کے اشاروں پر بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ کسی گورنمنٹ کی مجال نہیں کہ اُن کی مرضی کے خلاف عمل کرے۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں وہ ملایم چارہ نہیں ہوں جسے کلارک اور مہیندر چر جائیں گے ؟

پربھو سیوک تو ایسے سٹ پٹائے کہ پھر زبان نہ کھلی۔ چپکے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ صوفیہ بھی ایک لمحہ کے لئے سناٹے میں آگئی پھر سوچنے لگی۔ اگر پاپا نے اس معاملہ میں کچھ تحریک کی بھی تو اُس کا نتیجہ کہیں برسوں میں ظاہر ہوگا۔ اور یہی کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ابھی سے اُس کی کیوں فکر کروں ؟ اُس کے گلابی ہونٹوں پر فاتحانہ غرور کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس وقت وہ اندو کے چہرہ کا اُڑا ہوا رنگ دیکھنے کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر سکتی تھی۔ "کاش میں وہاں موجود ہوتی دیکھتی کہ اندو کے چہرہ پر کیسی جھیپ ہے۔ خواہ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق ہو جاتا۔ مگر اتنا ضرور کہتی کہ دیکھا اپنے راجہ صاحب کا اقتدار و اختیار۔ بس اسی پر اتنا اتراتی تھیں ؟ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ کلارک اتنی عجلت کر بیٹھیں گے ؟"

کھانے سے فارغ ہوکر وہ اپنے کمرہ میں گئی اور رانی اندو کی خفت کا خیال کر کے بے حد لطف اٹھانے لگی۔ راجہ صاحب بدحواس چہرہ کا رنگ اڑا ہوا۔ آ کر اندو کے پاس بیٹھ جائیں گے۔ آنند دیوی لفافہ دیکھیں گی۔ آنکھوں پر اعتبار نہ ہوگا۔ پھر روشنی تیز کر کے دیکھیں گی تب راجہ کے آنسو پونچھیں گی" آپ ناحق اس قدر غمگین ہوتے ہیں آپ اپنی طرف سے شہر میں منادی کرا دیجئے کہ ہم نے سود رواس کی زمین سرکار سے لڑ کر واپس دلا دی۔ سارے شہر میں آپ کے انصاف کی دھوم مچ جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے آپ نے رائے عامہ کی قدر کی ہے خوشامدی ٹٹو کہیں کا! چال سے ولیم کو اُلّو بنانا چاہتا تھا۔ ایسی منہ کی کھائی ہے کہ یاد ہی کرے گا۔ خیر آج نہ سہی۔ کل پرسوں اترسوں کبھی تو اندو سے ملاقات ہوگی ہی۔ کہاں تک مُنہ چھپائیں گی؟

یہ سوچتے سوچتے صوفیہ میز پر بیٹھ گئی اور اس واقعہ پر ایک ہنسی کا ڈراما لکھنے لگی۔ سمند فکر کے لئے حسد تازیانہ کا کام دیتی ہے صوفیہ نے آج تک کبھی ایسا ڈراما نہ لکھا تھا مگر اس وقت حسد کے اثر سے اُس نے ایک گھنٹہ کے اندر چار منظروں کا ایک مضحکہ انگیز ڈراما لکھ ڈالا۔ ایسی ایسی چوٹ کرنے والی اور دل میں چٹکیاں لینے والی پھبتیاں قلم سے نکلیں کہ اُسے اپنے ذہن کی رسائی پر خود ہی متحیر ہونا پڑا۔ اُسے ایک بار یہ خیال آیا کہ میں کیا حماقت کر رہی ہوں فتح پا کر ہارے ہوئے دشمن کا مُنہ چڑانا پرلے سرے کا کمینہ پن ہے لیکن حسد نے اُس کو مطمئن کر دینے کے لئے یہ دلیل ڈھونڈ نکالی۔ ایسے فریبی۔ دغاباز۔ عزت کے بھوکے رعایا کے دوست بن کر اُس

کے حلق پر چھُری پھیرنے والے خوشامدی رئیسوں کی یہی سزا ہے۔
یہی اُن کا واحد مصلح ہے۔ عوام الناس کی نگاہوں میں ذلیل ہو
جانے کا خوف ہی اُنہیں راہِ راست پر قائم رکھ سکتا ہے۔ رسوائی
کا خوف نہ ہو تو وہ شیر ہو جائیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھیں۔
پربھوسیوک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔
یکا یک صوفیہ نے آ کر جگایا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھے اور یہ سمجھ کر کہ شاید
اُس کے کمرہ میں چور گھس آئے ہیں۔ دروازہ کی طرف دوڑے۔ گودام
کا واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ صوفیہ نے ہنستے ہوئے اُن کا ہاتھ
پکڑ لیا اور پوچھا "کہاں بھاگے جاتے ہو؟"
پربھوسیوک۔ کیا چور ہیں؟ لالٹین جلا لوں۔
صوفیہ۔ چور نہیں ہیں۔ ذرا میرے کمرہ میں چلو۔ تمہیں ایک چیز
سناؤں۔ ابھی لکھی ہے۔
پربھوسیوک۔ واہ۔ اتنی سی بات کے لئے نیند خراب کر دی۔ کیا
پھر سویرا نہ ہوتا؟ کیا لکھا ہے؟
صوفیہ۔ ایک مضحکہ خیز ڈراما ہے۔
پربھوسیوک۔ مضحکہ خیز ڈراما؟ تم نے ایسا ڈراما لکھنے کی کب
سے مشق کی؟
صوفیہ۔ آج ہی بہت ضبط کیا کہ صبح سناؤں گی پر نہ رہا گیا۔
پربھوسیوک صوفیہ کے کمرہ میں گئے اور ایک ہی لمحہ میں دونوں نے
قہقہے لگانے شروع کئے۔ لکھتے وقت صوفیہ کو جن فقرات پر ذرا
بھی ہنسی نہ آئی تھی اُنہیں کو پڑھتے وقت اُس کی ہنسی روکے نہ رکتی

تھی۔ جب کوئی ہنسانے والی بات آجاتی تو صوفی پہلے ہی ہنس پڑتی۔ پربھو سیوک مُنہ کھولے ہوئے اُس کی طرف تاکتا۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آتی مگر اُس کی ہنسی پر وہ بھی ہنستا اور جونہی بات سمجھ میں آجاتی تو یہی ہنسی قہقہہ کی شکل اختیار کر لیتی۔ دونوں کے چہرے سُرخ ہو گئے آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ یہاں تک کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔ ڈراما کے ختم ہوتے ہوتے قہقہہ کی جگہ کھانسی نے لے لی۔ خیریت تھی کہ دروازے دونوں طرف سے بند تھے ورنہ رات کے سناٹے میں سارا بنگلہ ہل جاتا۔

پربھو سیوک۔ نام بھی خوب رکھا۔ راجہ مہیندر سنگھ۔ مہیندر اور مہیندر کی ٹینک ملتی ہے۔ پلپلی صاحب کے ہنٹر کھا کر مہیندر سنگھ کا جھک جھک کر سلام کرنا خوب رہا۔ کہیں راجہ صاحب زہر نہ کھا لیں۔

صوفیہ۔ ایسا حیادار نہیں ہے۔

پربھو سیوک۔ تم ہنسی کے ناٹک لکھنے میں مشاق ہو۔

ذرا دیر بعد دونوں اپنے اپنے کمرہ میں سوئے۔ صوفیہ علی الصباح اُٹھی اور مسٹر کلارک کا انتظار کرنے لگی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ آتے ہی ہوں گے۔ اُن کو ساری باتیں بالتفصیل معلوم ہوں گی۔ ابھی تو محض افواہ سُنی ہے۔ ممکن ہے راجہ صاحب گھبرائے ہوئے اُن کے پاس اپنا دُکھڑا رونے کے لئے گئے ہوں۔ لیکن آٹھ بج گئے اور کلارک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ بھی تڑکے ہی آنے کو تیار رہتے پر آتے ہوئے شرماتے تھے کہ کہیں صوفیہ یہ نہ سمجھے کہ مجھ پر احسان جتانے آئے ہیں۔ اس سے زیادہ اس بات کا خوف تھا کہ وہاں لوگوں کو کیا کہتہ

دکھاؤں گا۔ یا تو مجھے دیکھ کر لوگ دل ہی دل میں جلیں گے یا کھلے الفاظ میں مجھے متہم کریں گے۔ سب سے زیادہ خوف ایشو سیلوک کا تھا کہ کہیں کافر ملعون یا شقی نہ کہہ بیٹھیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ اُن کی باتوں کا جواب ہی کیا؟ انہیں وجوہات سے وہ آتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور دل میں دعا کر رہے تھے کہ صوفیہ ہی ادھر آنکلے۔

نو بجے تک کلارک کا انتظار کرنے کے بعد صوفیہ بیتاب ہو گئی۔ ارادہ کیا کہ میں ہی چلوں۔ اُسی وقت یکا یک مسٹر جان سیوک آکر بیٹھ گئے اور صوفیہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولے "صوفی! مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے"۔

صوفیہ۔ میں نے! میں نے کیا کیا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

جان سیوک۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ہی ترغیب سے مسٹر کلارک نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا ہے۔

صوفیہ۔ آپ کو وہم ہے۔

جان سیوک۔ میں نے بلا ثبوت کے آج تک کسی پر الزام نہیں لگایا۔ میں ابھی اندو دیوی سے مل کر آ رہا ہوں۔ اُنہوں نے اس کا ثبوت دیا کہ یہ تمہاری ہی کرتوت ہے۔

صوفیہ۔ آپ کو یقین ہے کہ اندو نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے وہ صحیح ہے؟

جان سیوک۔ اُسے غلط سمجھنے کے لئے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

صوفیہ۔ اُسے صحیح سمجھنے کے لئے اگر انارد کا کہنا کافی ہے تو اُسے غلط سمجھنے کے لئے میرا کہنا کیوں کافی نہیں ہے؟

جان سیوک۔ سچ بات یقین کو پیدا کرتی ہے ‌‌٭

صوفیہ۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اپنی باتوں میں وہ نمک مرچ نہیں لگا سکتی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ انارد نے ہمارے اور ولیم کے درمیان میں مغائرت پیدا کرنے کے لئے یہ سوانگ رچا ہے ٭

جان سیوک نے شبہ میں پڑ کر کہا "صوفی! میری طرف دیکھ! کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟"

صوفیہ نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے والد کی طرف بخوف آنکھوں سے دیکھے لیکن اُس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ باطنی احساس زبان کو بگاڑ سکتا ہے مگر اعضا پر اُس کا زور نہیں چلتا۔ زبان چاہے خاموش ہو جائے مگر آنکھیں بولنے لگتی ہیں۔ مسٹر جان سیوک نے اُس کی پُر ندامت آنکھیں دیکھیں اور کبیدہ خاطر ہو کر بولے "آخر تم نے کیا سمجھ کر یہ کانٹے بوئے؟"

صوفیہ۔ آپ میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہے ہیں۔ آپ کو ولیم ہی سے یہ بات صاف کر لینی چاہئے۔ ہاں میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تمام شہر میں بدنام ہونے کی بہ نسبت میں اُس زمین کا آپ کے قبضہ سے نکل جانا کہیں بہتر خیال کرتی ہوں ٭

جان سیوک۔ اچھا تو تم نے میری نیک نامی کے لئے یہ چال چلی ہے؟ میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ لیکن یہ خیال تمہیں بہت دیر بعد

سوچھا. عیسائی قوم یہاں صرف اپنے مذہب کے سبب اتنی بدنام ہے کہ اس سے زیادہ بدنام ہونا غیر ممکن ہے۔ عوام کا بس چلے تو آج ہمارے سارے گرجے مٹی کے ڈھیر بن جائیں۔ انگریزوں سے لوگوں کو اتنی چڑ نہیں ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کا طرز معاشرت اُن کے خیالات و اطوار سب اُن کی ذاتی چیزیں ہیں۔ یعنی اُن کے ملک و قوم کے ہیں۔ لیکن جب کوئی ہندوستانی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو انگریزی وضع اختیار کرتا ہے تو لوگ اُس کو بالکل گیا گزرا سمجھ لیتے ہیں۔ وہ نیکی و بدی کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اُس سے کسی کو بھلے کاموں کی امید نہیں ہوتی اور نہ اُس کے بُرے کاموں پر کسی کو تعجب ہوتا ہے۔ میں یہ کبھی نہ مانوں گا کہ تم نے میری آبرو قایم رکھنے کے لئے یہ کوشش کی ہے۔ تمہارا مقصد صرف میرے تجارتی منصوبوں کو برباد کرنا ہے۔ مذہبی تحقیقات نے تمہاری عملی فراست کو ڈانواڈول کر دیا ہے۔ تمہیں اتنی سمجھ بھی نہیں ہے کہ نفس کُشی اور فیض رسانی محض ایک معیار ہے شعرا کے لئے معتقدین کے دل بہلاؤ کے لئے اور ناصحوں کی تصاویر کو مزین کرنے کے لئے۔ مسیح بُدھ اور موسیٰ کے پیدا ہونے کا وقت اب نہیں رہا۔ دولت یا ثروت مطعون ہونے پر بھی انسانی خواہشات کی معراج ہے اور رہے گی۔ خدا کے لئے تم مجھ پر اپنے مذہبی اصولوں کو نہ آزماؤ۔ میں تم سے اخلاق اور مذہب کا سبق نہیں پڑھنا چاہتا۔ تم سمجھتی ہو کہ خدا نے عدل و راستی و رحم کا تمہیں کو اجارہ دار بنا دیا ہے اور دُنیا میں جتنے اہل دولت و ثروت ہیں وہ سب کے سب بے انصاف خودسر اور بے رحم ہیں۔

لیکن مشیت ایزدی کی قایل ہو کر بھی تمہارا خیال ہے کہ دنیا میں برابری اور تفریق کا سبب صرف انسان کی خود غرضی ہے تو مجھے یہی کہنا پڑے گا۔ کہ تم نے مذہبی کتب کا مطالعہ آنکھیں بند کرکے کیا ہے۔ اُن کا مطلب نہیں سمجھا۔ تمہاری اس بدسلوکی سے مجھے جتنا رنج ہو رہا ہے اُسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور گو میں ولی یا درویش نہیں ہوں لیکن یاد رکھنا کہ کبھی نہ کبھی تم کو اپنے والد سے دشمنی کرنے کا خمیازہ اُٹھانا پڑے گا۔

بد دعا غصہ کی انتہائی حد ہے۔ "اس کا پھل تم ایشور سے پاؤ گے" یہ جملہ تیغ و سنان سے بھی زیادہ مہلک ہوتا ہے جب ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بُرے کام کی سزا دینے کے لئے دنیاوی طاقت کافی نہیں ہے اُس وقت ہم خدائی طاقت کو محرک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُس سے کمتر کوئی سزا بھی ہمیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

مسٹر جان سیوک اس طرح کوس کر اُٹھ گئے لیکن صوفیہ کو اس سخت کلامی سے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ اُس نے اس قرض کو بھی اندوختہ میں درج کر دیا اور اُس کے جذبہ انتقام نے زیادہ خوفناک صورت اختیار کر لی۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ اِس پُر مذاق ڈراما کو آج ہی شائع کر دوں گی۔ اگر اڈیٹر نے نہ چھاپا تو میں خود ہی کتابی صورت میں چھپواؤں گی اور عوام میں مفت تقسیم کر دوں گی۔ ایسی کالک لگ جائے کہ پھر کسی کو منہ نہ دکھا سکے۔

ایشور سیوک نے جان سیوک کی نا ملایم باتیں سُنیں تو بہت ناراض ہوئے۔ مسز سیوک کو بھی یہ برتاؤ بُرا معلوم ہوا۔ ایشور سیوک

لے کہا تھا نہ جانے تمہیں اپنے نفع نقصان کی تمیز کب ہوگی۔ بنی ہوئی بات کو نبا ہنا مشکل نہیں ہے۔ بگڑی ہوئی بات کو بنانا مشکل ہے تمہیں اس موقع پر اس قدر صبر و سنجیدگی سے کام لینا تھا کہ جتنا نقصان ہو چکا ہے اُس کی تلافی ہوجائے۔ گھر کا ایک گوشہ گر پڑے تو سارا گھر گرا دینا عقل مندی نہیں ہے۔ زمین گئی تو کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ اُس پر پھر تمہارا قبضہ ہو۔ یہ نہیں کہ زمین کے ساتھ اپنی عزت و آبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔ جا کر راجہ صاحب کو مسٹر کلارک کے فیصلہ کی اپیل کرنے پر آمادہ کرو۔ اور مسٹر کلارک سے اپنا میل جول بدستور قائم رکھو۔ یہ سمجھ لو کہ اُن سے تمہیں کوئی نقصان ہی نہیں پہنچا۔ صوفیہ کو برہم کر کے تم مسٹر کلارک کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا رہے ہو۔ حکام تک رسائی رہے گی تو ایسی کتنی ہی زمینیں ملیں گی۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا اور مشکل کو آسان کر۔"

مسز سیوک۔ میں تو اتنی منتوں سے اُسے یہاں لائی اور تم سارے کیے دھرے پر پانی پھیرے دیتے ہو۔

ایشور سیوک۔ خداوند۔ مجھے آسمان کی بادشاہت دے۔ اگر یہی مان لیا جائے کہ صوفی کے ایما سے یہ بات ہوئی تو بھی ہمیں اُس سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہئیے بلکہ میرے دل میں تو اُس کی عزت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسے خدا نے سچی روشنی عطا کی ہے۔ اُس میں ایمان اور اعتقاد کی برکت ہے۔ اُس نے جو کچھ کیا ہے اُسکی تعریف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ خداوند یسوع نے اپنے کو غریبوں اور بیکسوں پر نثار کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے ہم لوگوں میں اتنا اعتقاد

نہیں ہے۔ ہمیں اپنی خود غرضی پر نادم ہونا چاہیئے۔ صوفیہ کے نیک ارادوں کی تحقیر کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ گنہگار کسی فقیر کو دیکھ کر دل میں نادم ہوتا ہے۔ اُس سے دشمنی نہیں کرتا۔

جان سیوک - یہ نہ اعتقاد ہے اور نہ ایمان بلکہ محض ضد اور نخوت ہے۔

ایشور سیوک نے اِس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اپنی لکڑی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ میں آئے اور بولے "بیٹی! میرے آنے سے تمہارا کوئی ہرج تو نہیں ہُوا؟"

صوفیہ - نہیں نہیں آیئے بیٹھئے۔

ایشور سیوک - یسوع - اِس گنہگار کو ایمان کی روشنی عطا کر! ابھی جان سیوک نے تمہیں بہت کچھ بُرا بھلا کہا ہے۔ انہیں معاف کرو۔ بیٹی دنیا میں خدا کی جگہ اپنا باپ ہی ہوتا ہے۔ اُس کی باتوں کا بُرا نہ ماننا چاہیئے۔ تمہارے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔ خدا کی برکت ہے۔ تمہارے والد کی ساری عمر خود پروری میں گزری ہے اور وہ ابھی تک اُسی طرح گزر رہی ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ اُس کے دل کی تاریکی ایمان کی تجلّی سے دور کرے۔ جن لوگوں نے ہمارے خداوند یسوع کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں اُن کے لئے خداوند نے کہا تھا کہ اے خدا انہیں معاف کر کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

صوفیہ - میں آپ سے سچ کہتی ہوں۔ مجھے پاپا کی باتوں کا ذرا بھی ملال نہیں ہے۔ لیکن وہ مجھ پر غلط الزام لگاتے ہیں۔ آندو کی باتوں کے سامنے میری باتوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

ایشور سیوک۔ بیٹی یہ اُن کی غلطی ہے مگر تم اپنے دل سے اُنہیں معاف کردو۔ دنیا داروں کو اس قدر مطعون کیا گیا ہے مگر انصاف کی نظر سے دیکھو تو وہ کتنے قابل رحم ہیں۔ آخر آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنے بال بچوں ہی کیلئے تو کرتا ہے۔ اُنہیں کے آرام و اطمینان کے لئے اُنہیں کو دنیا کی بدنظری سے بچانے کے لئے وہ تمام بدنامیوں اور رسوائیوں کو بخوشی برداشت کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے ضمیر اور ایمان کو بھی اُن پر قربان کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں جب وہ دیکھتا ہے کہ میں جن لوگوں کے فائدہ کے لئے اپنا خون اور پسینہ ایک کر رہا ہوں وہی مجھ سے مخالفت کر رہے ہیں تو وہ فطرتاً جھنجھلا اُٹھتا ہے۔ اُس وقت اُسے حق و ناحق کی تمیز نہیں رہتی۔ دیکھو کلارک سے بھول کر بھی ان باتوں کا ذکر نہ کرنا ورنہ خوامخواہ دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے گی۔ بولو۔ وعدہ کرتی ہو؟

ایشور سیوک جب اُٹھ کر چلے گئے تو پربھو سیوک نے آکر پوچھا "وہ ڈراما کہاں بھیجا؟"

صوفیہ۔ ابھی تو کہیں نہیں بھیجا۔ کیا بھیج ہی دوں؟

پربھو سیوک۔ ضرور ضرور مزہ آجائے گا۔ تمام شہر میں دھوم مچ جائے گی۔

صوفیہ۔ ذرا دو ایک روز اور دیکھ لوں۔

پربھو سیوک۔ نیک کام کے کرنے میں تاخیر نہ ہونی چاہئے۔ آج ہی بھیجو۔ میں نے بھی آج اپنی نظم ختم کر دی۔ سناؤں؟

صوفیہ۔ ہاں ہاں پڑھو۔

پربھو سیلوک نے اپنی نظم سنانی شروع کی۔ ساری نظم رحم اور عفو کے جذبات سے لبریز تھی۔ مضمون اس قدر پُردرد تھا کہ صوفیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پربھو سیلوک بھی رو رہے تھے۔ عفو و محبت کے جذبات ہر لفظ سے اُسی طرح ٹپک رہے تھے جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں۔ نظم ختم ہوگئی تو صوفیہ نے کہا۔ مجھے کبھی خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ تم اِس رنگ میں ایسا کمال دکھا سکتے ہو۔ جی چاہتا ہے۔ تمہارا قلم چوم لوں۔ اُف کتنا روحانی عفو ہے۔ بُرا نہ ماننا۔ تمہاری تصنیف تم سے بدرجہا بلند تر ہے ایسے پاکیزہ ملائم اور پُرجوش الفاظ تمہارے قلم سے کس طرح نکل آتے ہیں؟

پربھو سیوک۔ اُسی طرح جیسے اتنے مضحکہ خیز اور نخوت شکن جذبات کا اظہار تمہارے قلم سے ہوا۔ تمہاری تصنیف تم سے کہیں زیادہ پست ہے*

صوفیہ۔ میں کیا اور میری تصنیف کیا۔ تمہارا ایک ایک شعر اس قابل کہ اُس پر دل نثار ہو جائیں۔ بیشک عفو انسانی جذبات میں رفیع ترین جذبہ ہے۔ رحم کا درجہ اتنا بلند نہیں۔ رحم وہ دانہ ہے جو پولی زمین میں اُگتا ہے۔ اُس کے خلاف عفو وہ دانہ ہے جو خارزار دل میں اُگتا ہے۔ رحم وہ چشمہ ہے جو ہموار زمین پر بہتا ہے۔ اس کے برعکس عفو کا چشمہ سنگریزوں اور چٹانوں پر بہتا ہے۔ رحم کا راستہ سیدھا اور آسان ہے اور عفو کا ٹیڑھا اور مشکل۔ تمہارا ایک ایک لفظ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ تم میں خود عفو کا نام و نشان

بھی نہیں ہے ؎

پربھو۔ صوفی۔ جذبات کے مقابلہ میں افعال کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ شاعر کا عملی میدان محدود ہوتا ہے مگر جذباتی میدان وسیع اور لامحدود اُس آدمی کو حقیر نہ سمجھو جو ترک اور استغناء کا راگ الاپتا ہے مگر خود کوڑیوں پر جان دیتا ہو۔ ممکن ہے کہ اُس کے الفاظ کسی بڑے گنہگار کے دل کو متاثر کر دیں ؎

صوفیہ۔ جس کے قول وفعل میں اتنا فرق ہو اُسے کسی اور ہی نام سے پکارنا چاہئے ؎

پربھو سیوک۔ نہیں صوفی۔ یہ بات نہیں ہے۔ شاعر کے جذبات بتلاتے ہیں کہ اگر اُسے موقع ملتا تو وہ کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے جذبات کی بلندی تک نہ پہنچ سکا تو اُس کا سبب صرف یہ ہے کہ گرد و پیش کے حالات اُس کے موافق نہ تھے ؎

کھانے کا وقت آگیا۔ اس کے بعد صوفیا نے ایشور سیوک کو بائبل سُنانا شروع کیا۔ آج کی سی عجز و رضا جوئی اُس نے کبھی نہ ظاہر کی تھی۔ ایشور سیوک کی مذہبی محویت نے اُن کے ہوش وحواس کو مغلوب کر دیا تھا۔ خواب کی حالت میں ہو جانا ہی اُن کی اندرونی بیداری تھی کرسی پر لیٹے ہوئے وہ خراٹے لے لے کر خدائی کتاب کو سُن رہے تھے لیکن تعجب یہ تھا کہ پڑھنے والا اُنہیں سوتا ہوا سمجھ کر جوں ہی خاموش ہو جاتا تو وہ فوراً ہی بول اُٹھتے "ہاں ہاں پڑھو۔ چپ کیوں ہو؟ میں سُن تو رہا ہوں" ؎

صوفیہ کو بائبل پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی تو اُس کا گلا چھوٹا۔

ایشور سیوک باغ میں ٹہلنے چلے گئے اور پربھو سیوک کو صوفی سے گپ شپ کرنے کا موقع ملا۔
صوفیہ۔ بڑے پاپا ایک بار پکڑ پاتے ہیں تو پھر گلا نہیں چھوڑتے۔
پربھو سیوک۔ مجھ سے کبھی بائبل پڑھنے کو نہیں کہتے۔ مجھ سے تو ایک لمحہ بھی وہاں نہ بیٹھا جائے۔ تم نہ جانے کیسے بیٹھی پڑھتی رہتی ہو؟
صوفیہ۔ کیا کروں۔ اُن پر رحم آتا ہے۔
پربھو سیوک۔ بنا ہوا ہے۔ مطلب کی بات پر کبھی نہیں چوکتا۔ یہ ساری عقیدت صرف دکھاوا ہے۔
صوفیہ۔ یہ تمہاری بے انصافی ہے۔ اُن میں اور چاہے کوئی وصف نہ ہو لیکن یسوع پر اُن کا زبردست اعتقاد ہے۔ چلو کہیں گھومنے چلتے ہو؟
پربھو سیوک۔ کہاں چلو گی؟ چلو یہیں حوض کے کنارے بیٹھ کر کچھ شعر و شاعری کی چرچا کریں۔ مجھے تو اُس سے زیادہ لطف اور کسی بات میں نہیں آتا۔
صوفیہ۔ چلو۔ پانڈے پور کی طرف چلیں۔ کہیں سورداس مل گیا تو اُسے یہ خبر سنائیں گے۔
پربھو سیوک۔ پھولا نہ سمائے گا۔ اُچھل پڑے گا۔
صوفیہ۔ ذرا شہ پا جائے تو اس راجہ کو شہر سے بھگا کر ہی چھوڑے۔
دونوں نے سڑک پر جا کر ایک تانگہ کرایہ پر کیا اور پانڈے پور کی طرف روانہ ہوئے۔ آفتاب غروب ہو گیا تھا۔ کچہری کے عملے بغل میں

بستہ دبلائے مردہ دلی اور خود غرضی کا مجسمہ بنے ہوئے چلے آرہے تھے۔ بنگلوں میں ٹینس ہو رہا تھا۔ شہر کے شہدے دین و دنیا سے بے خبر تمبولیوں کی دکانوں پر جمع تھے۔ بنیوں کی دوکانوں پر مزدوروں کی عورتیں کھانے کا سامان خرید رہی تھیں۔ تانگہ برنا ندی کے پل پر پہنچا کہ یکایک آدمیوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ سورداس کھنجڑی بجا کر گا رہا تھا۔ صوفیہ نے تانگہ روک دیا۔ اور تانگہ والے سے کہا کہ جا کر اُس اندھے کو بُلا لا۔

ایک لمحہ میں سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

صوفیہ۔ مجھے پہچانتے ہو سورداس؟

سورداس۔ ہاں۔ بھلا حضور ہی کو نہ پہچانوں گا۔

صوفیہ۔ تم نے ہم لوگوں کو سارے شہر میں خوب بدنام کیا۔

سورداس۔ فریاد کرنے کے سوا میرے پاس اور کون بل تھا؟

صوفیہ۔ فریاد کا کیا نتیجہ نکلا؟

سورداس۔ میری منشا پوری ہو گئی۔ حاکموں نے میری دھرتی مجھے دے دی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی کام تن من سے کیا جائے۔ اور اس کا کوئی پھل نہ ہو۔ تپسیا سے تو بھگوان مل جاتے ہیں۔ بڑے صاحب کے اردلی نے کل رات ہی کو مجھے یہ حال سُنایا۔ آج پانچ برہمنوں کو بھوجن کرایا ہے۔ کل گھر چلا جاؤں گا۔

پربھو سیوک۔ مس صاحب ہی نے بڑے صاحب سے کہہ سُن کر تمہاری زمین دلوائی ہے۔ اُن کے والد اور راجہ صاحب دونوں ہی اِن سے

ناراض ہو گئے ہیں۔ ان کی تمہارے اوپر بڑی مہربانی ہے ؞
صوفیہ۔ پربھو۔ تم پیٹ کے بڑے ہلکے ہو۔ یہ کہنے سے کیا فائدہ۔
کہ مس صاحب ہی نے زمین دلوائی ہے۔ یہ تو کوئی بہت بڑا کام
نہیں ہے ؞
سورداس۔ صاحب۔ یہ تو میں اُسی دن جان گیا تھا جب مس صاحب
سے پہلے پہل باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اُسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ ان
کے چت میں دیا اور دھرم ہے۔ اس کا پھل بھگوان اِن کو دیں گے ؞
صوفیہ۔ سورداس یہ میری سفارش کا پھل نہیں تمہاری تپسیا کا پھل
ہے۔ راجہ صاحب کو تم نے خوب چھکایا۔ اب تھوڑی سی کسر اور ہے۔
ایسا بدنام کر دو کہ شہر میں مُنہ دکھانے لایق نہ رہیں۔ استعفےٰ دے کر
اپنے علاقہ کی راہ لیں ؞
سورداس۔ نہیں مس صاحب! یہ کھلاڑیوں کی نیت نہیں ہے
کھلاڑی جیت کر ہارنے والے کھلاڑی کی ہنسی نہیں اُڑاتا۔ اُس سے
گلے ملتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ بھیا اگر ہم نے کھیل میں تم سے
کوئی انوچت (نامناسب) بات کہی ہو یا کوئی ایسا برتاؤ کیا ہو تو
ہمیں چھما (معاف) کرنا۔ اس طرح دونوں کھلاڑی ہنس کر الگ ہوتے
ہیں۔ کھیل سماپت (ختم) ہوتے ہی دونوں متر (دوست) بن جاتے ہیں
ان میں کوئی کپٹ نہیں رہتا۔ میں آج راجہ صاحب کے پاس گیا تھا
اور اُن سے ہاتھ جوڑ آیا۔ اُنہوں نے مجھے بھوجن کرایا۔ جب چلنے لگا تو
بولے کہ میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہے کوئی سنکا (اندیشہ) نہ کرنا
صوفیہ۔ ایسے صاف دل تو نہیں ہیں۔ موقع پا کر ضرور دغا کریں گے۔

میں تم سے کہے دیتی ہوں ؎

سورداس۔ نہیں۔ مس صاحب۔ ایسا مت کہئے۔ کسی پر سنکا کرنے سے اپنا چت (دل) ملین (مکدر) ہوتا ہے۔ وہ بدوان (عالم) ہیں دھرماتما ہیں کبھی دغا نہیں کر سکتے۔ اور جو کریں گے تو اُنہیں کا دھرم جائے گا۔ مجھے کیا۔ میں پھر اسی طرح فریاد کرتا پھروں گا۔ جس بھگوان نے ابکی سُنا ہے وہی بھگوان پھر سُنیں گے ؎

پربھو سیوک۔ اور جو کوئی معاملہ کھڑا کرکے قید کرا دیا تو؟

سورداس (ہنس کر) اس کا پھل اُنہیں بھگوان سے ملے گا۔ میرا دھرم تو یہی ہے کہ جب کوئی میری چیز پر ہاتھ بڑھائے تو اُس کا ہاتھ پکڑ لوں۔ وہ لڑے تو لڑوں اور اُس چیز کے لئے جان تک دے دوں۔ چیز میرے ہاتھ آئے گی۔ اُس سے مجھے مطلب نہیں۔ میرا کام تو لڑنا ہے اور وہ بھی دھرم کی لڑائی لڑنا۔ اگر راجہ صاحب دگا (دغا) بھی کریں گے تو میں اُن سے دگا نہ کروں گا ؎

صوفیہ۔ لیکن میں تو راجہ صاحب کو اتنے سستے نہ چھوڑوں گی ؎

سورداس۔ مس صاحب۔ آپ ودوان ہوکر ایسی باتیں کرتی ہو مجھے اچرج (تعجب) ہوتا ہے۔ آپ کے مُنہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ نہیں آپ ہنسی کر رہی ہیں۔ آپ سے کبھی ایسا کام نہیں ہو سکتا ؎

اتنے میں کسی نے پکارا "سورداس چلو! براہمن آگئے ہیں" ؎ سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا گھاٹ کی طرف چلا۔ تانگہ بھی چلا۔ پربھو سیوک نے کہا۔ "چلوگی مسٹر کلارک کی طرف؟"

صوفیہ۔ نہیں گھر چلو۔

راستہ میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ صوفیہ کسی خیال میں محو تھی۔ دونوں سگرا پہنچے تو چراغ جل چکے تھے۔ صوفیہ سیدھی اپنے کمرہ میں گئی۔ میز کی دراز کھولی۔ فارس ظرافت آمیز ڈراما کا مسودہ نکالا اور اُسے پُرزہ پُرزہ کر کے زمین پر پھینک دیا۔

(۲۱)

سورداس کی آہ و فریاد نے راجہ مہیندر کمار کی ناموری اور عزت کو خاک میں ملا دیا۔ وہ آسمان سے باتیں کرنے والا شہرت کا محل آن کی آن میں مسمار ہو گیا۔ اہل شہر اُن کی خدمات کو بھول سے گئے۔ اُن کی مساعی سے شہر کو کتنا نفع پہنچا تھا۔ اس کی یاد کسی کو نہ رہی۔ شہر کی نالیاں اور سڑکیں۔ باغیچے اور گلی کوچے اُن کی مسلسل کوششوں کے کتنے رہینِ منّت تھے۔ شہر کی صحت اور تعلیم کو اُنھوں نے کس گری ہوئی حالت سے اُٹھا کر شاہراہِ ترقی پر پہنچایا تھا۔ اُس کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ لوگ اُن پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب راجے رئیسوں کے نام عزت کے ساتھ لئے جاتے تھے۔ عوام کو خود ہی اُن سے عقیدت ہوتی تھی۔ وہ دن رخصت ہو گئے۔ ثروت پرستی زمانۂ قدیم کی شاہ پرستی ہی کا ایک جزو تھی۔ رعایا اپنے راجہ جاگیردار یہاں تک کہ اپنے زمیندار پر جان نثار کر دیتی تھی۔ یہ ایک مسلمہ اصولِ سیاست تھا کہ رعایا بادشاہ کے آرام و آسایش کے لئے ہے۔ دُنیا میں یہی رواج تھا۔ لیکن آج

شاہ اور رعایا میں وہ تعلق نہیں رہا۔ آج اُن میں خادم و مخدوم کا رشتہ ہے۔ اب اگر کسی بادشاہ کی عزت ہے تو خدمتی اعتبار سے ورنہ اس کی حالت دانتوں کے بیچے دبی ہوئی زبان کی سی ہے۔ رعایا کو اُس پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا۔ اب تو اُسی بادشاہ کی عزت ہوتی ہے جس نے اپنا سب کچھ رعایا پر نثار کر دیا ہو۔ جو فقر کی دولت سے مالا مال ہو۔ جب تک کوئی خدمت کے راستہ پر چلنا نہیں سیکھتا۔ عوام کے دلوں میں جگہ نہیں پاتا۔

راجہ صاحب کو اب معلوم ہوا کہ شہرت اُس سفید کپڑے کی طرح ہے جس پر ایک دھبہ بھی نہیں چھپ سکتا۔ جس طرف اُن کا موٹر نکل جاتا لوگ اُن پر آوازے کستے۔ یہاں تک کہ اکثر تالیاں بھی بجتیں۔ بیچارے بڑی مصیبت میں مبتلا تھے۔ شہرت حاصل کرنے چلے تھے۔ عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور موقعوں پر اندر سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ اِس سے دل کو ڈھارس ہوتی تھی۔ لیکن اب وہ دروازہ بھی بند تھا۔ اندر سے ہمدردی کی کوئی امید نہ تھی۔

رات کو نو بجے تھے۔ راجہ صاحب اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے اِس طرح سوچ رہے تھے۔ لوگ کتنے احسان فراموش ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے متواتر سات سال اُن کی خدمت میں صرف کر دیئے۔ اپنا کتنا وقت۔ کتنا تجربہ۔ کتنا آرام اُن کی نذر کیا اس کا مجھے آج یہ صلہ مل رہا ہے کہ ایک اندھا بھکاری مجھے سارے شہر میں گالیاں دیتا پھرتا ہے اور کوئی اُس کی زبان نہیں پکڑتا بلکہ لوگ اُسے اور بھی اُکساتے اور بڑھاوا دیتے ہیں۔ اس قدر باقاعدگی

سے اپنے علاقہ کا انتظام کرتا تو اب تک نکاسی میں لاکھوں روپوں کا اضافہ ہوگیا ہوتا۔ ایک دن وہ تھا کہ جدھر سے نکل جاتا تھا۔ لوگ کھڑے ہو ہو کر سلام کرتے تھے۔ جلسوں میں میری تقریریں سننے کے لئے بیقرار رہتے تھے اور مجھے اخیر میں بولنے کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ اب آج دن یہ ہے کہ مجھ پر تالیاں بجائی جاتی ہیں اور میرا سوانگ نکالنے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ اندھے میں پھر بھی تمیز ہے۔ ورنہ بنارس کے شہدے دن دہاڑے میرا گھر لوٹ لیتے۔

دفعتاً اردلی نے آکر مسٹر کلارک کا حکم نامہ اُن کے سامنے رکھ دیا۔ راجہ صاحب نے چونک کر لفافہ کھولا تو ششدر رہ گئے۔ مصیبت پر مصیبت! رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی۔

چپراسی۔ حضور۔ کچھ جواب دیں گے؟

راجہ صاحب۔ جواب کی ضرورت نہیں۔

چپراسی۔ کچھ انعام نہیں ملا۔ حضور ہی . . . . .

راجہ صاحب نے اُسے اور کچھ نہ کہنے دیا۔ جیب سے ایک نکال کر پھینک دیا۔ اردلی چلا گیا۔

راجہ صاحب سوچنے لگے۔ پاجی کو انعام مانگتے شرم بھی نہیں آتی۔ گویا میرے نام کوئی سپاسنامہ لایا ہے۔ کُتّے ہیں اور کیا۔ نردد تو کاٹنے دوڑیں۔ چھوٹی سچی شکایتیں کریں۔ میری سمجھ میں نہ آتا۔ کلارک نے کیوں اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ جان سیوک سے کسی پرسان بن ہوگئی کیا؟ شاید صوفیہ نے کلارک کو ٹھکرا دیا۔ چلو یہ بھی ہی ہوا۔ لوگ یہ تو کہیں گے کہ اندھے راجہ صاحب کو نیچا دکھا دیا

اس دُہائی سے تو گلا چھوٹے گا۔

اُس وقت اُن کی حالت اُس آدمی کی سی تھی جو اپنے مُنہ زور۔ گھوڑے کے بھاگ جانے پر خوش ہو۔ اب ہڈیوں کے ٹوٹنے کا خوف تو نہیں رہا۔ میں گھاٹا میں نہیں ہوں۔ اب تو روٹھی رانی بھی خوش ہو جائیں گی۔ اندو سے کہوں گا کہ میں نے ہی مسٹر کلارک سے اپنا فیصلہ منسوخ کرنے کے لئے کہا ہے۔

وہ کئی روز سے اندو سے ملنے نہ گئے تھے۔ اندر جاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ اندو کے طعنوں کا کیا جواب دوں گا۔ اندو بھی اس خوف سے اُن کے پاس نہ آتی تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ناخوشگوار لفظ پھر نکل جائے۔ ہر باہمی مغائرت کے بعد جب وہ اُس کے اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی تھی تو اُسے معلوم ہوتا تھا کہ میں ہی خطاوار ہوں اور اپنی خودسری پر اُسے دلی ملال ہوتا تھا۔ اُس کی ماں نے بچپن ہی سے شوہر پرستی کا بلند معیار اُس کے سامنے رکھا تھا۔ اُس معیار سے گرنے پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی اور اپنے کو ملامت کرتی تھی۔ میرا فرض اُن کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ مجھے تن من سے اُن کی سیوا کرنی چاہئے۔ میرا اوّلین فرض اُن کے متعلق ہے۔ مُلک و قوم کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر میری نحوست بار بار مجھے فرض کے راستہ سے ہٹا دیتی ہے۔ میں اِس اندھے کے پیچھے اُن سے خوامخواہ اُلجھ پڑی۔ وہ عالِم ہیں اور دور اندیش۔ یہ میری گستاخی ہے کہ میں اُن کی رہنمائی کا دعوےٰ کرتی ہوں۔ جب میں ذرا ذرا سی باتوں میں اپنی خودداری کا لحاظ کرتی ہوں تو اُن سے کیسے امید کروں کہ ہر معاملہ میں بے لوث

رہیں؟

کئی روز تک دل میں اس طرح سوچتے رہنے کے سبب اُس کو سورداس سے چڑ سی ہو گئی۔ اُس نے خیال کیا کہ اسی کمبخت کی وجہ سے میں اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ اسی نے ہمارے درمیان منافرت پیدا کر دی ہے۔ آخر اُس زمین سے محلہ والوں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے نہ! تو جب اُنہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تو اس اندھے کی کیوں نانی مرتی ہے؟ کسی کی زمین پر کوئی جبراً کیوں قبضہ کرے۔ یہ صرف ڈھکوسلا ہے اور کچھ نہیں۔ کمزور لوگ تو ابتدائے زمانہ سے ستائے جاتے رہے ہیں اور ستائے جلتے رہیں گے۔ جب یہ عالمگیر رواج ہے تو پھر کیا ایک کم اور کیا ایک زیادہ ۔

اِنہیں دنوں میں جب سورداس نے راجہ صاحب کو شہر میں بدنام کرنا شروع کیا تو اُس کی محبت کا پلہ نہایت تیزی سے دوسری طرف جھکا۔ اُسے سورداس کے نام سے چڑ ہو گئی۔ یہ ٹکے کا آدمی اور اُس کی اتنی جُراُت کہ ہم لوگوں کے سر چڑھے۔ اگر جمہوریت کے یہی معنے ہیں تو ایشور ہمیں اس سے بچائے۔ یہ زمانہ کا انقلاب ہے ورنہ اس کی کیا مجال تھی کہ ہمارے اوپر اس طرح چھینٹے اُڑاتا"

اندو غریبوں پر رحم کر سکتی تھی مگر اُن کے ساتھ انصاف نہ کر سکتی تھی۔ رحم میں فضیلت کی شان ہے اور انصاف میں جمہوریت کا جذبہ۔ وہ سوچتی کہ یہ اُس بدمعاش کو پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کر دیتے؟ مجھ سے تو یہ ذلت نہ برداشت ہوتی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہوتا مگر اِس وقت تو ایسی بُری طرح پیش آتی کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ۔

وہ اسی قسم کے بُرے خیالات میں غرق تھی کہ صوفیا نے جاکر اُس کے سامنے راجہ پر سو.دا س کے ساتھ بے انصافی کرنے کا اتہام لگایا۔ کھلی ہوئی دھمکی دی گئی۔ اندو کو اتنا غصہ آیا کہ سوردا س کو پاتی تو اُس کا منہ نوچ لیتی۔ صوفیہ کے چلے جانے پر وہ غصہ میں ہوئی راجہ صاحب کے پاس پہنچی مگر معلوم ہوا کہ وہ چند روز کے لئے علاقہ پر گئے ہوئے ہیں۔ یہ دن اُس نے بڑی بے چینی سے گزارے افسوس ہوا کہ چلے گئے اور مجھ سے پوچھا تک نہیں ۔

راجہ صاحب جب علاقہ سے لوٹے تو انہیں مسٹر کلارک کا حکم نامہ ملا۔ وہ اس پر غور کر رہے تھے کہ اندو اُن کے پاس گئی اور بولی "علاقہ پر گئے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی گویا میں گھر ہی میں نہیں ہوں"

راجہ نے نادم ہو کر کہا "ایسا ہی ایک ضروری کام تھا۔ ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی تو علاقہ میں فوجداری ہو جاتی۔ مجھے اب تجربہ ہو رہا ہے کہ تعلقداروں کے اپنے علاقہ جات میں نہ رہنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے"۔

اندو۔ علاقہ میں رہتے تو کم سے کم اتنی بدنامی تو نہ ہوتی ۔

راجہ صاحب۔ اچھا تمہیں بھی معلوم ہو گیا۔ تمہارا کہنا نہ مانا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اس اندھے نے ایسے مخمصے میں ڈال دیا ہے کہ کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ سارے شہر میں بدنام کر رہا ہے۔ نہ جانے شہر کے باشندوں کو اس سے اتنی ہمدردی کیسے ہو گئی۔ مجھے مطلقاً گمان نہ تھا کہ یہ شہر والوں کو میری مخالفت پر آمادہ کر دیگا۔

اندو۔ میں نے تو جب سے سُنا ہے کہ اندھا تمہیں بدنام کر رہا ہے تب سے ایسا غصّہ آ رہا ہے کہ میرا بس چلے تو اُسے زندہ درگور کر دوں ٭

راجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ تو ہم دونوں گھوم گھام کر ایک ہی جگہ آ پہنچے ٭

اندو۔ اس بدمعاش کو ایسی سزا دینی چاہئے کہ عمر بھر یاد کرے

راجہ صاحب۔ مسٹر کلارک نے اِس کا فیصلہ خود ہی کر دیا۔ سورداس کی زمین واپس کر دی گئی ٭

اندو کو ایسا معلوم ہوا کہ پیروں تلے کی زمین دھنس رہی ہے اور اُس کے ساتھ وہ بھی ٭ وہ دیوار کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی صوفیہ نے مجھے اس طرح ذلیل کیا ہے میرے ساتھ یہ چال چلی ہے ہماری عزّت کو خاک میں مِلانا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اُس کے قدم چوموں۔ یہ ہرگز نہ ہوگا ٭

اندو نے راجہ صاحب سے کہا۔ "اب آپ کیا کریں گے"؟

راجہ صاحب۔ کچھ نہیں۔ کرنا کیا ہے؟ سچ پوچھو تو مجھ کو اس کا ذرا بھی ملال نہیں۔ میری تو گلو خلاصی ہو گئی ٭

اندو۔ اور سُبکی کتنی ہوئی ٭

راجہ صاحب۔ سُبکی ضرور ہوئی مگر اِس بدنامی سے بہتر ہے۔

اندو کا چہرہ غرور سے تمتما اُٹھا۔ بولی "یہ بات آپ کے لئے نہیں۔ یہاں نیک نامی یا بدنامی کا سوال نہیں ہے بلکہ اپنے وقار کو قایم رکھنے کا سوال ہے۔ آپ کے خاندانی وقار پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اُس کی حفاظت کرنا آپ کا خاص فرض ہے۔ خواہ اُس کے لئے

عدل و انصاف کے اصولوں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹنا پڑے مسٹر کلارک کی ہستی ہی کیا ہے۔ میں کسی شاہنشاہ کے ہاتھوں سے بھی اپنے وقار کی بربادی نہ ہونے دوں گی۔ خواہ اُس کے لئے مجھے اپنا سب کچھ حتےٰ کہ جان بھی دے دینی پڑے۔ آپ جلد ہی گورنر کو مسٹر کلارک کی نامنصفانہ مداخلت کی اطلاع دیجئے۔ ہمارے بزرگوں نے اُس وقت انگریزوں کی حفاظت کی تھی جب اُن کے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ اُن احسانات کو نظرانداز نہیں کرسکتی۔ نہیں تو آپ خود ہی جاکر گورنر سے ملئے۔ اُن سے کہئے کہ مسٹر کلارک کے دخل درمعقولات سے میری سراسر توہین ہوگی۔ میں عوام کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا اور تعلیم یافتہ جماعت کو گورنمنٹ پر ذرا بھی اعتبار نہ رہے گا۔ آپ دکھلا دیں کہ رئیس کی توہین کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے تشویش ناک لہجہ میں کہا "مسٹر کلارک سے ہمیشہ کے لئے دشمنی ہو جائے گی۔ مجھے امید نہیں ہے کہ اُن کے مقابلہ میں گورنر میرا ساتھ دے۔ تم اِن لوگوں کو جانتی نہیں ہو۔ اُن کی افسری یا ماتحتی محض دکھانے کے لئے ہے۔ اصل میں سبھی ایک ہیں۔ ایک جو کرتا ہے۔ سب اُس کی تائید کرتے ہیں۔ اب آگے بڑھنا بیفائدہ پریشان ہونا ہے۔"

اندو۔ اگر گورنر نہ سنے تو گورنر جنرل کے یہاں اپیل کیجئے۔ ولایت جاکر وہاں کے لیڈروں سے ملئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کے سر پر ایک اہم ترین ذمہ داری کا بار آپڑا ہے۔ اِس میں ذرہ برابر بھی دبنا آپ کی دائمی ذلت و رسوائی کا باعث ہوگا۔

راجہ صاحب نے ایک منٹ تک سوچنے کے بعد کہا تمہیں یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کا حال معلوم نہیں ہے۔ تم سمجھتی ہوگی کہ وہ میری مدد کریں گے یا کم از کم ہمدردی کا اظہار ہی کریں گے لیکن جس دن میں نے کھلے الفاظ میں مسٹر کلارک کی شکایت کی اسی دن سے لوگ میرے گھر آنا جانا بھی بند کر دیں گے۔ کوئی منہ تک نہ دکھائے گا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مسٹر کلارک سے میری خفیہ شکایتیں کریں گے اور مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھیں گے۔ ہمارے خواندہ اور مہذب بھائیوں کی اخلاقی کمزوری ناگفتہ بہ ہے۔ سب کے سب ظاہر یا پوشیدہ طریقہ پر گورنمنٹ کے دست نگر ہیں۔ جب تک انہیں معلوم ہے کہ حکام سے میرا ربط ضبط ہے تبھی تک میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ جس روز انہیں معلوم ہوگا کہ حاکم ضلع کی نگاہ مجھ سے پھر گئی اسی روز سے میرے اعزاز کا خاتمہ سمجھو۔ ہمارے بھائیوں کی یہی کمزوری اور خود غرضی ہے جو ہمارے بیخوف راستگو اور جری رہنمایانِ ملک کے حوصلے پست کر دیتی ہے"۔

راجہ صاحب نے لطائف الحیل سے خوب کام لیا اور حالات گرد و پیش کا نہایت یاس انگیز نقشہ کھینچا لیکن اندو اپنے نقطے سے جو بھر بھی نہ ٹلی۔ وہ ان کے دل میں اُس جذبہ کو بیدار کرنا چاہتی تھی جو کبھی پرتاپ اور سانگا۔ ٹیپو اور نانا کے ناموں پر قربان ہو جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جذبہ مرا نہیں بلکہ اُس پر اقتدار کی محبت کی نیند کا غلبہ ہے۔ بولی:۔ اگر مان لیں کہ آپ کے سارے اندیشے ٹھیک نکلیں۔ آپ کی عزت مٹ جائے۔ سارا شہر آپ کا دشمن ہو جائے۔ حکام آپ کو مشتبہ

نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ یہاں تک کہ آپ کے علاقہ کے ضبط ہونے کی بھی نوبت آجائے جب بھی میں آپ سے یہی کہتی جاؤں گی کہ اپنی جگہ پر اٹل رہئے ہم چھتریوں کا یہی دھرم ہے۔ آج ہی اخباروں میں یہ بات شائع ہو جائے گی اور ساری دنیا نہیں تو کم از کم سارا ملک آپ کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھے گا کہ آپ اس قومی وقار کی کتنی مردانگی اور آزادی سے حفاظت کرتے ہیں۔ اس جنگ میں ہماری شکست بھی ایک عظیم فتح خیال کی جائے گی۔ کیونکہ یہ جنگ مادی نہیں روحانی ہے۔ لیکن مجھے تو یقین کامل ہے کہ آپ کے اندیشے باطل ثابت ہوں گے۔ ایک حاکم کی زیادتی کی فریاد سرکار کے کانوں تک پہنچا کر آپ اُس زبردست وفاداری کا ثبوت دیں گے سرکار کی عدل گستری پر اُس اعتماد کامل کا اعلان کریں گے جو سلطنت کی مضبوطی کی بنیاد ہے۔ بچہ ماں کے سامنے روئے مچلے۔ ہٹ کرے پر ماں کی محبت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔ مجھے تو یقین ہے کہ سرکار اپنے انصاف کی دھاک جمانے کے لئے آپ کی اور بھی عزت کرے گی۔ قومی تحریکات کے رہنماؤں کو عموماً اونچے اونچے خطابات دیئے جاتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو بھی وہی اعزاز حاصل نہ ہو"۔

یہ دلیل راجہ صاحب کو غور کرنے کے لئے قابل معلوم ہوئی۔ بولے "اچھا سوچوں گا"۔ اتنا کہہ کر باہر چلے گئے۔

دوسرے روز صبح مسٹر جان سیوک راجہ صاحب سے ملنے آئے۔ اُنہوں نے بھی یہی صلاح دی کہ اس معاملہ میں ذرا بھی نہ دبنا چاہئے۔ لڑوں گا تو میں۔ آپ صرف میری مدد کرتے جایئے گا۔ راجہ صاحب کو کچھ تسکین ہوئی۔ ایک سے دو ہو گئے۔ شام کے وقت وہ کنور صاحب سے صلاح

لینے گئے۔ اُن کی بھی یہی رائے ہوئی۔ ڈاکٹر گنگولی کو تار دے کر بلایا گیا۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ آپ خاموش بھی ہو جائیں گے تو میں کونسل میں اس معاملہ کو ضرور پیش کروں گا۔ سرکار ہمارے تجارتی معاملات کی طرف سے اس قدر بے پرواہ نہیں ہو سکتی۔ یہ انصاف یا بے انصافی۔ عزت یا بے عزتی کا سوال نہیں ہے۔ صرف تجارتی مقابلہ کا سوال ہے۔

راجہ صاحب اندو سے بولے "لو بھئی۔ تمہاری صلاح ٹھیک رہی۔ جان پر کھیل رہا ہوں۔"

اندو اُنہیں عقیدت مند نگاہوں سے دیکھ کر کہا "ایشور نے چاہا تو آپ کی فتح ہوگی۔"

(۲۲)

سید طاہر علی کو امید کامل تھی کہ سگریٹ کا کارخانہ تعمیر ہونا شروع ہو جائے گا تو میری کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہو گی۔ مسٹر سیوک نے اُن سے اس امر کا وعدہ کیا تھا۔ اس امید کے سوا اُنہیں اب ان قرضہ جات کے ادا کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ نظر آتا تھا جو روز بروز برساتی گھاس کی طرح بڑھتے چلے جاتے تھے۔ وہ خود بڑی کفایت سے بسر کرتے تھے۔ عید کے دن کے علاوہ اور شاید کسی روز بھی دودھ اُن کے حلق میں نہ جاتا تھا۔ مٹھائی اُن کے لئے حرام تھی۔ پان تمباکو کا اُنہیں شوق ہی نہ تھا۔ لیکن یہ خود چاہے کتنی ہی کفایت کریں۔ گھر والوں کی ضروریات میں قطع و بُرید کرنا انصاف کے خلاف سمجھتے تھے۔ زینب اور رقیہ اپنے لڑکوں کے لئے دودھ لینا ضروری خیال کرتی تھیں۔ کہتیں۔ یہی تو لڑکوں کے کھانے پینے کی عمر ہے۔ اسی عمر میں تو اُن کی ہڈیاں چوڑی چکلی ہوتی ہیں۔

اُن کے دل اور دماغ بڑھتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکوں کو مقوی غذا نہ ملے۔ تو اُن کی ساری عمر ہی برباد ہو جاتی ہے ٭

لڑکوں کے بارہ میں ایسا کہنا سچ ہو یا جھوٹ۔ مگر پان تمباکو کے بارہ میں طاہر علی کی سوتیلی مائیں جس دلیل کو پیش کرتی تھیں۔ اُس کی سچائی مسلمہ تھی۔ عورتوں کا اُن کے بغیر گزر ہی نہیں ہو سکتا۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔ کیا اُن کے یہاں پان تک میسر نہیں۔ یہی تو اب شرافت کی ایک نشانی رہ گئی ہے۔ مامائیں نہیں۔ خواصیں نہیں۔ تو کیا پان تمباکو سے بھی گئے ٭ مردوں کو پان کی ایسی ضرورت نہیں۔ اُنھیں حکام سے ملنا جلنا پڑتا ہے۔ پرائی تابعداری کرتے ہیں۔ اُنھیں پان کی کیا ضرورت ؟

مصیبت یہ تھی کہ ماہر اور جابر تو مٹھائیاں کھا کر اوپر سے دودھ پیتے اور صابر اور نسیمہ کھڑے مُنہ تاکا کرتے۔ زینب بیگم کہتیں۔ اِن کے گُرگا کے باپ کو خود ہی خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ سب کو دکھا کر کھلائیں جیسی کھلانا کھلائے ؟ سب کچھ تو اُنھیں کے مُٹھی میں ہے۔ جو چاہیں کھلائیں۔ جسے چاہیں رکھیں۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا ہے ؟

وہ دونوں دن بھر بکری کی طرح پان چبایا کرتیں۔ کلثوم کو کھانے کے بعد بھی ایک بیڑا بمشکل ملتا تھا۔ اپنی ان ضروریات کے لئے طاہر علی سے پوچھنے یا چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کی ضرورت نہ تھی ٭

صبح کا وقت تھا۔ چمڑے کی خرید ہو رہی تھی۔ سیکڑوں چمار بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ یہی ایک وقت تھا جب طاہر علی کو اپنے عہدہ کی اہمیت کا احساس ہوتا تھا۔ اِس وقت اُنھیں اِس احساس کی وجہ سے

حکومت کا خفیف سا نشہ ہو جاتا تھا۔ ایک چار دروازہ پر جھاڑو لگاتا ایک اُن کا تمنت صاف کرتا۔ ایک پانی بھرتا۔ کسی کو سبزی خریدنے کے لئے بازار بھیج دیتے۔ اور زینب اور رقیہ پردہ کی آڑ میں بیٹھ کر پاندان کا خرچ وصول کرتیں۔ صاحب نے طاہر علی کو دستوری لینے سے منع کیا تھا۔ عورتوں کو پان پتے کا خرچ لینے کی ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اِس آمدنی سے دونوں نے اپنے اپنے لئے زیور بنوا لئے تھے طاہر علی اس رقم کا حساب لینا چھوٹی بات سمجھتے تھے۔

اسی وقت جگدھر آ کر بولا۔ منشی جی حساب کب تک چکتا کیجئے گا میں کوئی لکھ پتی تھوڑے ہی ہوں کہ روز مٹھائیاں دیتا جاؤں چاہے دام ملیں یا نہ ملیں۔ آپ جیسے دو چار گاہک اور مل جائیں تو میرا دیوالہ ہی نکل جائے۔ لائیے۔ روپے دلوائیے۔ اب حیلہ حوالہ نہ کیجئے۔ گاؤں محلّہ کی بہت مروّت کر چکا۔ میرے اوپر بھی تو مہاجن کا لہنا تگادا (تقاضا) ہے۔ یہ دیکھئے کاگد (کاغذ) حساب کر دیجئے۔

باقی داروں کے لئے حساب کا کاغذ موت کا پروانہ ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ حساب دیکھنے کا مطلب ہے۔ روپے ادا کرنا۔ باقی دار نے حساب کا چٹھا ہاتھ میں لیا اور پانے والے کا دل امید سے شگفتہ ہو گیا۔ حساب کی فرد ہاتھ میں لے کر پھر کوئی حیلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ باقی داروں کو خالی ہاتھ حساب دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

طاہر علی نے منّت آمیز لہجہ میں کہا۔ بھئی حساب سب معلوم ہے اب بہت جلد تمہارا بقایا صاف ہو جائے گا۔ دو چار روز اور صبر کرو۔

جگدھر۔ کہاں تک صبر کروں صاحب! دو چار دن کرتے کرتے تو مہینوں ہو گئے۔ مٹھائیاں کھاتے وقت تو میٹھی جان پڑتی ہیں دام دیتے کیوں کڑوا لگتا ہے ؟

طاہر۔ برادر آج کل ذرا تنگ ہو گیا ہوں۔ مگر اب جلد ہی کارخانہ کا کام شروع ہو گا۔ میری بھی ترقی ہو گی۔ بس تمہاری کوڑی کوڑی چکا دوں گا ؟

جگدھر۔ نا صاحب۔ آج تو میں روپے لے کر ہی جاؤں گا۔ مہاجن کے روپے نہ دوں گا تو آج مجھے چھٹانک بھر بھی سودا نہ ملے گا۔ بھگوان جانتے ہیں جو میرے گھر میں ٹکا بھی ہو۔ یہ سمجھئے کہ آپ میرا نہیں۔ اپنا دے رہے ہیں۔ آپ سے جھوٹ بولتا ہوں تو جوانی کام نہ آئے۔ رات بال بچے بھوکے ہی سو رہے۔ سارے محلہ میں آواز لگائی کسی نے چار آنے پیسے بھی نہ دیئے ؟

چماروں کے چودھری کو جگدھر پر رحم آگیا۔ طاہر علی سے بولا۔ منشی جی میرا پاونا (یافتنی) انہیں کو دے دیجئے۔ مجھے دو چار دن پیچھے دے دیجئے گا ؟

طاہر۔ جگدھر میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ خدا کے لئے دو چار دن ٹھہر جاؤ ؟

جگدھر۔ منشی جی جھوٹ بولنا گائے کھانا ہے۔ مہاجن کے روپے آج نہ پہنچے تو کہیں کا نہ رہوں گا ؟

طاہر علی نے گھر میں آ کر کلثوم سے کہا۔ "مٹھائی والا سر پر سوار ہے۔ کسی طرح ٹلتا نہیں۔ کیا کروں ؟ تحویل میں سے دس روپے نکال کر

دے دوں؟
کلثوم نے چڑھ کر کہا جس کے دام آتے ہیں وہ سر پر سوار ہوگا ہی۔ اماں جان سے کیوں نہیں مانگتے۔ میرے بچوں کو تو مٹھائی ملی نہیں۔ جنہوں نے دودھ گھی کھلایا ہے وہ دام دینے کے وقت کیوں بھیگی بلی بنی بیٹھی ہوئی ہیں؟

طاہر۔ اسی وجہ سے تو میں تم سے کوئی بات کہتا نہیں بجٹ میں سے لے لینے میں کیا ہرج ہے؟ تنخواہ ملتے ہی جمع کردوں گا۔

کلثوم۔ خدا کے لئے کہیں یہ غضب نہ کرنا۔ روکڑ کو کالا سانپ سمجھو۔ کہیں آج ہی صاحب رقم کی جانچ کرنے لگے تو؟

طاہر۔ اجی نہیں۔ صاحب کو اتنی فرصت کہاں کہ روکڑ ملاتے رہیں؟

کلثوم۔ میں امانت کی رقم چھونے کو نہ کہوں گی۔ ایسا ہی ہے تو نسیمہ کا طوق اتار کر کہیں گرو رکھ دو۔ اور تو میرے کئے کچھ نہیں ہو سکتا۔

طاہر علی کو رنج تو بہت ہوا مگر کرتے کیا؟ نسیمہ کا طوق اتارتے تھے اور روتے تھے۔ کلثوم اسے پیار کرتی تھی اور پھسلا کر کہتی تھی۔ تمہارا نیا طوق بنوانے جا رہے ہیں۔ نسیمہ پھولی نہ سماتی تھی کہ مجھے نیا طوق ملے گا۔

طوق کو رومال میں لئے ہوئے طاہر علی باہر نکلے اور جگدھر کو علیحدہ لے جا کر بولے "بھئی اسے لے جاؤ۔ کہیں گرو رکھ کر اپنا کام چلاؤ۔ گھر میں روپے نہیں ہیں"۔

جگدھر۔ ادھار سودا دینا پاپ ہے پر کروں کیا؟ نگد (نقد) بیچنے

لگوں تو گھومتا ہی رہ جاؤں۔

یہ کہہ کر اُس نے ذرا تامل کرتے ہوئے طوق لے لیا اور پچھتاتا ہوا چلا گیا۔ کوئی دوسرا آدمی اپنے گاہک کو اتنا دِق کر کے روپے نہ وصول کرتا۔ اُسے لڑکی پر رحم آ ہی جاتا جو بکرار کہہ رہی تھی کہ میرا طوق کب بنا کر لاؤ گے۔ لیکن جگدھر اخراجات نمائی کے ناقابل برداشت بار کے سبب اُس سے کہیں زیادہ بے مروّت بننے پر مجبور تھا جتنا کہ وہ واقعی تھا۔

جگدھر کو گئے ہوئے نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ بجر نگی تیور بدلے ہوئے آکر بولا "منشی جی روپے دینے ہیں تو دیجئے نہیں کہہ دیجئے۔ بابا ہم سے نہیں ہوسکتا۔ بس ہم صبر کر لیں سمجھ لیں گے کہ ایک گائے نہیں لگی۔ روز روز دوڑاتے کیوں ہو؟"

طاہر۔ برادر۔ جیسے اتنے دنوں تک صبر کیا ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور صبر کرو۔ خدا نے چاہا تو اب کے تمہاری ایک پائی بھی نہ رہے گی۔

بجرنگی۔ ایسے وعدے تو آپ بیسوں بار کر چکے ہیں۔

طاہر۔ اب کے پکّا وعدہ کرتا ہوں۔

بجرنگی۔ تو کس دن حساب کیجئے گا؟

طاہر علی مخمصے میں پڑ گئے۔ کون سا دن بتلائیں؟ باقی داروں کو حساب کے دن کا اتنا ہی خوف ہوتا ہے جتنا گنہگاروں کو۔ وہ "دو چار" "بہت جلد" "آج کل میں" وغیرہ مبہم الفاظ کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ ایسے وعدے پورے کئے جانے کے لئے نہیں صرف پانے والوں کو ٹالنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ طاہر علی طبعاً خوش معاملہ شخص

تھے۔ تقاضوں سے انہیں سخت پریشانی ہوتی تھی۔ وہ تقاضوں سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا شیطان سے۔ انہیں دور سے دیکھتے ہی ان کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ خیر کئی منٹ تک سوچتے رہے۔ کیا جواب دوں؟ خرچ کا یہ حال ہے اور ترقی کے لئے کہتا ہوں تو کورا جواب ملتا ہے آخر بولے "دن کون سا بتاؤں؟ چار چھ دن میں جب آجاؤ گے۔ اسی دن حساب ہو جائے گا"

بجرنگی۔ منشی جی۔ مجھ سے اڑن گھائیاں نہ بتایئے۔ مجھے بھی سبھی طرح کے گاہکوں سے کام پڑتا ہے۔ اگر دس دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے اتنی دیر کیوں کی؟ اب روپے خرچ ہو گئے۔ اگر چار پانچ دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے۔ ابھی نو روپے ملے ہی نہیں۔ اس لئے مجھے کوئی دن بتا دیجئے جس میں میرا بھی ہرج نہ ہو اور آپ کو بھی سبھیتا ہو۔

طاہر۔ دن بتا دینے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوتا مگر بات یہ ہے کہ میری تنخواہ ملنے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے۔ دو چار دنوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔ ایک ہفتہ بعد کسی لڑکے کو بھی بھیج دو گے تو روپے مل جائیں گے۔

بجرنگی۔ اچھی بات ہے۔ آپ ہی کا کہنا سہی۔ اگر اب کی بھی وعدہ پورا نہ کیجئے گا تو پھر مانگنے نہ آؤں گا۔

بجرنگی چلا گیا تو طاہر علی بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ تم لوگ سمجھتے ہو گے۔ یہ لوگ اتنی اتنی طلب پاتے ہیں۔ گھر میں بٹور کر رکھتے ہوں گے اور یہاں خرچ کا یہ حال ہے کہ آدھا مہینہ بھی نہیں ختم ہونے پاتا اور روپے اڑ جاتے ہیں۔ شرافت روگ ہے اور کچھ نہیں۔

ایک چمار نے کہا۔ حجور بڑے آدمیوں کا کھرچ بھی بڑا ہوتا ہے۔ آپ ہی لوگوں کی بدولت نوکریوں کی گنجر ہوتی ہے۔ گھوڑے کی لات گھوڑا ہی سہ سکتا ہے۔

طاہر۔ ابھی صرف پان میں اتنا خرچ ہو جاتا ہے کہ اُتنے میں دو آدمیوں کا بخوبی گزر ہو سکتا ہے۔

چمار۔ حجور۔ دیکھتے نہیں ہیں کیا۔ بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔

ابھی طاہر علی کی اشتعال کافی طور پر [illegible] نے پائی تھی کہ سامنے سے ٹھاکر دین آتا ہوا دکھائی دیا۔ بیچ رہے۔ [illegible] ہی سے کوئی بہانہ سوچنے لگے اتنے میں اس نے آکر سلام کیا اور بولا۔ منشی جی۔ کارخانہ میں کب سے ہاتھ لگے گا؟

طاہر۔ مسالہ جمع ہو رہا ہے۔ [illegible] انجینئر نے نقشہ نہیں بنایا۔ اسی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔

ٹھاکر دین۔ انجینئر نے [illegible] ہوگا۔ بڑی بے [illegible] جات ہے۔ حجور میں نے بھی کچھ ٹھیکیداری کی ہے۔ جو [illegible] تھا۔ انجینئر کو [illegible] دیتا تھا۔ آخر گھبرا کر چھوڑ بیٹھا۔ انجینئر کے بھائی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ [illegible] کوئی چاہے مرتا ہو پر فیس لئے بنا بات نہ سنیں گے۔ فیس کے نام سے بیت بھی کریں گے۔ تو گاڑی کے کرایہ اور دوا کے دام میں کس لیں گے۔ (حساب کی فرد دکھا کر) جرا (ذرا) ادھر بھی ایک نجر (نظر) ہو جائے۔

طاہر۔ سب معلوم ہے۔ تم نے غلط تھوڑا ہی لکھا ہوگا۔

ٹھاکر دین۔ حجور ایمان ہے تو سب کچھ ہے۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا۔ تو

مجھے کیا حکم ہوتا ہے؟

طاہر۔ دو چار روز کی مہلت دو۔

ٹھاکر دین۔ جیسی آپ کی مرضی۔ حضور۔ چوری ہو جانے سے لاچار ہو گیا نہیں تو دو چار روپیوں کی کون بات تھی؟ اُس چوری میں تباہ ہو گیا۔ گھر میں کچھ ڈھا لوٹا تک نہ بچا۔ دانے کو محتاج ہو گیا حضور۔ چوروں کو آنکھوں کے سامنے بھاگتے دیکھا۔ اُن کے پیچھے دوڑا پاگل خانہ تک دوڑتا چلا گیا۔ اندھیری رات تھی۔ اونچ کھال کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ایک گڑھے میں گر پڑا۔ پھر اُٹھا۔ مال بڑا پیارا ہوتا ہے۔ لیکن چور نکل گئے تھے۔ تھانے میں رپٹ کی۔ تھانہ داروں کی کھوساہد کی۔ پر گئی ہوئی لچھمی کہاں لوٹتی ہے۔ ترکیب آؤں؟

طاہر۔ تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھجوا دوں گا۔

ٹھاکر دین۔ جیسی آپ کی اچھا۔ مجھے کوئی اُجر نہیں ہے۔ مجھے تگادا (تقاضا) کرتے آپ ہی شرم آتی ہے۔ کوئی بھلا مانس ہاتھ میں پیسے رہتے ہوئے ٹال مٹول نہیں کرتا فوراً نکال کر پھینک دیتا ہے۔ آج جرا پان لینے جانا تھا اس لئے چلا آیا تھا۔ سب نہ ہو سکے تو تھوڑا بہت دے دیجئے۔ کسی طرح کام نہ چلا تب آپ کے پاس آیا۔ آدمی پہچانتا ہوں حضور۔ پر موکا (موقع) ایسا ہی آ پڑا ہے۔

ٹھاکر دین کی منکسر مزاجی اور شگفتہ خاطری نے طاہر علی کو گرویدہ بنا لیا۔ فوراً صندوق کھولا اور پانچ روپے نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیئے۔ ٹھاکر دین نے روپے اُٹھائے نہیں۔ وہ ایک لمحہ تک سوچتا رہا۔ پھر بولا "یہ آپ کے روپے ہیں، سرکاری روکڑ کے ہیں؟"

طاہر۔ تم لے جاؤ تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گِننے سے ؟
ٹھاکر دین۔ نہیں منشی جی۔ یہ نہ ہوگا۔ اپنے روپے ہوں تو دیجئے۔ مالک کی روکڑ ہو تو رہنے دیجئے۔ پھر آ کر لے جاؤں گا۔ آپ کے چار پیسے کھاتا ہوں تو آپ کو آنکھوں سے دیکھ کر گڑھے میں نہ گرنے دوں گا۔ بُرا مانئے تو مان جایئے۔ اس کی چنتا نہیں۔ صفا بات کہنے کے لئے بدنام ہوں۔ آپ نے روپے یوں الٹے تلٹے کھرچے ہوں گے تو ایک دن آپ دھوکا کھائیں گے۔ بھل منسی تو ٹھاٹھ باٹھ بڑھانے میں نہیں ہے۔ اپنی آبرو بچانے میں ہے ؛

طاہر علی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "روپے لیتے جاؤ" ؛
ٹھاکر دین اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "جب آپ کے پاس ہوں تب دینا" ؛

اب تک تو طاہر علی کو کارخانہ کے چلنے کی امید تھی کہ اِدھر آمدنی بڑھی اور اُدھر میں نے روپے دیئے۔ لیکن جب مسٹر کلارک کے نئے حکم کے بموجب تعمیر کا کام غیر معینہ مدّت کے لئے بند کر دیا گیا تو طاہر علی کو اپنے مہاجنوں کا سمجھانا مشکل ہو گیا۔ اُنھوں نے زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ طاہر علی بہت متفکر رہنے لگے۔ عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کلثوم کہتی تھی اوپر کا خرچ سب بند کر دیا جائے۔ دودھ پان اور مٹھائیوں کے بغیر آدمیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ ایسے کتنے آدمی ہیں جنھیں اس زمانہ میں یہ چیزیں میسّر ہیں ؟ اوروں کی کیا کہوں۔ میرے ہی لڑکے ترستے ہیں۔ میں پہلے ہی سمجھا چکی ہوں اور اب پھر سمجھاتی ہوں کہ جن کے لئے تم اپنا لہو پسینہ ایک کر رہے ہو

وہ تمہاری بات بھی نہ پوچھیں گے۔ پر نکلتے ہی صاف اُڑ نہ جائیں تو کہنا ابھی سے رُخ دیکھ رہی ہوں۔ اوروں کو سود پر روپے دیئے جاتے ہیں زیور بنوائے جاتے ہیں لیکن گھر کے خرچ کو کبھی کچھ مانگو تو ٹکا سا جواب ملتا ہے کہ میرے پاس کہاں؟ تمہارے اوپر انہیں کچھ تو رحم آنا چاہئے آج دودھ مٹھائی بند کر دو تو گھر بیٹھنا مشکل ہو جائے ۔

تیسرا پہر تھا۔ طاہر علی سر آمدہ میں اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔ یکا یک بھیرو آکر بیٹھ گیا اور بولا "کیوں منشی جی کیا سچ مچ اب یہاں کارخانہ نہ بنے گا؟"

طاہر۔ بنے گا کیوں نہیں۔ فی الحال ملتوی ہو گیا ہے ۔

بھیرو۔ مجھے تو بڑی آسا (آس) تھی کہ کارخانہ بن گیا تو میرا بکری بٹا بھی بڑھ جائے گا۔ دوکان پر بکری بالکل مندی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں سبیرے (صبح) تھوڑی دیر بیٹھا کروں۔ آپ منجور کر لیں تو اچھا ہو۔ میری تھوڑی بہت بکری ہو جائے گی۔ آپ کو بھی پان کھانے کے لئے کچھ نجر کر دیا کروں گا ۔

کسی اور وقت پر تو طاہر علی نے بھیرو کو ڈانٹ بتلائی ہوتی۔ تاڑی کی دوکان کھولنے کی اجازت دینا اُن کے مذہب کے خلاف تھا۔ مگر اس وقت روپیہ کی فکر نے اُنہیں کشمکش میں ڈال دیا۔ اس سے پیشتر بھی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے اصول اور عمل میں کئی بار کشمکش پیدا ہو چکی تھی۔ اور ہر موقع پر اُنہیں اصول ہی کا خون کرنا پڑا تھا۔ آج پھر وہی کشمکش رونما ہوئی اور اصول نے پھر حالاتِ موجودہ کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ وہ سوچنے لگے۔ کیا کروں؟ اس میں میرا کیا

قصور ہ میں کسی شرف بیچا کے لئے شرع کے خلاف عمل نہیں کر رہا ہوں حالات نے مجھے بالکل مجبور کر دیا ہے یہ سوچ کر کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ یہاں تاڑی کی بکری نہ ہوگی "۔

بھیرو۔ ہجور۔ بکری تو تاڑی کی دہک سے ہوگی۔ نشہ باجوں (نشہ بازوں) کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ نہ دیکھیں تو چاہے برسوں نہ پئیں پر نشہ سامنے دیکھ کر اُن سے نہیں رہا جاتا۔

طاہر۔ مگر صاحب کے حکم کے بغیر میں کیسے اجازت دے سکتا ہوں۔

بھیرو۔ آپ کی جیسی مرجی۔ میری سمجھ میں تو صاحب سے پوچھنے کی جرورت ہی نہیں۔ سبیرے ایک گھڑا لاؤں گا۔ گھڑی بھر میں بیچ کر اپنی راہ لوں گا۔ اُنہیں خبر ہی نہ ہوگی کہ یہاں کوئی تاڑی بیچتا ہے۔

طاہر۔ نمک حرامی سکھاتے ہو۔ کیوں؟

بھیرو۔ سرکار۔ اس میں نمک حرامی کا ہے کی؟ اپنے داؤں گھات پر کون نہیں لیتا؟

سودا پٹ گیا۔ بھیرو یکمشت پندرہ روپے دینے پر راضی ہوگیا۔ جا کر سبھاگی سے بولا۔ "دیکھ سودا کر آیا نا؟ تو کہتی تھی کہ وہ کبھی نہ مانیں گے مسلمان ہیں۔ اُن کے یہاں تاڑی سراب منع ہے۔ پر میں نے تو کہہ نہ دیا تھا کہ مسلمان ہو چاہے برہمن ہو۔ پر دھرم کرم کسی میں نہیں رہ گیا۔ روپے پر سبھی لپک پڑتے ہیں۔ یہ میاں لوگ باہر سے اُجلے کپڑے پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ گھر میں بھونی بھانگ نہیں ہوتی۔ میاں نے پہلے تو دکھانے کے لئے اِدھر اُدھر کیا پھر پندرہ روپیہ میں راجی ہوگئے پندرہ روپے تو پندرہ دن میں سیدھے ہو جائیں گے "۔

سُبھاگی پہلے گھر کی مالکن بننا چاہتی تھی۔ اس لئے ہر روز ڈنڈے کھاتی تھی۔ اب وہ گھر بھر کی خادم بن کر مالکن بنی ہوئی ہے۔ روپے پیسے اُسی کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ ساس بہو اُس کی صورت سے بیزار تھی۔ دن میں سو سو بار اُسے دعائیں دیتی ہے۔ سبھاگی نے فوراً روپے نکال کر بھیرو کو دیئے۔ شاید دو بچھڑے ہوئے دوست اس طرح ٹوٹ کر گلے نہ ملتے ہوں گے۔ جیسے طاہر علی ان روپیوں پر ٹوٹے۔ رقم قلیل تھی۔ اس کے لئے اُنہیں اپنے ایمان کا خون کرنا پڑا تھا۔ قرض والے اپنے اپنے روپے لے گئے۔ طاہر علی کے سر کا بوجھ ہلکا ہوا۔ مگر اُنہیں بہت رات تک نیند نہ آئی۔ ضمیر سخت جان ہوا کرتا ہے۔ اُس کا گلا کٹ جائے مگر جان نہیں نکلتی۔

(۲۳)

جب تک سورداس شہر میں حکام کے ظلم کی دوہائی دیتا رہا اُس کے محلہ والے جان سیوک کے ہوا خواہ ہونے کے باوجود بھی اُس سے ہمدردی کرتے رہے۔ کمزوروں کے ساتھ ہمدردی قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن سورداس کی فتح ہوتے ہی اس ہمدردی نے حسد کی شکل اختیار کر لی۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ سورداس دل میں ہم لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہوگا۔ کہتا ہوگا کہ جب میں نے راجہ مہندر کمار سنگھ جیسوں کو نیچا دکھا دیا۔ اُن کا غرور خاک میں ملا دیا۔ تو یہ لوگ کس کھیت کی مولی ہیں۔ سارا محلہ اُس سے دل ہی دل میں خار کھانے لگا۔ صرف ایک ٹھاکردین تھا جو اُس کے پاس اب بھی آیا جایا کرتا تھا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ سورداس کو کسی دیوتا کا اشٹ ضرور ہے۔ اُس نے

نے رو کوئی منتر جگا لیا ہے ورنہ اُس کی اتنی کہاں مجال کہ ایسے ایسے بڑے آدمیوں کا سر جھکا دیتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنتر منتر سب ڈھکوسلا ہے۔ یہ سب دیکھ کر بھی اُن کی آنکھیں نہیں کھلتیں ؀

سورداس کے مزاج میں بھی اب کچھ تغیر ہوا۔ تحمل وہ پہلے ہی سے تھا لیکن حق و انصاف کی حمایت میں اُسے کبھی کبھی غصہ آ جاتا تھا۔ اب اُس میں حرارت کا نام بھی نہ رہا۔ گویا کوئی گھورا تھا جس پر سبھی کوڑا پھینکتے ہیں۔ محلہ والے راہ چلتے اُسے چھیڑتے۔ اُس پر آوازے کستے۔ طعنے مار دیتے۔ پر وہ کسی کو جواب نہ دیتا۔ سر جھکائے بھیک مانگنے جاتا اور پھر چپکے سے آ کر اپنی جھونپڑی میں پڑا رہتا۔ ہاں متھوا کا مزاج نہ ملتا تھا وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ کہتا۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ اندھا بھیک مانگتا ہے۔ اندھا تو بڑے بڑوں کی پیٹھ میں دھول لگا دیتا ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو چھیڑتا۔ بھلے آدمیوں سے زبان لڑاتا۔ اپنے ہمجولیوں سے کہتا کہ چاہوں تو سارے محلہ کو بندھوا دوں۔ کسانوں کے کھیتوں سے بے دھڑک چنے۔ مٹر۔ مولی۔ گاجر اُکھاڑ لاتا۔ اگر کوئی ٹوکتا تو اُس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ سورداس کو روز اولہنے ملتے۔ وہ تنہائی میں متھوا کو سمجھاتا لیکن اُس پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ سورداس کے انکسار و تحمل پر تو کسی کی نگاہ نہ جاتی تھی۔ متھوا کی لن ترانیوں اور شرارتوں پر سبھی کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ لوگ یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ سورداس ہی نے اُس کو سر چڑھا لیا ہے۔ بچھڑا کھونٹے ہی کے بل پر کودتا ہے حسد طفلانہ حرکتوں کو بھی مغالطہ بازی سمجھتا ہے ؀

آج کل صوفیہ مسٹر کلارک کے ساتھ سورداس سے اکثر ملا کرتی تھی۔

وہ روزانہ اُس کو کچھ نہ کچھ دیتی۔ اور اُس کی دلجوئی کرتی۔ پوچھنی محلہ والے یا راجہ صاحب کے آدمی تمہیں دق تو نہیں کر رہے ہیں؟ سورداس جواب دیتا مجھ پر سب لوگ دیا کرتے ہیں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔ محلہ والے سمجھتے تھے۔ کہ یہ بڑے صاحب سے ہم لوگوں کی شکایت کرتا ہے۔ کنایتاً و طنزاً اسی قسم کے خیالات کا بھی اظہار کرنے لگے۔ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا" یار" پیادہ سے فرزیں بھئے ٹیڑھو ٹیڑھو جا۔ ایک بار کسی سرقہ کی علت میں نایک رام کے گھر تلاشی ہوئی۔ نایک رام کو شک ہوا کہ سورداس ہی نے نبش زنی کی ہے۔ اسی طرح ایک بار بھیرو سے آبکاری کے داروغہ نے جواب طلب کیا۔ بھیرو نے شاید قاعدہ کے خلاف نصف شب تک دوکان کھلی رکھی تھی۔ بھیرو کا شک بھی سورداس ہی پر ہوا کہ اُسی نے یہ چنگاری چھوڑی ہے۔ ان لوگوں کی بدگمانیوں سے تو سورداس کو زیادہ ملال نہ ہوا لیکن جب سبھاگی کھلم کھلا اسے مطعون و بدنام کرنے لگی تو اُس کو بہت رنج ہوا۔ اُسے یقین تھا کہ کم سے کم سبھاگی کو میری نیت کا حال معلوم ہے۔ اُسے مجھ کو ان لوگوں کے دستِ ستم سے بچانا چاہئے تھا مگر اس کا دل بھی مجھ سے پھر گیا ⁂

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک روز رات کو سورداس کھانا کھا چکا تھا کہ کسی نے آ کر چپکے سے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ سورداس چونکا پر سبھاگی کی آواز پہچان کر بولا "کیا کہتی ہے؟"

سبھاگی۔ کچھ نہیں۔ ذرا مندر تک چلو۔ تم سے کچھ کہنا ہے ⁂

سورداس اُٹھا اور سبھاگی کے ساتھ جھونپڑے میں آ کر بولا کہ

کیا کہتی ہے؟ اب تو تجھے بھی مجھ سے بَیر ہو گیا ہے۔ گالیاں دیتی پھرتی ہے۔ چاروں طرف بدنام کر رہی ہے۔ بتلا میں نے تیرے ساتھ کون سی بُرائی کی تھی کہ تو نے میری بُرائی پر کمر باندھ لی۔ اور لوگ مجھے بھلا بُرا کہتے ہیں۔ مجھے رنج نہیں ہوتا لیکن جب تجھے طعنے دیتے سنتا ہوں تو مجھے رونا آتا ہے۔ کلیجے میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ جس دن بھیرو کی طلبی ہوئی تھی۔ تو نے مجھ کو کتنا کوسا تھا۔ سچ بتا۔ کیا تجھے بھی شک ہوا تھا کہ میں نے ہی درگا جی سے شکایت کی ہے؟ کیا تو مجھے اتنا نیچ سمجھتی ہے؟ بتا؟

سُبھاگی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا" میں تمہارا جتنا آدر کرتی ہوں اُتنا اور کسی کا نہیں۔ تم اگر دیوتا ہوتے تو بھی میں اتنی ہی سردھا سے تمہاری پوجا کرتی"

سورداس۔ میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں؟ صاحب سے کس کی شکایت کرتا ہوں؟ جب دھرتی نکل گئی تھی تب تو لوگ مجھ سے نہ چڑھتے تھے۔ اب دھرتی چھوٹ جانے سے کیوں سب کے سب میرے دُشمن ہو گئے ہیں؟ بتا۔ میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں۔ میری دھرتی چھوٹ گئی ہے تو کوئی راج مل گیا ہے کہ گھمنڈ کروں گا؟

سُبھاگی۔ میرے من کا حال بھگوان جانتے ہوں گے۔

سورداس۔ تو مجھے کیوں جلایا کرتی ہے؟

سُبھاگی۔ اس لئے۔

یہ کہہ کر اُس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی سورداس کے ہاتھ میں رکھ دی۔ پوٹلی بھاری تھی۔ سورداس نے اُسے ٹٹولا اور پہچان گیا۔ وہ

اُسی کی پوٹلی تھی جو چوری گئی تھی۔ اندازہ سے معلوم ہوا کہ روپے بھی اُتنے ہی ہیں۔ تعجب سے بولا "یہ کہاں ملی؟"
سُبھاگی۔ تمہاری محنت کی کمائی ہے۔ تمہارے پاس آ گئی۔ اب جتن سے رکھنا۔
سُورداس۔ میں نہ رکھوں گا۔ اسے لے جا۔
سُبھاگی۔ کیوں؟ اپنی چیز (چیز) لینے میں کوئی ہرج ہے؟
سُورداس۔ یہ میری چیز نہیں۔ بھیرو کی چیز ہے۔ اِسی کے لئے بھیرو نے اپنی آتما بیچی ہے۔ مہنگا سودا لیا ہے۔ میں اسے کیسے لے لوں؟
سُبھاگی۔ میں یہ سب باتیں نہیں جانتی۔ تمہاری چیز ہے۔ تمہیں لینی پڑے گی۔ اس کے لئے میں نے اپنے گھر والوں سے چھل کیا ہے۔ اتنے دنوں سے اسی کے لئے اپا رچے رہی ہوں۔ تم نہ لوگے تو اسے میں کیا کروں گی؟
سُورداس۔ بھیرو کو معلوم ہو گیا تو تمہیں جیتا نہ چھوڑے گا۔
سُبھاگی۔ نہیں نہ معلوم ہونے پائے گا۔ میں نے اُس کی تدبیر سوچ لی ہے۔

یہ کہہ کر سُبھاگی چلی گئی۔ سورداس کو اور زیادہ بحث کرنے کا موقع نہ ملا۔ بڑی پس و پیش میں پڑ گیا:۔ یہ روپے لوں یا کیا کروں؟ یہ تھیلی میری ہے یا نہیں؟ اگر بھیرو نے اسے خرچ کر دیا ہوتا تو؟ کیا چور کے گھر چوری کرنا پاپ نہیں ہے؟ کیا میں اپنے روپے کے بدلے اُس کے روپے لے سکتا ہوں؟ سبھاگی مجھ پر کتنی دیا کرتی ہے۔ وہ اسی لئے مجھے طعنے دیا کرتی تھی کہ یہ بھید نہ کھلنے پائے۔

وہ اسی اُدھیڑ بُن میں پڑا ہوا تھا۔ کہ دفعتاً "چور چور" کا شور سُنائی دیا۔ پہلی ہی نیند تھی۔ لوگ غافل سو رہے تھے۔ پھر آواز آئی "چور! چور!" بھیرو کی آواز تھی۔ سورداس سمجھ گیا کہ سبھاگی نے یہ لیلا رچی ہے۔ اپنے دروازہ پر پڑا رہا۔ اتنے میں بجرنگی کی آواز سُنائی دی۔ "کدھر گیا کدھر گیا؟" یہ کہہ کر وہ لاٹھی لئے اندھیرے میں ایک طرف دوڑا۔ یکایک تمام بھی گھر سے نکلے اور کدھر کدھر کرتے ہوئے دوڑے۔ راستہ میں بجرنگی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چور سمجھا۔ دونوں نے وار کیا اور دونوں چوٹ کھا کر گر پڑے۔ ذرا دیر میں بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ ٹھاکردین نے پوچھا "کیا کیا لے گیا؟ اچھی طرح دیکھ لینا۔ کہیں چھت میں نہ چھپا ہوا ہو۔ چور دیوار سے ایسا چمٹ جاتے ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے"۔

سُبھاگی۔ ہائے۔ میں تو لٹ گئی۔ ابھی تو بیٹھی بیٹھی اماں کا پاؤں دبا رہی تھی۔ اتنے میں نہ جانے مُوا کہاں سے آ پہنچا؟

بھیرو۔ (چراغ سے دیکھ کر) ساری جمع جتھا اُٹھ گئی۔ ہائے رام!

سُبھاگی۔ ہائے میں نے اُس کی پرچھائیں دیکھی تو سمجھی کہ یہی ہوں گے جب اُس نے صندوق پر ہاتھ بڑھایا تو سمجھی کہ یہی ہوں گے۔

ٹھاکردین۔ کھپریل پر چڑھ کر آیا ہو گا؟ میرے یہاں جو چوری ہوئی تھی اُس میں بھی چور کھپریل ہی سے چڑھ کر آئے تھے۔

اتنے میں بجرنگی آیا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ بولا "میں نے اُسے بھاگتے دیکھا۔ لاٹھی چلائی۔ اُس نے بھی وار کیا۔ میں تو چکر کھا کر گر پڑا۔ پر اُس پر بھی ایسا ہاتھ پڑا ہے کہ سر کھل گیا ہو گا"۔

یکا یک نایک رام "ہائے ہائے" کرتے ہوئے آئے اور زمین پر گر پڑے۔ سارا جسم خون سے لت پت تھا ⁂

ٹھاکر دین۔ پنڈاجی۔ کیا تم سے بھی اُس کا سامنا ہو گیا کیا ؟

نایک رام کی نگاہ بجرنگی کی طرف گئی۔ بجرنگی نے نایک رام کی طرف دیکھا۔ نایک رام نے دل میں کہا۔ پانی کا دودھ بنا کر بیچتے ہو۔ اب یہ ڈھنگ نکالا ہے۔ بجرنگی نے دل میں کہا جاتریوں کو لوٹتے ہو۔ اب محلہ والوں ہی پر ہاتھ صاف کرنے لگے ⁂

نایک رام۔ ہاں بھئی۔ یہیں گلی میں تو ملا۔ بڑا بھاری جوان تھا ⁂

ٹھاکر دین۔ تبھی تو اکیلے دو آدمیوں کو گھائل کر دیا۔ میرے گھر میں جو چور بیٹھے تھے وہ سب دیو معلوم ہوتے تھے۔ ایسے ڈیل ڈول کے تو آدمی ہی نہیں دیکھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے اوپر اُن کا بھرپور ہاتھ پڑا ⁂

نایک رام۔ ہاتھ میرا بھی بھرپور پڑا ہے۔ میں نے اُسے گرتے دیکھا سر جرور (ضرور) پھٹ گیا ہوگا۔ جب تک پکڑوں نکل گیا ⁂

بجرنگی۔ ہاتھ تو میرا بھی ایسا پڑا ہے کہ بچہ کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ چاروں شانے چت گرا تھا ⁂

ٹھاکر دین۔ کسی جانے ہوئے آدمی کا کام ہے۔ گھر کے بھید یا بنا کبھی چوری نہیں ہوتی۔ میرے یہاں بھی سبھوں نے میری چھوٹی لڑکی کو مٹھائی دے کر گھر کا سارا بھید پوچھ لیا تھا ؟

بجرنگی۔ تھانہ میں جرور رپٹ کرنا ⁂

بھیرو۔ رپٹ کر کے تھوڑے ہی رہ جاؤں گا۔ بچہ سے چکی نہ پِسواؤں

تو کہنا۔ چاہے بِک جاؤں پر اُنہیں بھی پیس ڈالوں گا مجھے سب معلوم ہے۔
ٹھاکر دین۔ بال کا مال لے گیا۔ دو آدمیوں کو چوپٹ کر گیا۔ اسی سے میں چوروں کے نکٹ (نزدیک) نہیں گیا تھا۔ دور ہی سے لین دین کرتا رہا۔ جان سلامت رہے تو مال پھر آ جاتا ہے۔

بھیرو کو بجرنگی پر شُبہ تھا نہ نایک رام پر۔ اُسے جگدھر پر شُبہ تھا۔ شُبہ بھی نہیں۔ یقین تھا۔ جگدھر کے سوا کسی کو نہ معلوم تھا کہ روپے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔ جگدھر کی نیت بھی اچھی نہ تھی۔ وہ پڑوسی ہو کر بھی موقعِ واردات پر سب سے پیچھے پہنچا تھا۔ یہ سارے وجوہ اُس کے شُبہ کو مضبوط بناتے تھے۔

یہاں سے لوگ چلے تو راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔ ٹھاکر دین نے کہا۔ کچھ اپنی کمائی کے روپے تو تھے نہیں۔ وہی سورداس کے روپے تھے۔
نایک رام۔ پرایا مال اپنے گھر میں آ کر اپنا ہو جاتا ہے۔
ٹھاکر دین۔ پاپ کا ڈنڈ ضرور بھوگنا پڑتا ہے۔ چاہے جلدی ہو چاہے دیر۔
بجرنگی۔ تمہارے چوروں کو تو کچھ ڈنڈ نہ ملا۔
ٹھاکر دین۔ مجھے کون کسی دیوتا کا ایشٹ تھا۔ سورداس کو ایشٹ ہے۔ اُس کی ایک کوڑی بھی کسی کو ہضم نہیں ہو سکتی۔ چاہے کتنا ہی چورن کھائے۔ میں تو شرط بند کر کہتا ہوں کہ اگر اُس کے گھر کی تلاشی لی جائے تو سب مال برآمد ہو جائے۔

دوسرے روز منہ اندھیرے بھیرو نے کوتوالی میں اطلاع کی۔ دوپہر تک داروغہ جی تفتیش کرنے کے لیے آ پہنچے۔ جگدھر کی خانہ تلاشی

ہوئی۔ بھیرو نے سمجھا۔ اُس نے مال کہیں چھپا دیا۔ اُس دن سے بھیرو کے سر ایک بھوت سا سوار ہوگیا۔ وہ سویرے ہی داروغہ جی کے گھر پہنچ جاتا تمام دن اُن کی خدمت کیا کرتا۔ چلم بھرتا۔ پیر دباتا۔ گھوڑے کے لئے گھاس چھیل لاتا۔ تھانہ کے چوکی داروں کی خوشامد کرتا۔ اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا تمام دن اسی چوری کا تذکرہ کیا کرتا۔ کیا کہوں مجھے کبھی ایسی نیند نہ آتی تھی۔ اُس دن نہ جانے کیسے سو گیا۔ مگر بندھوا نہ دوں تو نام نہیں۔ داروغہ جی تاک رہے ہیں۔ اُس میں سب روپے ہی نہیں تھا۔ اشرفیاں بھی ہیں۔ بھنائی جائیں گی۔ بیچنے والا چور ن پکڑا جائے گا۔

رفتہ رفتہ بھیرو کو سارے محلہ پر شبہ ہونے لگا۔ اور جلتے تو لوگ اُس سے پہلے ہی تھے۔ اب سارا محلہ اُس کا دشمن ہوگیا۔ یہاں تک کہ آخیر میں وہ اپنے گھر والوں پر ہی اپنا غصہ اتارنے لگا۔ بھاگی پر پھر مار پڑنے لگی۔ تو نے ہی مجھے چوپٹ کیا۔ تو اتنی بے خبر نہ سوتی تو چور کیسے گھر میں گھس آتا؟ میں دن بھر دوری دوکان کرتا ہوں۔ تھک کر تو گھر ہی پڑا رہتا ہوں۔ تو پڑے پڑے کیا کیا کرتی ہے؟ اب جہاں سے بنے میرے روپے لا نہیں تو جیتا نہ چھوڑوں گا۔

اب تک اُس نے بڑھی ماں کا ہمیشہ ادب کیا تھا۔ پر اب اُس کو بھی بے ادبی کرتا۔ وہ کہا کرتی ہے کہ مجھے رات میں نیند ہی نہیں آتی۔ ساری ہی رات جاگتی رہتی ہوں۔ اُس دن تجھے کیسے نیند آگئی؟ خلاصہ یہ کہ اُس کے دل میں کسی کی عزت۔ کسی کا اعتبار کسی کی محبت نہ رہی۔ روپے کے ساتھ ہی خلاق بھی اُس سے یک دم رخصت ہوگیا۔ جگہ بھر

کو دیکھ کر تو اس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا۔ اُسے بار بار چھیڑتا کہ یہ کسی طرح گرم پڑے تو اس کی خبر لوں۔ لیکن جگدھر اُس سے بچتا رہتا تھا۔ وہ کھلی چوٹیں کرنے کی بہ نسبت چھپی چوٹیں کرنے میں زیادہ ہوشیار تھا ؛

ایک روز شام کے وقت جگدھر طاہر علی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا طاہر علی نے پوچھا "کیسے چلے جی"؟

جگدھر۔ آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔ آبکاری کے داروگا ابھی مجھ سے ملے تھے۔ پوچھتے تھے۔ بھیرو گرام پر دکان رکھتا ہے کہ نہیں؟ میں نے کہا صاحب مجھے نہیں معلوم۔ تب چلے گئے۔ پر آج کل میں وہ اُس کی جانچ کرنے جرور آئیں گے۔ میں نے سوچا۔ کہیں آپ کی بھی سکایت نہ کر دیں۔ اِس لئے دوڑا آیا ہوں ؛

طاہر علی نے دوسرے ہی روز بھیرو کو وہاں سے بھگا دیا ؛

اس کے کئی دن بعد ایک روز رات کے وقت سورداس بیٹھا کھانا پکا رہا تھا کہ جگدھر نے آ کر کہا "کیوں سورداس۔ تمہاری امانت تو تمہیں مل گئی نا"؟

سورداس نے تجاہل سے کہا "کیسی امانت"؟

جگدھر۔ وہی روپے جو تمہاری جھونپڑی سے اُٹھ گئے تھے ؛

سورداس۔ میرے پاس روپے کہاں تھے؟

جگدھر۔ اب مجھ سے نہ اُڑو۔ رتی رتی بات جانتا ہوں اور خوشی ہوئی کہ کسی طرح تمہاری چیج (چیز) اس پاپی کے چنگل سے نکل آئی۔ سُبھاگی اپنی بات کی پکی ہے ؛

سورداس۔ جگدھر۔ مجھے اس جھمیلے میں نہ گھسیٹو۔ گریب آدمی ہوں بھیرو کے کان میں جرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری جان تو پیچھے لے گا پہلے سبھاگی کا گلا گھونٹ دے گا۔

جگدھر۔ میں اُس سے کہنے تھوڑے ہی جاتا ہوں۔ پر بات ہوئی میرے من کی۔ بچہ نے اتنے دنوں تک حلوائی کی دوکان میں خُوب دادے کا پھاتحہ پڑھا۔ دھرتی پر پاؤں ہی نہ رکھتا تھا۔ اب ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔

سورداس۔ تم ناحق میری جان کے پیچھے پڑے ہو۔

جگدھر۔ ایک بار کھل کھلا کر ہنس دو تو میں چلا جاؤں۔ اپنی گئی ہوئی چیج پا کر لوگ پھولے نہیں سماتے۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو ناچتا۔ کودتا۔ گاتا۔ بجاتا۔ تھوڑی دیر کے لئے پاگل ہو جاتا۔ اتنا ہنستا اتنا ہنستا کہ پیٹ میں باؤگولا پڑ جاتا۔ اور تم سونٹھ بنے بیٹھے ہو۔ لے ہنسو تو۔

سورداس۔ اِس بکھت ہنسی نہیں آتی۔

جگدھر۔ ہنسی کیوں نہ آئے گی۔ میں تو ہنسا دوں گا۔

یہ کہہ کر اُس نے سورداس کو گدگدانا شروع کیا۔ سورداس زندہ دل آدمی تھا۔ قہقہے مارنے لگا۔ حاسدانہ خوش طبعی کا عجیب نظارہ تھا۔ دونو تھیٹر کے نقالوں کی طرح ہنس رہے تھے اور یہ خبر نہ تھی کہ ہنسی کا انجام کیا ہوگا۔ شامت کی ماری سُبھاگی اُسی وقت ہلدی کی دوکان سے جنس لئے ہوئے آ رہی تھی۔ سورداس کے گھر سے بڑے زور کے قہقہے کی آواز سُنی تو تعجب ہوا کہ اندھے کنوئیں میں پانی کیسا؟ آ کر دروازہ پر کھڑی ہو گئی اور سورداس سے بولی "آج کیا مل گیا ہے سورداس جو پھولے

نہیں سماتے"؟

سورداس نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔ "میری تھیلی ہل گئی۔ چور کے گھر میں چھچھوربیٹھا"۔

سبھاگی۔ تو سب مال اکیلے ہضم کر جاؤ گے؟

سورداس۔ نہیں تجھے ایک کنٹھی لا دوں گا۔ ٹھاکر جی کا بھجن کرنا۔

سبھاگی۔ اپنی کنٹھی دھر رکھو۔ مجھے ایک سونے کا کنٹھا بنوا دینا۔

جگدھر۔ اسے چاہے کنٹھا بنوانا یا نہ بنوانا۔ اس کی بڑھیا کو ایک نتھ ضرور بنوا دینا۔ پوپلے منہ پر نتھ کھوب کھلے گی۔ جیسے کوئی بندریا نتھ پہنے ہو"۔

اس پر تینوں نے قہقہہ مارا۔ اتفاقاً بھیرو بھی اُسی وقت تھانے سے چلا آ رہا تھا۔ قہقہے کی آواز سُن کر اُس نے جھونپڑی کے اندر جھانکا۔ یہ آج کیسے گلچھرے اُڑا رہے ہیں؟ یہ تگڈم دیکھا تو آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جیسے کسی نے کلیجہ پر گرم لوہا رکھ دیا ہو۔ غصہ سے پاگل ہو گیا سخت سے سخت فحش سے فحش الفاظ کہے جیسے کوئی سورما اپنی جان بچانے کے لئے اپنے حربہ کا مہلک ترین استعمال کرے۔ "تو بدچلن ہے میرے دشمنوں کے ساتھ ہنستی ہے۔ فاحشہ کہیں کی۔ ٹکے ٹکے پر اپنی آبرو بیچتی ہے۔ خبردار جو آج سے میرے گھر میں کدم رکھا۔ خون چوس لوں گا۔ اگر اپنی کسل چاہتی ہے تو اس اندھے سے کہہ دے۔ پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھائے نہیں تو اُس کی اور تیری گردن ایک ہی گنڈاسے سے کاٹوں گا۔ میں تو اِدھر اُدھر مارا مارا پھروں۔ اور یہ کل مُنہی یاروں کے ساتھ نوک جھونک کرے۔ پاپی اندھے کو موت بھی نہیں آتی کہ محلہ

صاف ہو جائے۔ نہ جانے اس کے کرم میں کیا کیا دُکھ بھوگنا لکھا ہے۔ شاید جیل میں چکی پیس کر مرے گا"۔

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ سُبھاگی کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں معلوم ہوا۔ سر پر بجلی گر پڑی۔ جگدھر خوش ہو رہا تھا جیسے کوئی شکاری ہرن کو تڑپتے دیکھ کر خوش ہو۔ کیسا اُدھ کھلا رہا ہے۔ لیکن سورداس؟ آہ۔ اُس کی وہی حالت تھی جو کسی پاک باز عورت کی اپنی عصمت دری کے بعد ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک تینوں ساکت کھڑے رہے۔ بالآخر جگدھر نے کہا "سُبھاگی۔ اب تو کہاں جائے گی"؟

سبھاگی نے اُس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اپنے گھر جاؤں گی اور کہاں"۔

جگدھر۔ بگڑا ہوا ہے۔ جان لے کر چھوڑے گا۔

سُبھاگی۔ چاہے مارے۔ چاہے جلائے۔ گھر تو میرا وہی ہے۔

جگدھر۔ کہیں اور کیوں نہیں پڑ رہتی۔ گُسّا (غصّہ) اُتر جائے تو چلی جانا۔

سُبھاگی۔ تمہارے گھر چلتی ہوں رہنے دو گے؟

جگدھر۔ میرے گھر؟ مجھ سے تو وہ یونہی جلتا ہے۔ پھر تو خون ہی کر ڈالے گا۔

سُبھاگی۔ تمہیں اپنی جان اتنی پیاری ہے تو دوسرا کون اُس سے بَیر مول لے گا۔

یہ کہہ کر سُبھاگی فوراً اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ سورداس نے ہاں نہیں۔ کچھ نہ کہا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد جگدھر بولا "سورداس۔ تم

آج میرے گھر چل کر سو رہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ بھیرو رات کو کوئی اُپدر نہ مچائے۔ بد ماس آدمی ہے۔ اسکا کون ٹھکانا؟ مار پیٹ کرنے لگے۔

سورداس۔ بھیرو کو جتنا نادان سمجھتے ہو اتنا وہ نہیں ہے۔ تم سے کچھ نہ بولے گا۔ ہاں سُبھاگی کو جی بھر کے مارے گا۔

جگدھر۔ نسہ میں اُسے اپنی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔

سورداس۔ میں کہتا ہوں۔ تم سے کچھ نہ بولے گا۔ تم سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ تم سے لڑائی کرنے کی اُسے ہمت نہ پڑے گی۔

جگدھر کا خوف دور تو نہ ہوا مگر سورداس کی طرف سے ناامید ہو کر چلا گیا۔ سورداس ساری رات جاگتا رہا۔ اِس بھاری الزام کے بعد اُس کو اب وہاں رہنا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اب منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جانے کے سوا سے اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ میں نے تو کبھی کسی سے بُرائی نہیں کی۔ بھگوان مجھے کیوں یہ ڈنڈ دے رہے ہیں؟ یہ کن پاپوں کا پراشچت کرنا پڑ رہا ہے؟ تیرتھ جاترا سے چاہے یہ پاپ اُتر جائے۔ کل کہیں چل دینا چاہئے۔ پہلے بھی بھیرو نے مجھ پہ یہی پاپ لگایا تھا۔ تب سارے محلّہ کے لوگ مجھے مانتے تھے۔ اُس کی یہ بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ اُلٹے لوگوں نے اُسی کو ڈانٹا۔ اب کی تو سارا محلّہ میرا دسمن ہے۔ لوگ سہج ہی میں بسواس کر لیں گے۔ منہ میں کالکھ لگ جائے گی۔ نہیں اب یہاں سے بھاگ جانے ہی میں کھیریت ہے۔ دیوتوں کی سرن لوں۔ وہی اب میری رچھا کر سکتے ہیں۔ پر بچاری

سُبھاگی کا کیا حال ہوگا؟ بھیرو اب کی اُسے جرور چھوڑ دے گا۔ اُدھر میں
بھی چلا جاؤں گا تو بیچاری کیسے رہے گی؟ اُس کے نیہر میں بھی تو کوئی
نہیں ہے۔ جوان عورت ہے۔ محنت مجوری کر نہیں سکتی۔ نہ جانے کیسی پڑے
کیسی نہ پڑے۔ چل کر ایک بار بھیرو سے اکیلے میں ساری باتیں صاف
صاف کہہ دوں۔ بھیرو سے میری کبھی صفائی سے بات چیت نہیں ہوئی
اُس کے من میں گانٹھ پڑی ہوئی ہے۔ مَن میں میل رہنے ہی سے اُس
کو میرے اوپر ایسا بھرم ہوتا ہے۔ جب تک اُس کا من صاف نہ ہو
جائے۔ میرا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں۔ لوگ کہیں گے کام کیا تھا
تبھی تو ڈر کر بھاگا۔ نہ کرتا تو ڈرتا کیوں؟ یہ روپے بھی اُسے پھیر دوں
مگر جو اُس نے پوچھا کہ یہ کہاں ملے تو؟ سُبھاگی کا نام نہ بتاؤں گا۔
کہہ دوں گا مجھے جھونپڑی میں رکھے ہوئے ملے۔ اتنا چھپائے بنا
سُبھاگی کی جان نہ بچے گی۔ لیکن پردہ رکھنے سے صفائی کیسے ہوگی؟
چھپانے کا کام نہیں ہے۔ سب کچھ پورا پورا اور سچ سچ کہہ دوں گا۔
تبھی اس کا من صاف ہوگا۔

اس خیال سے اُسے گونہ تشفی ہوئی جیسے شاعر کو اُلجھے ہوئے
مضمون کے موزون ہو جانے سے ہوا کرتی ہے۔ وہ تڑکے ہی اُٹھا اور
جاکر بھیرو کے دروازہ پر آواز دی۔ بھیرو سویا ہوا تھا پر سبھاگی بیٹھی
رو رہی تھی۔ بھیرو نے اُس کے گھر پہنچتے ہی اُس کی خوب زدوکوب کی
تھی۔ سُبھاگی نے سورداس کی آواز پہچانی۔ چونکی کہ یہ اتنے تڑکے
میں کیسے آگیا۔ کہیں دونوں میں لڑائی نہ ہو جائے۔ سورداس کتنا
طاقتور ہے۔ یہ بات اُس سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ ڈر گئی کہ سورداس

رات کی باتوں کا بدلہ لینے نہ آیا ہو۔ یوں تو بڑا گم کھور ہے پر آدمی ہی ہے
غُصّہ آ گیا ہوگا۔ جھوٹا الجام سُن کر غُصّہ آتا ہی ہے۔ کہیں غُصّے میں آکر
انہیں مار نہ بیٹھے۔ پکڑ پائے گا تو پران ہی لے کر چھوڑے گا۔" سبھاگی
بھیرو کی مار کھاتی تھی۔ گھر سے نکالی جاتی تھی۔ لیکن یہ مجال نہ تھی کہ
کوئی باہری آدمی بھیرو کو کچھ کہہ کر نکل جائے۔ اُس کا منہ نوچ لیتی۔
اُس نے بھیرو کو نہ جگایا۔ دروازہ کھول کر پوچھا "کیا ہے سورداس؟
کیا کہتے ہو؟"

سورداس کا دل بے اختیار چاہا کہ اِس سے پوچھوں۔ رات
کو تجھ پر کیا بیتی۔ لیکن ضبط کر گیا۔ مجھے اِس سے واسطہ؟ اُس کی
عورت ہے۔ چاہے مارے چاہے دُلارے۔ میں کون ہوتا ہوں پوچھنے
والا؟ بولا "بھیرو کیا ابھی سوتے ہیں۔ جرا جگا دے۔ اُن سے کچھ باتیں
کرنی ہیں"۔

سُبھاگی۔ کون بات ہے؟ میں بھی سُنوں۔

سُورداس۔ ویسی ہی ایک بات ہے۔ جرا جگا تو دے۔

سُبھاگی۔ اِس بکھت جاؤ۔ پھر کبھی آ کر کہہ دینا۔

سُورداس۔ دوسرا کون بکھت آئے گا۔ میں سڑک پر جا بیٹھوں گا
انہیں بہت دیر نہ لگے گی۔

سُبھاگی۔ اور کبھی تو اتنے تڑکے نہ آتے تھے۔ آج ایسی کون سی بات
ہے؟

سورداس نے چڑ کر کہا "اُسی سے کہوں گا۔ مجھ سے کہنے کی بات
نہیں ہے"۔

سُبھاگی کو یقین کامل ہو گیا کہ یہ اِس وقت آپے میں نہیں ہے ضرور
مار پیٹ کرے گا۔ بولی "مجھے مارا پیٹا تھوڑے ہی تھا۔ بس وہیں جو
کچھ کہا سُنا وہی کہہ سُن کر رہ گئے"۔

سورداس۔ چل تیرے چلّانے کی آواز میں نے اپنے کانوں سُنی۔

سُبھاگی۔ مارنے کو دھمکاتا تھا۔ بس میں زور سے چلّانے لگی۔

سورداس۔ نہ مارا ہوگا۔ مارتا بھی تو مجھے کیا؟ تو اُس کی گھر والی ہے
جو چاہے کرے۔ تو جا کر اُسے بھیج دے مجھے ایک بات کہنی ہے۔

اب بھی سُبھاگی نہ گئی تو سورداس نے بھیرو کا نام لے کر زور زور
سے پکارنا شروع کیا۔ کئی ہانکوں کے بعد بھیرو کی آواز سُنائی دی۔
"کون ہے؟ بیٹھو آتا ہوں"۔

سُبھاگی یہ سُنتے ہی اندر گئی۔ اور بولی "جاتے ہو تو ایک ڈنڈا
لیتے جاؤ۔ سورداس ہے کہیں لڑنے نہ آیا ہو"۔

بھیرو۔ چل بیٹھ۔ لڑائی کرنے آیا ہے مجھ سے تریاچرتر مت کھیل۔

سُبھاگی۔ مجھے اُس کی تیوریاں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی
سے کہتی ہوں۔

بھیرو۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ تو ہی اُسے چڑھا کر لائی ہے۔ وہ تو
اتنا کینہ نہیں رکھتا۔ اُس کے مَن میں کبھی میل نہیں رہتا۔

یہ کہہ کر بھیرو نے اپنی لاٹھی اُٹھائی اور باہر آیا۔ اندھا شیر
بھی ہو تو اُس کا کیا خوف؟ اُسے تو ایک بچّہ بھی مار گرائے گا۔

سورداس نے بھیرو سے کہا "یہاں اور کوئی تو نہیں ہے۔ مجھے تم
سے ایک بھید کی بات کہنی ہے"۔

بھیرو۔ کوئی نہیں ہے۔ کہو کیا کہتے ہو؟
سورداس۔ تمہارے چور کا پتہ مل گیا۔
بھیرو۔ سچ۔ جوانی کی کسم؟
سورداس۔ ہاں۔ سچ کہتا ہوں۔ وہ میرے پاس آکر تمہارے روپے رکھ گیا۔ اور تو کوئی چیج نہیں گئی تھی؟
بھیرو۔ مجھے جلانے آئے ہو۔ ابھی من نہیں بھرا؟
سورداس۔ نہیں بھگوان سے کہتا ہوں۔ تمہاری تھیلی میرے گھر میں جوں کی توں پڑی ملی۔
بھیرو۔ بڑا پاگل تھا۔ پھر چوری کاہیکو کی تھی؟
سورداس۔ ہاں۔ پاگل ہی تھا اور کیا؟
بھیرو۔ کہاں ہے ذرا دیکھوں تو۔
سورداس نے تھیلی کمر سے نکال کر بھیرو کو دکھائی۔ بھیرو نے لپک کر تھیلی لے لی۔ وہ جوں کی توں بند تھی۔
سورداس۔ گن لو۔ پورے ہیں کہ نہیں۔
بھیرو۔ ہیں۔ پورے ہیں۔ سچ بتاؤ کس نے چرایا تھا۔
بھیرو کو روپے ملنے کی اُتنی خوشی نہ تھی جتنی چور کے نام معلوم کرنے کی خواہش۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں نے جس پر شک کیا تھا وہی ہے یا کوئی اور۔
سورداس۔ نام جان کر کیا کروگے۔ تمہیں اپنے مال سے مطلب ہے کہ چور کے نام سے۔
بھیرو۔ نہیں تمہیں کسم ہے۔ بتا دو۔ ہے تو اسی محلہ کا نا؟

سورداس۔ ہاں سہے تو محلہ ہی کا پر نام نہ بتاؤں گا ۔

بھیرو۔ جوانی کی قسم۔ میں اُس سے کچھ نہ کہوں گا ۔

سورداس۔ میں اُس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ نام نہ بتاؤں گا۔ نام بتادوں اور تم ابھی دنگا کرنے لگو تب؟

بھیرو۔ بسواس مانو۔ میں کسی سے نہ بولوں گا۔ جو کسم کہو کھا جاؤں۔ اگر جبان (زبان) کھولوں تو سمجھ لینا کہ اُس کی اصل میں پھرک (فرق) ہے۔ بات اور باپ ایک ہے۔ اب اور کون کسم لینا چاہتے ہو؟

سورداس۔ اگر بات سے پھر گئے تو یہیں تمہارے دروازے پر سر پٹک کر جان دے دوں گا ۔

بھیرو۔ اپنی جان کیوں دو گے؟ میری جان لے لینا۔ چوں تک نہ کروں گا ۔

سورداس۔ میرے گھر میں ایک بار چوری ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہے نا؟ چور کو ایسا سُبھا ہوا ہوگا کہ تم نے میرے روپے لئے ہیں۔ اسی سے اُس نے تمہارے یہاں چوری کی۔ اور مجھے روپے لا کر دے دیئے۔ بس اُس نے میری گریبی پر دیا کی اور کچھ نہیں۔ اُس سے میرا اور کوئی ناتا نہیں ہے ۔

بھیرو۔ اچھا۔ یہ سب تو سُن چکا۔ نام تو بتاؤ ۔

سورداس۔ دیکھو۔ تم نے کسم کھائی ہے ۔

بھیرو۔ ہاں بھائی۔ کسم سے پھرتا تھوڑے ہی ہوں ۔

سورداس۔ تمہاری گھر والی اور میری بہن سُبھاگی ۔

اتنا سننا تھا کہ بھیرو جیسے پاگل ہو گیا۔ گھر میں دوڑا ہوا گیا اور

ماں سے بولا۔ "آماں۔ اسی ڈائن نے میرے روپے چرائے تھے۔ سورداس اپنے منہ سے کہہ رہا ہے۔ اس طرح میرا گھر موس کر یہ چڑیل اپنے دھینگڑوں کا گھر بھرتی ہے۔ اس پر مجھ سے اوڑتی تھی۔ دیکھ تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ بتا سورداس جھوٹ کہتا ہے کہ سچ؟" سبھاگی نے سر جھکا کر کہا۔ "سورداس جھوٹ بولتے ہیں۔"

اُس کے منہ سے بات پوری نہ نکلنے پائی کہ بھیرو نے لکڑی کھینچ کر ماری۔ وار خالی گیا۔ اس سے بھیرو کا غصہ اور بھی بڑھا۔ وہ سبھاگی کے پیچھے دوڑا۔ سبھاگی نے ایک کوٹھڑی میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ بھیرو نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ سارے محلہ میں کہرام مچ گیا کہ بھیرو سبھاگی کو مارے ڈالتا ہے۔ لوگ دوڑ پڑے۔ ٹھاکر دین نے اندر جا کر دریافت کیا "کیا ہے بھیرو۔ کیوں کواڑ توڑے ڈالتے ہو؟ بھلے آدمی کوئی گھر کے آدمی پر اتنا گُسّا کرتا ہے۔"

بھیرو۔ کیسا گھر کا آدمی جی۔ ایسے گھر کے آدمی کا سر کاٹ لینا چاہیے جو دوسروں سے ہنسی دل لگی کرے۔ آخر میں کانا ہوں، اندھا ہوں، لنگڑا ہوں، لولا ہوں۔ مجھ میں کیا عیب ہے جو یہ دوسروں سے ہنسی دل لگی کرتی ہے؟ میں اس کی ناک کاٹ کر تبھی چھوڑوں گا۔ میرے گھر جو چوری ہوئی تھی وہ اسی چڑیل کی کرتوت تھی۔ اسی نے روپے چرا کر سورداس کو دیئے تھے۔

ٹھاکر دین۔ سورداس کو؟

بھیرو۔ ہاں ہاں۔ سورداس کو باہر تو کھڑا ہے۔ پوچھتے کیوں نہیں۔ اُس نے جب دیکھا کہ اب چوری نہ چھپے گی تو لا کر سب روپے مجھے دے

گیا ہے "

بجرنگی۔ اچھا تو روپے سُبھاگی نے چُرائے تھے!

لوگوں نے بھیرو کو ٹھنڈا کیا اور باہر کھینچ لائے۔ یہاں سورداس پر رائے زنی ہونے لگی۔ کسی کی ہمت نہ پڑی تھی۔ کہ صاف صاف کہے سب کے سب ڈر رہے تھے کہ کہیں میم صاحب سے شکایت نہ کردے مگر کنایتاً سبھی اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ سورداس کو آج معلوم ہوا کہ پہلے کوئی مجھ سے ڈرتا نہ تھا پر دل میں سب عزت کرتے تھے اب سب کے سب مجھ سے ڈرتے ہیں پر میری سچی عزت کسی کے دل میں نہیں ہے۔ اُسے اتنی ندامت تھی کہ وہ چاہتا تھا آسمان سے بجلی گرے اور میں یہیں جل بھُن جاؤں۔

ٹھاکردین نے آہستہ سے کہا۔ "سورداس تو کبھی ایسا نہ تھا۔ آج سے نہیں۔ لڑکپن سے دیکھتے ہیں"۔

نایک رام۔ پہلے نہیں تھا۔ اب ہوگیا ہے۔ اب تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

ٹھاکردین۔ کوئی بل پاکر تو سبھی کو گھمنڈ ہو جاتا ہے پر سورداس میں تو مجھے کوئی ایسی بات نہیں دکھائی دیتی۔

نایک رام۔ چھپا رستم ہے۔ بجرنگی۔ مجھے تمہارے اوپر شک تھا۔

بجرنگی۔ (ہنس کر) پنڈا جی۔ بھگوان سے کہتا ہوں کہ مجھے تمہارے اوپر شک تھا۔

بھیرو۔ اور مجھ سے جو سچ پوچھو تو جگدھر پر شک تھا۔

سورداس سر جھکائے چاروں طرف کے طعنے سُن رہا تھا پچھتا

رہا تھا کہ میں نے ایسے نیچ آدمی سے یہ بات کہی کیوں ۔ میں نے تو سمجھا تھا۔ صاف صاف کہہ دینے سے اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ اُس کا یہ پھل ملا ! میرے مُنہ میں تو کالکھ لگ ہی گئی۔ اُس بیچاری کا نہ جانے کیا حال ہوگا ۔ بھگوان اب کہاں گئے ؟ کیا کتھا پورانوں ہی میں اپنے سیوکوں کو اُبارنے آتے تھے ؟ اب کیوں نہیں آکاس سے کوئی دُوت آکر کہتا کہ اندھا بے قصور ہے ؟

جب بھیرد کے دروازہ پر یہ تماشہ ہوتے ہوئے نصف گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تو سور داس کے صبر کا پیالہ چھلک پڑا ۔ اب چپ رہنا اُس کے خیال میں بُزدلی تھی۔ کمینہ پن تھا۔ ایک پاک صاف عورت پر اتنا کلنک تھوپا جا رہا ہے اور میں چپ چاپ کھڑے سُنتا ہوں۔ یہ مہاپاپ ہے ۔ وہ تن کر کھڑا ہوگیا اور پھٹی ہوئی آنکھیں پھاڑ کر بولا۔" یارو ۔ کیوں بپت کے مارے ہوئے دُکھیا پر یہ کیچڑ پھینک رہے ہو ؟ کچھ تو بھگوان سے ڈرو۔ کیا سنسار میں کہیں نیائے نہیں رہا ؟ میں نے تو بھل منسی کی کہ بھیرد کے روپے اُسے لوٹا دیئے۔ اُس کا مجھے یہ پھل مل رہا ہے ! سبھاگی نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں مجھے روپے دیئے۔ یہ میں نہ بتاؤں گا۔ لیکن بھگوان میری اِس سے بھی زیادہ دُرگت کریں اگر میں نے سبھاگی کو اپنی چھوٹی بہن کے سوا کبھی کچھ اور سمجھا ہو۔ میرا اپراد اتنا ہی ہے کہ وہ رات کو میری جھونپڑی میں آئی تھی۔ اُس وقت جگدھر وہاں بیٹھا تھا۔ اُس سے پوچھو کہ ہم لوگوں میں کون سی باتیں ہو رہی تھیں ۔ اب اِس محلّہ میں مجھ جیسے اندھے اپاہج آدمی کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ جاتا ہوں پر اتنا کہے جاتا ہوں کہ سبھاگی پر جو کلنک لگائے گا

اس کا بھلا نہ ہوگا۔ وہ پاک صاف ہے۔ اُسے پاپ لگا کر کوئی سکھ کی نیند نہیں سو سکتا۔ میرا کون کوئی رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے دروازے کھڑا ہو جاؤں گا وہی ایک چٹکی آٹا دے دے گا۔ اب یہاں سے دانہ پانی اُٹھتا ہے۔ پر ایک دن آوے گا جب تم لوگوں کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی اور تب تم جانوگے کہ اندھا بے قصور تھا۔"

یہ کہہ کر سورداس اپنی جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔

(۲۴)

سورداس کی زمین واپس دلا دینے کے بعد صوفیہ پھر مسٹر کلارک سے کھنچ گئی۔ دن گذرتے جاتے تھے۔ اور وہ مسٹر کلارک سے دور تر ہوتی جاتی تھی۔ اس کو اب اپنی سچی محبت کے لئے ذلیل و رسوا ہونے کی بہ نسبت مصنوعی محبت کا سوانگ بھرنا کہیں زیادہ ناقابل برداشت معلوم ہوتا تھا۔ سوچتی تھی کہ میں پانی سے بچنے کے لئے آگ میں کود پڑی۔ فطرت پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے اپنے دل کو جبراً ونے کی طرف سے ہٹانا چاہا تھا اب وہی دل بڑی تیزی کے ساتھ اُن کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اُس طرف اُس نے بھگتی (زہد) کے متعلق چند کتابیں پڑھی تھیں اور نتیجہ یہ تھا کہ اُس کے خیالات میں ایک تغیر ہو گیا تھا۔ ذلت و بدنامی کا خوف اُس کے دل سے مٹنے لگا تھا۔ اس کے سامنے محبت کا بلند ترین معیار تھا جہاں خودی کی آواز نہیں پہنچتی۔ زاہد خشک نے بادۂ احمر کا مزہ پا لیا تھا اور نشہ میں اب اُس کو دنیاوی عیش و آرام۔ عزت و فضیلت سب ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ جن خیالات سے متاثر ہو کر اُس نے ونے سے محترز رہنے اور کلارک سے عقد کرنے کا

فیصلہ کیا تھا وہ اب اُس کو سراسر غیر فطری معلوم ہوتے تھے۔ رانی جانہوی کے ہاتھوں ذلیل ہوکر اپنے نفس کی تنبیہ کے لئے اُس نے اپنے اوپر یہ ظلم گوارا کیا تھا۔ مگر اب اُس کو یہی نہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے اطوار میں خرابی کی کون سی بات تھی۔ اُس میں ناموزونیت کیا تھی؟ اُس کا دل اب اس فیصلہ کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔ وہ خود اُس فیصلہ کو قابل نفرت سمجھ رہی تھی۔ اُسے تعجب ہوتا تھا کہ میں نے دنے کی جگہ پر کلارک کو لا بٹھانے کا فیصلہ کیونکر کیا؟ مسٹر کلارک میں ذاتی اوصاف کی کمی نہیں۔ وہ قابل ہیں۔ شریف ہیں۔ فیاض ہیں۔ نیک دل ہیں۔ وہ کسی ایسی عورت کو خوش و خرم رکھ سکتے ہیں جسے دنیاوی عیش و آرام کی تمنا ہو۔ لیکن اُن میں وہ ایثار کہاں۔ وہ خدمت کا جذبہ کہاں۔ وہ زندگی کا اونچا معیار کہاں۔ وہ مردانہ عہد کہاں۔ وہ شوقِ شہادت کہاں؟ اسے اب محبت کی داستانیں اور صوفیانہ رنگ کی نظمیں۔ جیو اور آتما۔ حادث و قدیم۔ تناسخ اور سخاوت وغیرہ وغیرہ ادق مسایل کی توضیح و تشریح کے مقابلہ میں زیادہ دل کش معلوم ہوتی تھیں۔ اسی درمیان میں اُسے کرشن کے سوانحی حالات مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس نے اُس اعتقاد کی جڑ ہلا دی جو اُسے حضرت عیسیٰ پر تھا۔ وہ دل میں دونوں کا موازنہ کرتی۔ مسیح کے رحم کی بہ نسبت اسے کرشن کی محبت سے زیادہ تسکین ہوتی تھی۔ اُس نے اب تک گیتا ہی کے کرشن کو دیکھا تھا۔ اور مسیح کی دیا، خدمت اور پاکیزگی کے سامنے اسے کرشن کی پُر اسرار زندگی گیتا کی مشکل فلسفیانہ تشریحات سے بھی زیادہ ناقابل فہم معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا سر گیتا کے اعلیٰ تخیل کے سامنے جھک جاتا تھا۔ مگر اُس سے دل میں بھگتی کا جذبہ نہ

ا ہوتا تھا۔ کرشن کی طفلانہ زندگی کو اُس نے عقیدت مندوں کی فرضی
ں سمجھ رکھا تھا۔ اور اس پر غور کرنا ہی فضول سمجھتی تھی۔ لیکن اب عیسیٰ کا
کرشن کے طفلانہ کھیلوں کے سامنے بالکل خشک سا معلوم ہوتا تھا۔
لی کے رحم میں روحانیت تھی۔ کرشن کی محبت میں جذبہ تھا۔ عیسلے
رحم آسمان کی طرح غیر محدود تھا۔ کرشن کی محبت ایک خوشگفتہ باغ
طرح دلفریب تھی۔ عیسیٰ کا رحم دریا کا نغمۂ شیریں تھا۔ کرشن کی
ت بنسی کی صبر آزما آواز۔ ایک فرشتہ تھا۔ دوسرا انسان۔ ایک
ر تھا۔ دوسرا شاعر۔ ایک میں بیداری اور دانائی تھی۔ دوسرے
ں رنگینی و دیوانگی ایک تاجر تھا۔ نفع و نقصان پر نگاہ رکھنے والا۔ دوسرا
فین تھا۔ اپنے نقد و جنس کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے والا۔ ایک محتاط
تو دوسرا آلودہ۔ اب صوفیہ کا دل ہمیشہ اسی محبت کے کھیل میں محو
نا تھا۔ کرشن نے اُسے فریفتہ کر لیا تھا۔ اُسے اپنی بنسی کی صدا سنا دی تھی۔

مسٹر کلارک کی دلجوئیاں اب اُسے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھیں۔ وہ
تی تھی کہ یہ ساری محبت آفرینیاں ایک آزمایش کی تاب بھی نہیں لا
یں۔ وہ اکثر اُن سے بے اعتنائی برتتی۔ وہ باہر سے مسکراتے ہوئے آکر
ں کی بغل میں کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتے اور یہ اُن کی طرف آنکھیں اُٹھا
ہی نہ دیکھتی۔ یہاں تک کہ کئی بار اُس نے اپنی مذہبی بد اعتقادیوں
مسٹر کلارک کے مذہبی دل کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اُنہیں صوفیہ ایک
سی معلوم ہوتی تھی جسے سمجھنے میں وہ قاصر تھے۔ اُس کا بیمثال حسن اُس
فریب انداز۔ اُس کی غیر معمولی ذہانت جتنے زور سے اپنی طرف
پتی تھیں اتنا ہی اُس کی تمکنت۔ آزاد خیالی اور بیباکی۔ اُنہیں خائف

کر دیتی تھیں - اُس کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ اپنی پستی کو محسوس کرتے تھے -
اور لمحہ بہ لمحہ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں - اسی وجہ
سے اتنی بے تکلفی کے باوجود بھی انہیں اُس سے شادی کا وعدہ لینے کی ہمت
نہ پڑتی تھی - مسز سیوک آگ میں ایندھن ڈالتی رہتی تھیں - ایک طرف
کلارک کو اُکساتیں - دوسری طرف صوفی کو سمجھاتیں "تو سمجھتی ہے کہ زندگی
میں ایسے موقع بار بار آتے ہیں مگر یہ تیری غلطی ہے - انسان کو صرف
ایک موقع ملتا ہے اور وہی اُس کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے" ۔

مسٹر جان سیوک نے بھی اپنے پدر بزرگوار کے حسب الحکم دورخی
چال چلنا شروع کر دی - وہ پوشیدہ طور سے تو راجہ مہیندر کمار سنگھ کی کل
گھماتے رہتے مگر ظاہر میں مسٹر کلارک کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ
فروگذاشت نہ کرتے - رہے مسٹر ایشور سیوک - وہ تو سمجھتے تھے کہ خدا نے
صوفیہ کو مسٹر کلارک ہی کے لئے بنایا ہے - یہ اکثر اُن کے یہاں جاتے تھے اور
وہیں کھانا بھی کھا لیتے تھے - جیسے کوئی دلال گاہک کو دیکھ کر اُس کے
پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے اور اُسے کسی دوسری دوکان پر بیٹھنے نہیں دیتا ویسے
ہی وہ مسٹر کلارک کو گھیرے رہتے تھے کہ کوئی اونچی دوکان انہیں متوجہ
نہ کرے - مگر اتنے خیر خواہوں کے رہتے ہوئے بھی مسٹر کلارک کو اپنی کامیابی
مشکل معلوم ہوتی تھی ۔

صوفیہ کو ان دنوں بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہو گیا تھا - اب تک اُس
نے مانگ چوٹی یا زیور اور لباس کی کبھی پرواہ نہ کی تھی - تن آسانیوں
سے دور رہنا چاہتی تھی - مذہبی کتب کی یہی تعلیم تھی کہ جسم فانی ہے اور
دُنیا بے ثبات اور زندگی سُراب کی طرح ہے - پس اُس کے لئے آرایش و

زیبائش کی ضرورت نہیں۔ اصلی آرائش کچھ اور ہی ہے۔ اُسی پر نگاہ رکھنی چاہئے۔ لیکن اب وہ زندگی کو اس قدر حقیر نہ سمجھتی تھی۔ اُس کے حُسن میں کبھی اتنی شانِ رعنائی نہ تھی۔ وہ بننے ٹھننے کے لئے کبھی اتنی بیقرار نہ تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج کی ٹھنڈی کرنیں کسی دیوتا کی دعا کی طرح نونہالانِ باغ کے دلوں کو شگفتہ کر رہی تھی۔ صوفیہ ایک کنج میں کھڑی خود بخود مُسکرا رہی تھی۔ کہ مسٹر کلارک کا موٹر آ پہنچا۔ وہ صوفیہ کو باغ میں دیکھ کر سیدھے اس کے پاس گئے اور ایک التفات طلب نظر سے دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیہ نے مُنہ پھیر لیا گویا اُس نے اُن کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھا نہیں۔

یکایک ایک لمحہ کے بعد صوفیہ نے تمسخر کے انداز سے پوچھا "آج کتنے مجرموں کو سزا دی"؟

مسٹر کلارک خفیف ہوئے۔ رُکتے ہوئے بولے "پیاری یہ تو روز کی باتیں ہیں۔ اُن کا کیا چرچا کروں"۔

صوفیہ۔ تم یہ کیسے تحقیق کرتے ہو کہ فلاں مجرم دراصل مجرم ہے؟ اس کا تمہارے پاس کوئی آلہ ہے؟

کلارک۔ گواہ تو رہتے ہیں۔

صوفیہ۔ گواہ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں؟

کلارک۔ ہرگز نہیں۔ گواہ اکثر جھوٹے اور سکھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

صوفیہ۔ اور اُنہیں گواہوں کے بیان پر فیصلہ کرتے ہو؟

کلارک۔ اُس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟

صوفیہ۔ تمہاری بیچارگی دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ڈالے؟

اس لئے کہ تمہارے واسطے موٹر کار۔ بنگلہ۔ خانسامے طرح طرح کی شرابیں اور تفریح کے دیگر سازو سامان مہیا کئے جائیں؟

کلارک نے خفت آمیز لہجہ میں کہا "تو کیا ملازمت سے استعفے دے دوں؟"

صوفیہ۔ جب تم جانتے ہو کہ موجودہ طرز حکومت میں اتنی خامیاں ہیں تو تم اُس کا ایک رُکن بن کر بیگناہوں کا خون کیوں کرتے ہو؟

کلارک۔ پیاری میں نے اس بارہ میں کبھی غور نہیں کیا۔

صوفیہ۔ اور بلا غور کئے ہی روز انصاف کا خون کیا کرتے ہو؟ کتنے بیدرد ہو!

کلارک۔ ہم تو صرف ایک مشین کے پرزہ ہیں ہمیں اتنا سوچنے سے کیا مطلب؟

صوفیہ۔ کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا؟

کلارک۔ ایسا دعویٰ کوئی انسان نہیں کرسکتا۔

صوفیہ۔ تو تم اس لئے سزا سے بچے ہوئے ہو کہ تمہارے جرم پوشیدہ ہیں؟

کلارک۔ ایسا قبول کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر مجبوراً قبول کرنا ہی پڑے گا۔

صوفیہ۔ تعجب ہے کہ خود مجرم ہو کر تمہیں دیگر مجرموں کو سزا دیتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی!

کلارک۔ صوفیہ۔ اس کے لئے تم پھر کبھی میری توہین کر لینا۔ اس وقت مجھے ایک خاص معاملہ میں تم سے صلاح لینی ہے۔ خوب سوچ کر رائے دینا

راجہ مہیندر کمار نے میرے فیصلہ کا اپیل گورنر کے یہاں کیا تھا۔ اُس کا ذکر تو میں تم سے کر ہی چکا ہوں۔ اُس وقت میں نے سمجھا تھا گورنر اپیل پر توجہ نہ دیں گے۔ ایک حاکم ضلع کے خلاف کسی رئیس کی مدد کرنا ہمارے طرزِ حکومت کے خلاف ہے کیونکہ اِس سے حکومت میں خلل آتا ہے۔ لیکن چھ سات مہینوں میں واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی ہے اور راجہ صاحب نے اپنی خاندانی عزت، مستقل ارادہ اور استدلالی قوت سے ایسی اچھی طرح کام لیا ہے کہ اب گورنر کا فیصلہ شاید میرے خلاف ہوگا۔ کونسل میں ہندوستانیوں کی کثرت ہو جانے کے باعث اب گورنر کی ذاتی رائے کی اہمیت بہت کم ہو گئی۔ اگر چہ وہ کونسل کے فیصلہ کو مسترد کر سکتے ہیں مگر اِس اختیار سے وہ خاص حالتوں ہی میں مدد لے سکتے ہیں۔ اگر راجہ صاحب کا اپیل واپس کر دیا گیا تو دوسرے روز ملک بھر میں کہرام مچ جائے گا اور اخبارات کو غیر ملکی حکومت کے ایک نئے ظلم پر شور مچانے کا وہ موقع مل جائے گا جسے وہ روز کھوجتے رہتے ہیں۔ اس لئے گورنر نے مجھ سے پوچھا ہے کہ اگر راجہ صاحب کی اشک شوئی کر دی جائے تو تمہیں کچھ ملال تو نہ ہوگا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کا کیا جواب دوں۔ ابھی تک کوئی رائے قایم نہیں کر سکا۔

صوفیہ۔ کیا رائے قائم کرنا اتنا مشکل ہے؟

کلارک۔ ہاں۔ اس لئے مشکل ہے کہ رائے عامہ سے حکومت کرنے کا جو بندوبست ہم لوگوں نے خود ہی کیا ہے اُسے پیروں تلے کچلنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ کتنا ہی طاقت ور ہو لیکن انصاف کا پردہ رکھنے کے لئے کبھی کبھی اُسے بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ میرے لئے کوئی بات

نہیں۔ فیصلہ میرے موافق ہو یا خلاف۔ میرے اوپر اُس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ رعایا پر ہمارے انصاف کی دھاک اور بیٹھی جاتی ہے۔ (مسکرا کر) گورنر نے مجھے اس جرم کے لئے سزا بھی دی ہے۔ وہ مجھے یہاں سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔

صوفیہ۔ کیا تمہیں استعفا دینا پڑے گا؟

کلارک۔ ہاں۔ میں ایک ریاست کا پولیٹیکل ایجنٹ بنا دیا جاؤں گا۔ یہ عہدہ بڑے مزہ کا ہے۔ راجہ تو صرف نام کے لئے ہوتا ہے۔ پورا اختیار تو ایجنٹ ہی کو رہتا ہے۔ ہم لوگوں میں جو بڑے خوش نصیب ہیں انہیں کو یہ منصب ملتا ہے۔

صوفیہ۔ تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو۔

مسٹر کلارک اس طنز سے دل ہی میں کُڑھ کر رہ گئے۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ صوفیہ یہ خبر سُن کر پھولی نہ سمائے گی اور تبھی مجھے یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ یہاں سے جانے کے پہلے ہمارا عقد ہو جانا ضروری ہے "تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو" اس بیدردانہ طنز نے اُن کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس جملہ میں وہ مغائرت وہ طنز وہ بےاعتنائی بھری ہوئی تھی۔ جو دوستانہ دلجوئی کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔ وہ سوچنے لگے کہ اُس کی رائے کا انتظار کئے بغیر ہی میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ کہیں یہی بات تو اسے بُری نہیں لگی؟ شاید سمجھتی ہو کہ یہ اپنے ذاتی فائدہ سے اتنا خوش ہو رہے ہیں مگر اُس بیکس اندھے کی انہیں ذرا بھی پرواہ نہیں کہ اُس پر کیا گزرے گی۔ اگر یہی کرنا تھا تو یہ راگ ہی کیوں چھیڑا تھا۔ یہ سوچ کر وہ بولے "یہ تو تمہارے فیصلہ پر منحصر ہے"۔

صوفیہ نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ "اِن معاملات میں تم مجھ سے زیادہ ہوشیار رہو" ×

کلارک۔ اُس اندھے کا خیال ہے ×

صوفیہ نے بیرحمی سے کہا۔ "اُس اندھے کے خدا تمہیں نہیں ہو" ×

کلارک۔ میں تم سے صلاح پوچھتا ہوں اور تم مجھی پر چھوڑنی جاتی ہو ×

صوفیہ۔ اگر میری صلاح سے تمہارا نقصان ہو تو؟

کلارک نے دلیری سے جواب دیا۔ "صوفیہ۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں" ×

صوفیہ۔ (ہنس کر) اس کے لئے میں تمہاری بہت ممنون ہوں ×

اسی اثنا میں مسز سیوک وہاں آگئیں اور کلارک سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔ صوفیہ نے دیکھا اب مسٹر کلارک کو بنانے کا موقع نہیں رہا۔ تو اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ دیکھا تو پربھو سیوک وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ صوفیہ نے کہا۔ "اِن حضرت کو اب یہاں سے بوریا بندھنا سنبھالنا پڑے گا۔ کسی ریاست کے ایجنٹ ہوں گے" ×

پربھو سیوک۔ (چونک کر) کب؟

صوفیہ۔ بہت جلد۔ راجہ مہیندر کمار انہیں لے بیٹھے ×

پربھو سیوک۔ تب تو تم بھی یہاں تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہو ×

صوفیہ۔ میں ان سے شادی نہ کروں گی ×

پربھو سیوک۔ سچ؟

صوفیہ۔ ہاں میں کئی دن سے یہ فیصلہ کر چکی ہوں یہ تم سے کہنے کا موقع نہیں ملا ×

پربھوسیلوک۔ کیا ڈرتی تھیں کہ کہیں میں شور نہ مچادوں ؟

صوفیہ۔ بات تو واقعی یہی تھی ۔

پربھوسیلوک۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ پر اس قدر بے اعتباری کیوں کرتی ہو ؟ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے تمہاری بات کسی سے نہیں کہی ۔

صوفیہ۔ معاف کرنا پربھو۔ نہ جانے کیوں مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہوتا۔ تم میں ابھی کچھ ایسا لڑکپن ہے۔ کچھ ایسے کھلے ہوئے بے فکر آدمی ہو کہ میں تم سے کوئی بات کہتے اسی طرح ڈرتی ہوں جیسے کوئی شخص درخت کے نازک شاخ پر پیر رکھتے ڈرتا ہے ۔

پربھوسیلوک۔ اچھی بات ہے۔ یونہی مجھ سے ڈرا کرو۔ واقعی میں کوئی بات سن لیتا ہوں تو میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے ہیں۔ اور جب تک کسی سے کہہ نہ دوں مجھے چین ہی نہیں آتا۔ خیر میں تمہیں اس فیصلہ پر مبارک باد دیتا ہوں۔ میں نے تم سے صاف طور پر تو کبھی نہیں کہا مگر کئی بار کنایتاً کہہ چکا ہوں کہ مجھے کسی حالت میں کلارک کو اپنا بہنوئی بنانا ناپسند نہیں ہے مجھے جانے کیوں اُن سے چڑ ہے۔ وہ بیچارے میری بہت خاطر کرتے ہیں مگر میرا جی اُن سے نہیں ملتا۔ ایک بار میں نے اُن کو اپنی ایک نظم سُنائی تھی۔ اُسی دن سے مجھے اُن سے کچھ چڑ ہوگئی ہے بیٹھے سونٹھ بنے سُنتے رہے۔ گویا میں کسی دوسرے آدمی سے باتیں کررہا ہوں۔ شعریت سے کچھ مَس ہی نہیں۔ انہیں دیکھ کر بس یہی دل میں آتا ہے کہ خوب بناؤں۔ میں نے کتنے ہی لوگوں کو اپنا کلام سنایا ہوگا مگر ونے جیسا سخن شناس کوئی نہیں ملا

اگر وہ کچھ لکھیں تو خوب لکھیں۔ شعریت گویا اُن کی گھٹی میں پڑی ہے"
صوفیہ۔ تم ادھر کبھی کنور صاحب کی طرف نہیں گئے تھے؟
پربھوسیوک۔ آج گیا تھا اور وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ ونے سنگھ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اودے پور کے حاکموں نے انہیں جیل میں ڈال رکھا ہے۔

صوفیہ کے چہرہ پر غصہ یا رنج کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اُس نے یہ نہ پوچھا کہ کیوں گرفتار ہوئے۔ کیا قصور تھا؟ یہ ساری باتیں اُن سے انکل سے معلوم کرلیں۔ صرف اتنا پوچھا "رانی صاحبہ تو وہاں نہیں جا رہی ہیں"؟
پربھوسیوک۔ نہیں۔ کنور صاحب اور ڈاکٹر گنگولی دونوں جانے کو تیار ہیں مگر رانی کسی کو نہیں جانے دیتیں۔ کہ ونے اپنی مدد آپ کرسکتا ہے۔ اُسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔

صوفیہ تھوڑی دیر تک گہری سوچ بچار میں خاموش بیٹھی رہی۔ ونے کی مردانہ صورت اُس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ یکایک اُس نے سر اُٹھایا اور طے شدہ طریقہ پر بولی "میں اودے پور جاؤں گی"۔
پربھوسیوک۔ وہاں جاکر کیا کرو گی؟
صوفیہ۔ یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہاں جاکر کیا کروں گی۔ اگر اور کچھ نہ کرسکوں گی تو کم از کم جیل میں رہ کر ونے کی خدمت تو کرسکونگی۔ اپنی جان تو اُن پر قربان کردوں گی۔ میں نے اُن کے ساتھ جو بیوفائی کی ہے۔ خواہ کسی ارادہ سے کی ہو۔ وہ ہر وقت میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھا کرتی ہے۔ اُس سے اُن کو جو رنج ہوا ہوگا اُس کا خیال

تے ہی میرا دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ اب میں اُس گناہ کا کفارہ کروں گی
سی اور طریقہ پر نہیں تو اپنی جان دے کر۔

یہ کہہ کر صوفیہ نے کھڑکی سے جھانکا تو مسٹر کلارک ابھی تک کھڑے
سز سیوک سے باتیں کر رہے تھے۔ موٹر بھی کھڑا تھا۔ وہ فوراً باہر آ کر
سٹر کلارک سے بولی "ولیم آج ماما ہی سے باتیں کرنے میں رات ختم کر
دگے؟ میں سیر کرنے کے لئے تمہارا انتظار کر رہی ہوں"۔

لہجہ کتنا شیریں تھا۔ کس دلربایانہ انداز سے کنول جیسی آنکھوں
یں دلفریب ہنسی کا کتنا جادو بھر کر یہ محبت آمیز التجا کی گئی تھی۔ کلارک
نے معذرت آمیز نگاہوں سے صوفیہ کو دیکھا "یہ وہی صوفیہ ہے جو ابھی
را دیر پہلے میرا مضحکہ اُڑا رہی تھی"۔ اس وقت پانی پر آسمان کا تاریک
کس تھا۔ اب اُسی پانی پر چاند کی سنہری کرنیں ناچ رہی تھیں۔ سی
رانے ہوئے پانی کا کانپتا ہُوا ہنستا ہُوا اور شوخی سے بھرا ہُوا جلوہ
س کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ وہ نادم ہو کر بولے "پیاری معاف
رو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ باتوں میں دیر ہو گئی"۔

صوفیہ نے ماں کی طرف سادگی سے دیکھتے ہوئے کہا "ماما دیکھنی
ہو ان کی بے رُخی۔ یہ ابھی سے مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ میری اتنی
دبھی نہ رہی کہ ایک بار تو رفع شکایت ہی کے لئے پوچھ لیتے۔ سیر کرنے
چلے گی؟"

مسز سیوک۔ ہاں۔ ولیم! یہ تمہاری زیادتی ہے۔ آج صوفیہ نے
نہیں آلودہ ہاتھوں گرفتار کر لیا۔ میں تمہیں بے خطا سمجھتی تھی اور
مرف اُسی کو خطاوار۔

کلارک نے کچھ مسکرا کر اپنی خفت مٹائی اور صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر کی طرف چلے۔ مگر اب بھی انہیں شک تھا کہ میرے ہاتھ میں جو نازک کلائی ہے وہ دراصل کوئی شے ہے یا محض خواب و خیال یعنی اور بھی پیچیدہ ہوتا ہوا نظر آتا تھا یہ کوئی بندر نچانے والی مداری ہے یا کوئی معصوم بچہ جو بندر کو دور سے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُسے مٹھائی دیتا ہے مگر بندر کے نزدیک آتے ہی خوف سے چیخنے لگتا ہے۔

جب موٹر چلا تو صوفیہ نے کہا "پولٹیکل ایجنٹ کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ چاہے تو ریاست کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کر سکتا ہے۔ کیوں؟"

کلارک نے خوش ہو کر کہا "اس کا اختیار سب جگہ۔ یہاں تک کہ راجہ کے محل کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ریاست کا ذکر ہی کیا وہ راجہ کے کھانے سونے آرام کرنے کا وقت تک معین کر سکتا ہے۔ راجہ کس سے ملے۔ کس سے دور رہے۔ کس کی عزت کرے۔ کس کی بے عزتی کرے۔ یہ سب باتیں ایجنٹ کے اختیار میں ہے۔ وہ یہاں تک طے کر سکتا ہے کہ راجہ کی میز پر کون کون سے کھانے آئیں گے۔ راجہ کے لئے کتنے اور کیسے کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ راجہ کی شادی کے متعلق بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ بس یہی سمجھو کہ وہ ریاست کا خدا ہوتا ہے۔"

صوفیہ۔ تب تو وہاں سیر و تفریح کے لئے بھی کافی موقع ملے گا۔ یہاں کی طرح تمام دن دفتر میں تو نہ بیٹھنا پڑے گا؟

کلارک۔ وہاں کیسا دفتر۔ ایجنٹ کا کام دفتر میں بیٹھنا نہیں ہے۔ وہ وہاں ملک معظم کا قائمقام ہوتا ہے۔

صوفیہ۔ اچھا تم جس ریاست میں چاہو جا سکتے ہو؟
کلارک۔ ہاں۔ صرف پہلے سے کچھ خط و کتابت کرنی پڑے گی۔ تم کون سی ریاست پسند کرو گی؟
صوفیہ۔ مجھے تو کوہستانی علاقوں سے خاص اُنس ہے پہاڑوں کے دامن میں بسے ہوئے گاؤں۔ پہاڑوں کی گود میں چرنے والی بھیڑیں اور پہاڑوں سے گرنے والے آبشار۔ یہ سبھی مناظر مجھے شعریت سے مملو معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری ہی دُنیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ پُرسکون و دلکش کوہستان میرے لئے ایک دل کش خواب ہے۔ پہاڑوں میں کون کون سی ریاستیں ہیں؟
کلارک۔ بھرت پور۔ جودھ پور۔ کشمیر۔ اودے پور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
صوفیہ۔ بس تم اودے پور کے لئے لکھو۔ میں نے تاریخ اودے پور کی جوش بھری داستانیں پڑھی ہیں اور جبھی سے مجھے اُس علاقہ کے دیکھنے کا شوق ہے۔ وہاں کے راجپوت کتنے بہادر کتنے آزادی پسند کتنے آن پر جان دینے والے ہوتے تھے۔ لکھا ہے کہ چتوڑ میں جتنے راجپوت شہید ہوئے اُن کے زناروں کا وزن پچھتر من تھا۔ کئی ہزار راجپوتنیاں ایک ساتھ چتا میں جل کر خاک ہو گئیں۔ ایسی بات پرست جلنے والی ہستیاں دُنیا میں شاید ہی اور کہیں ہوں۔
کلارک۔ ہاں یہ واقعات میں نے بھی تاریخوں میں دیکھے ہیں۔ ایسی جانباز قوم کی جتنی بھی عزت کی جائے۔ کم ہے۔ اسی لئے تو اودے پور کا راجہ ہندو راجاؤں میں افضل ترین سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی بہادری کی داستانیں بہت کچھ مبالغہ آمیز ہیں۔ پھر بھی یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ان

مُلک میں ایسی جانباز دوسری قوم نہیں ۔

صوفیہ ۔ تم آج ہی اودے پور کے لئے لکھو اور ممکن ہو تو ہم لوگ ایک ماہ کے اندر وہاں کو روانہ ہو جائیں ۔

کلارک ۔ لیکن ...... کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے ...... تم میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی ...... یہاں سے چلنے کے قبل میں تم سے وہ دیرینہ ...... میری زندگی ......

صوفیہ نے مُسکرا کر کہا ۔ میں سمجھ گئی ۔ اُسے ظاہر کرنے کی تکلیف نہ اُٹھاؤ ۔ اتنی کوتاہ فہم نہیں ہوں لیکن میری قوتِ فیصلہ نہایت سست ہے ۔ یہاں تک کہ سیر کرنے کے لئے جانے کا فیصلہ بھی میں گھنٹوں تک سوچنے کے بعد ہی کر سکتی ہوں ۔ ایسے اہم معاملہ میں جس کا تعلق عمر بھر رہے گا ۔ میں اتنی جلد کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی ۔ بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ میں ہنوز یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھ جیسی بے فکر اور آزاد خیال عورت متاہلانہ زندگی کے قابل بھی ہے یا نہیں ۔ ولیم میں تم سے دل کی بات کہتی ہوں ۔ خانہ داری کی زندگی سے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے ۔ اس لئے تم جب تک میرے مزاج سے بخوبی واقف نہ ہو جاؤ ۔ میں تمہارے دل میں جھوٹی اُمیدیں پیدا کر کے تمہیں مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی ۔ ابھی میری اور تمہاری ملاقات صرف ایک سال سے ہے ۔ اب تک میں تمہارے لئے ایک سربستہ راز ہوں ۔ کیوں ہے یا نہیں ؟

کلارک ۔ ہاں ۔ صوفیہ ۔ واقعی میں تمہیں بخوبی نہیں پہچان پایا ہوں ۔

صوفیہ ۔ پھر ایسی حالت میں تمہیں سوچو کہ ہم دونوں کا رشتۂ عقد میں

بندھ جانا کتنی بڑی نادانی ہے میرے دل کی جو پوچھو تو مجھے ایک نیک
دل۔ شریف۔ خوش فہم اور خوش اخلاق شخص کے ساتھ دوست بن
کر رہنا اُس کی بیوی بن کر رہنے کے مقابلہ میں کم پُرلطف نہیں معلوم
ہوتا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کا مجھے علم نہیں لیکن میں زن و شوہر کے
تعلق کو دو دلوں کے ملاپ کی بہترین صورت نہیں خیال کرتی۔ میں
باہمی رہائش و ہمدردی کو نفس پرستی والے تعلقات سے بدرجہا بہتر سمجھتی ہوں
کلارک۔ مگر جماعتی اور مذہبی رسم و رواج ایسے تعلقات کو ......
صوفیہ۔ ہاں ایسے تعلقات فطرت کے منافی ہوتے ہیں اور معمولاً ناقابلِ
عمل۔ میں بھی اسے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی کا اصول بنانے کو تیار نہیں
ہوں۔ لیکن جب تک ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں جب
تک ہمارے باطن ایک دوسرے کے سامنے آئینہ نہ بن جائیں۔
اس وقت تک میں اسی قسم کے تعلقات کو ضروری خیال کرتی ہوں۔
کلارک۔ میں تمہاری مرضی کا غلام ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ
تمہارے بغیر میری زندگی وہ مکان ہے جس میں مکین نہیں۔ وہ چراغ
ہے جس میں روشنی نہیں۔ وہ شعر ہے جس میں تاثیر نہیں۔
صوفیہ۔ بس بس۔ یہ عاشقانہ گفتگو صرف عشقیہ کتب کے لئے زینت
بخش ہے۔ یہ لو، پانڈے پور آگئے۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ سورداس چلا
گیا ہوگا۔ یہ حال سُنے گا تو اُس غریب کا دل ٹوٹ جائے گا۔
کلارک۔ اس کی پرورش کا کوئی اور بندوبست کر دوں؟
صوفیہ۔ اس زمین سے اُس کی پرورش نہیں ہوتی تھی۔ صرف محلہ کے
مویشی چرا کرتے تھے۔ وہ غریب ہے۔ بھکاری ہے پر لالچی نہیں مجھے

تو وہ کوئی ولی اللہ معلوم ہوتا ہے ۔
کلارک ۔ اندھے ذہین اور خدا ترس ہوتے ہیں ۔
صوفیہ ۔ مجھے اُس سے خاص عقیدت ہو گئی ہے ۔ یہ دیکھو پاپا نے کام شروع کر دیا ۔ اگر انہوں نے راجہ کی پیٹھ نہ ٹھونکی ہوتی تو اُنہیں تمہارے سامنے آنے کی کبھی جرات نہ ہوتی ۔
کلارک ۔ تمہارے پاپا نہایت چالاک ہوشیار ہیں ۔ ایسے لوگ دُنیا میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ کم از کم میں تو یہ دو رُخی چال نہ چل سکتا ۔
صوفیہ ۔ دیکھ لینا ۔ دو ہی چار برسوں کے اندر اس محلہ میں کارخانہ کے مزدوروں کے مکانات ہوں گے ۔ یہاں کا تو ایک آدمی بھی نہ رہنے پائے گا ۔
کلارک ۔ پہلے تو اِس اندھے نے بڑا شور و غل مچایا تھا ۔ دیکھیں اب کیا کرتا ہے ۔
صوفیہ ۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ خاموش کبھی نہ بیٹھے گا ۔ خواہ اس زمین کے ساتھ ہی اُس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے ۔
کلارک ۔ نہیں صوفیہ ایسا ہرگز نہ ہونے پائے گا ۔ جس روز یہ نوبت آئے گی ۔ سب سے پہلے سورداس کے لئے میری زبان سے "جے" کی آواز نکلے گی ۔ اور سب سے پہلے میرے ہاتھ اُس پر پھول برسائیں گے ۔
صوفیہ نے کلارک کو آج پہلی ہی بار عزت و محبت کی نظر سے دیکھا ۔

(۲۵)

سال بھر تک راجہ مہیندر کمار اور مسٹر کلارک میں متواتر جنگ ہوتی رہی ۔ کاغذ کا تختہ میدانِ کارزار تھا اور صف بستہ سورماؤں کی

بجائے سوراؤں سے کہیں زیادہ طاقت ور دلیلیں، منٹوں سیاہی بہہ گئی۔ کتنے ہی قلم کام آئے۔ دلیلیں کٹ کٹ کر راون کی فوج کی طرح پھر زندہ ہو جاتی تھیں۔ راجہ صاحب بار بار ہمت ہار جاتے۔ سرکار سے مقابلہ کرنا چیونٹی کا ہاتھی سے مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن مسٹر جان سیوک اور اُن سے بھی زیادہ اندو اُنہیں ڈھارس دیتی رہتی تھیں۔ شہر کے رئیسوں نے ہمت سے کم اور خود غرضانہ دانشمندی سے زیادہ کام لیا۔ اُس عرض داشت پر جسے ڈاکٹر گنگولی نے باشندگان شہر کی جانب سے گورنر کی خدمت میں بھیجنے کے لئے لکھا تھا۔ دستخط کرنے کے وقت زیادہ تر لوگ بیمار ہو گئے اور اس قدر زیادہ بیمار ہو گئے کہ ہاتھ میں قلم پکڑنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ کوئی تیرتھ جاترا کرنے چلا گیا۔ کوئی کسی نہایت ضروری کام سے کہیں باہر روانہ ہو گیا۔ جو گنے گنائے لوگ کوئی بہانہ نہ کر سکے وہ بھی دستخط کرنے کے بعد مسٹر کلارک سے معافی مانگ آئے۔ حضور نہ جانے اُس میں کیا کیا لکھا تھا ہمارے سامنے تو صرف سادہ کاغذ آیا تھا۔ ہم سے یہی کہا گیا کہ یہ پانی کا محصول گھٹانے کی درخواست ہے۔ اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ اُس سادہ کاغذ پر بعد کو حضور کی شکایت لکھی جائے گی تو ہم بھول کر بھی قلم نہ اُٹھاتے۔ ہاں جن بڑے لوگوں نے سگریٹ کمپنی کے حصے لئے تھے اُنہیں مجبور ہو کر دستخط کرنا ہی پڑے۔ اگرچہ دستخط کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی مگر ڈاکٹر گنگولی کو کونسل میں سرکار سے سوال کرنے کا ایک حیلہ مل گیا۔ اُنہوں نے بڑے حوصلہ اور استقلال کے ساتھ سوالوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ کونسل میں ڈاکٹر صاحب کا خاص احترام ہوتا تھا۔ کتنے

ہی ممبروں نے اُن کے سوالات کی تائید کی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر گنگولی کی ایک تجویز پر کثرت رائے کی وجہ سے سرکار کو ہار ماننی پڑی۔ اس تجویز سے لوگوں کو بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن جب اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو جگہ جگہ سرکار پر بے اعتقادی ظاہر کرنے کے لئے جلسے ہونے لگے رئیسوں اور زمینداروں کی تو خوف کے سبب زبان بند تھی لیکن درمیانی طبقہ کے لوگوں نے کھلے الفاظ اس زبردستی کی مخالفت کرنا شروع کی۔ کنور بھرت سنگھ اُن کے سرغنہ بنے اور وہ صاف صاف کہنے لگے کہ اب ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ ہماری نجات اپنے ہی ہاتھوں ہوگی۔ مہیندر کمار بھی در پردہ اس جماعت کا دل بڑھانے لگے۔ ڈاکٹر گنگولی کے بہت کچھ تشفی دینے پر بھی حکام پر سے اُن کا اعتبار اُٹھ گیا۔ مایوسی ضعف سے پیدا ہوتی ہے مگر وہ خود قوت کو پیدا کرتی ہے۔

رات کو نو بج گئے تھے ونے سنگھ کی گرفتاری و قید کی خبر پاکر کنور صاحب نے اپنے احباب کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر گنگولی۔ جان سیوک۔ پربھو سیوک۔ راجہ مہیندر کمار اور دیگر اصحاب آئے ہوئے تھے۔ اندو بھی راجہ صاحب کے ہمراہ آئی تھی اور اپنی والدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ کنور صاحب نے نایک رام کو بلا بھیجا تھا اور وہ کمرہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تمباکو مل رہا تھا۔

مہیندر کمار بولے "ریاستوں پر سرکار کا بڑا دباؤ ہے۔ وہ بالکل بے دست و پا ہیں اور سرکار کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور"۔

بھرت سنگھ نے کہا۔ "جس سے کسی کا فائدہ نہ ہوا اور جس کا وجود مضرت رسانی ہی پر مبنی ہو۔ اُس کا نام و نشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اُتنا ہی

اچھا غیر ملکی لوگوں کے ہاتھوں میں ظلم و تشدد کا آلہ بن کر زندہ رہنے کی بہ نسبت تو مر جانا ہی بہتر ہے ؛

ڈاکٹر گنگولی۔ وہاں کا حاکم نرگ کھود (خود) خراب ہے۔ ڈرتا ہے کہ ریاست میں اچھے اور نڈر تا کے کھیال (خیال) پھیلیں گے تو ہم رعایا کو کیسے لوٹے گا۔ راجہ لوگ مسند لگا کر بیٹھا رہتا ہے اور اس کا نوکر چاکر من مانا راج کرتا ہے ؛

جان سیبوک نے غیر جانبدارانہ طریقہ پر کہا۔ "سرکار کسی ریاست کو ظلم کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتی۔ ہاں چونکہ وہ کمزور ہیں اور اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتیں اس لئے ایسے کاموں کے کرنے پر ضرورت سے بھی زیادہ تیار ہو جاتی ہیں۔ جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ سرکار بہادر خوش ہو گی" ؛

بھرت سنگھ۔ ونے کتنا سلیم کتنا متواضع کتنا خلیق ہے۔ یہ آپ لوگوں سے مخفی نہیں۔ میں اسے باور ہی نہیں کر سکتا کہ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے ؛

پر بھو سیوک کنور صاحب کے منہ لگے ہوئے تھے۔ اب تک جان سیوک کے خوف سے نہ بولے تھے۔ پر اب نہ رہا گیا۔ بولے "کیوں۔ کیا پولیس سے چوروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ کیا سادھوؤں سے بدکاروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ اور پھر کیا گائے جیسی بے زبان و مفید مخلوق کا خون بہانے والے لوگ دنیا میں نہیں ہیں؟ ونے نے مظلوم کسانوں کی خدمت کرنی چاہی تھی۔ اسی خدمت کا انہیں یہ صلہ ملا ہے۔ رعایا کے صبر و برداشت کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے اور ہوتی بھی ہے۔ اس سے متجاوز ہو کر قانون

قانون ہی نہیں رہ جاتا۔ اُس وقت اُس قانون کی خلاف ورزی کرنا ہی ہر سمجھدار آدمی کا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر آج سرکار حکم دے کہ سب لوگ منہ میں کالکھ لگا کر نکلیں تو اس حکم کو نہ ماننا ہمارا فرض ہو جائے گا۔ اودے پور کے دربار کو کوئی کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کو ریاست سے نکل جانے پر مجبور کرے ۔

ڈاکٹر گنگولی۔ اودے پور کا دربار ایسا حکم دے سکتا ہے۔ اُس کا اختیار ہے ۔

پربھوسیوک۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا جس حکم کی بنیاد محض حیوانی طاقت پر ہو اُس کی تعمیل ضروری نہیں۔ اگر اودے پور میں کوئی ذمہ دار سرکار ہوتی اور وہ کثرت رائے سے ایسا حکم نافذ کرتی تو دوسری بات تھی۔ مگر جب کہ رعایا کی جانب سے اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ وہ خود ونے سنگھ کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے تو محض حکام کی جبر پسندی ہمیں اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مجبور نہیں کرسکتی۔ راجہ صاحب نے اِدھر اُدھر خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا کہ یہاں کوئی میرا دشمن تو نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ جان سیوک بھی تیوریاں بدلنے لگے ۔

ڈاکٹر گنگولی۔ ہم دربار سے لڑ تو نہیں سکتا ۔

پربھوسیوک۔ رعایا کو اپنے حقوق کی حفاظت پر آمادہ تو کرسکتے ہیں ۔

بھرت سنگھ۔ اس کا نتیجہ بغاوت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے اور بغاوت کو فرو کرنے کے لئے دربار گورنمنٹ سے مدد لے گا۔ مفت ہزاروں بیکسوں کا خون ہو جائے گا ۔

پربھو سیوک۔ جب تک ہم خون سے ڈرتے رہیں گے۔ ہمارے حقوق بھی ہمارے پاس آنے سے ڈرتے رہیں گے۔ اُن کی حفاظت بھی توخون ہی سے ہوگی۔ میدانِ سیاست میدانِ جنگ سے کم خطرناک نہیں ہے اس میں اُترکرخون سے ڈرنا محض بُزدلی ہے۔

جان سیوک سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ بولے "تم جیسے پُرجوش نوجوانوں کو ایسے پیچیدہ سیاسی معاملات پر کچھ کہنے سے پہلے اپنے الفاظ کو خوب تول لینا چاہئے۔ یہ موقع تدبّر اور دور اندیشی سے کام لینے کا ہے"۔

پربھو سیوک نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ تدبیر بزدلی کا مترادف ہے۔

ڈاکٹر گنگولی۔ میری رائے میں گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں ایک ڈیپوٹیشن جانا چاہئے۔

بھرت سنگھ۔ گورنمنٹ کہہ دے گی۔ ہمیں دربار کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔

مہیندر کمار۔ دربار ہی کو کیوں نہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے؟

جان سیوک۔ ہاں یہی میری بھی صلاح ہے۔ ریاست کے خلاف شورش کرنا ریاست کو کمزور بنا دیتا ہے اور رعایا کو سرکش۔ ریاست کا اقتدار ہر ایک حالت میں قایم رہنے دینا ضروری ہے ورنہ اُس کا انجام وہی ہوگا جو آج جمہوریت و مساوات کے عالمگیر نظارہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ دُنیا نے تین صدیوں تک جمہوریت کی آزمایش کی اور بالآخر اس سے نااُمید ہوگئی۔ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ اُس آگ کی لپٹ ابھی تک اِس ملک میں نہیں پہنچی اور ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم آیندہ

بھی اُس سے محفوظ رہیں۔

کنور بھرت سنگھ جمہوریت کے گونہ معتقد تھے۔ اپنے اصول کی تردید ہوتے دیکھ کر بولے "پھوس کا جھونپڑا بنا کر آپ آگ کی لپٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ بہت ممکن ہے کہ لپٹ کے باہر سے نہ آنے پر بھی گھر ہی کی ایک چنگاری اُڑ کر اس پر گر پڑے۔ آپ جھونپڑا رکھئے ہی کیوں؟ جمہوریت حکومت کا بلند ترین معیار نہ سہی مگر دنیا ابھی تک اُس سے بہتر طرز حکومت نہیں بتلا سکی۔ خیر جب یہ طے ہو گیا کہ ہم دربار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے تو بجز صبر اور کیا چارہ ہے۔ میں سیاسی معاملات سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اُس سے کوئی نفع نہیں۔ آزادی کی قیمت خون ہے۔ جب ہم میں اس کے دینے کی طاقت ہی نہیں تو ہم بیفائدہ کمر کیوں باندھیں۔ پینترے کیوں بدلیں۔ خم کیوں ٹھونکیں؟ سب سے الگ تھلگ رہنے میں بھلائی ہے"۔

پربھو سیوک۔ یہ تو بہت مشکل ہے کہ آنکھوں سے اپنا گھر لٹتے دیکھیں اور زبان نہ کھولیں۔

بھرت سنگھ۔ ہاں بہت مشکل ہے۔ مگر اپنے نفس پر قابو رکھنا ہوگا۔ اس کی یہی تدبیر ہے کہ ہم کلہاڑی کا دستہ نہ بنیں۔ دستہ کلہاڑی کی مدد نہ کرے تو کلہاڑی سخت اور تیز ہونے پر بھی ہمیں سخت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ ہمارے لئے بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم علم۔ ثروت یا دولت کے زعم میں حکومت کا دایاں ہاتھ بن کر رعایا کا گلا کاٹیں۔ اور اس بات پر فخر کریں کہ ہم بھی حاکم ہیں۔

جان سیوک۔ تعلیم یافتہ طبقہ ہمیشہ سے حکومت کے سہارے رہا ہے

اور رہے گا۔ حکومت سے منحرف ہوکر وہ اپنی ہستی کو نہیں مٹا سکتا ۔

بھرت سنگھ۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے تعلیمیافتہ طبقہ جب تک حکومت سے وابستہ رہے گا۔ ہم اپنے معیار کے قریب ذرا بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ اُس کو اپنے لئے تھوڑے بہت تھوڑے دنوں کے لئے کوئی دوسرا سہارا کھوجنا پڑے گا ۔

راجہ مہیندر کمار بغلیں جھانک رہے تھے کہ یہاں سے کھسک جانے کا کوئی موقع مل جائے۔ اس قضیہ کو تمام کرنے کے ارادہ سے بولے "تو آپ لوگوں نے کیا تجویز کیا۔ دربار کو وفد روانہ کیا جائے گا؟"

ڈاکٹر گنگولی۔ ہم کھود (خود) جاکر ونے کو چھوڑ لائے گا ۔

بھرت سنگھ۔ اگر قصاب ہی سے جان بخشی کی بھیک مانگنا ہے۔ تو پھر خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ کم از کم بات تو بنی رہے گی ۔

ڈاکٹر گنگولی۔ پھر وہی pessimism (دائمی یاس) کا بات۔ ہم ونے کو سمجھا کر اُسے یہاں آنے پر راضی کرے گا ۔

رانی جانہوی نے اِدھر آتے ہوئے اِس جملہ کے آخری الفاظ سُن لئے۔ تمکنت آمیز لہجہ میں بولیں "نہیں ڈاکٹر گنگولی۔ آپ ونے پر اتنی مہربانی نہ کیجئے۔ یہ اُس کی پہلی آزمائش ہے۔ اِس میں اُسے مدد دینا اُس کے مستقبل کو تباہ کرنا ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اُسے کسی سے دبنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اُس نے جان کے خوف سے اِس ناانصافی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو سب سے پہلے میں ہی اُس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا لگا دوں گی ۔"

رانی کے جوش بھرے الفاظ نے حاضرین کو متحیر کر دیا۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ کوئی دیوی آسمان سے یہ پیغام سُنانے کے لئے اُتر آئی ہے۔

ایک منٹ کے بعد کنور بھرت سنگھ نے رانی کے الفاظ کا مطلب بتلایا۔ میری رائے میں ابھی و نے سنگھ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئیے یہ اُس کی آزمایش ہے۔ انسان بڑے سے بڑا کام جو کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اپنے ضمیر کی آزادی کے لئے مر مِٹے۔ یہی انسانی زندگی کا اعلے ترین مقصد ہے۔ ایسے ہی امتحانوں میں کامیاب ہو کر ہمیں وہ درجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہم پر قوم اعتبار کر سکے۔

ڈاکٹر گنگولی۔ رانی ہمارا دیوی ہے۔ ہم اُن کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پر دیوی لوگوں کا بات دُنیا والوں کے بیوہار کرنے جوگ (قابل) نہیں ہو سکتا۔ ہم کو پورا امید ہے کہ ہمارا سرکار ضرور بولے گا۔

رانی۔ سرکار کی انصاف پسندی کی ایک مثال تو آپ کے سامنے ہی ہے اگر اب بھی آپ کو اُس پر اعتبار ہو تو میں یہی کہوں گی کہ آپ کو کچھ دنوں تک کوئی دوا استعمال کرنی پڑے گی۔

ڈاکٹر گنگولی۔ دو چار دن میں یہ بات معلوم ہو جائے گا۔ سرکار کو بھی تو اپنی نیک نامی بدنامی کا ڈر ہے۔

جھینپ رکمار بہت دیر کے بعد بولے "راہ دیکھتے دیکھتے تو آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہماری اُمید اتنی سخت جان نہیں ہے"۔

دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کنور صاحب نے پوچھا "کون صاحب ہیں؟"

ٹیلیفون سے "میں ہوں پران ناتھ۔ مسٹر کلارک کا تبادلہ ہو گیا"۔

کنور صاحب نے پوچھا "کہاں کو؟"

ٹیلی فون سے جواب ملا "پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں جا رہے ہیں۔ گریڈ کم کر دیا گیا ہے"۔

ڈاکٹر گنگولی۔ اب بولئے میرا بات سچ ہوا کہ نہیں۔ آپ لوگ کہتا تھا۔ گورنمنٹ کا نیت بگڑا ہوا ہے پر ہم کہتا تھا کہ اُس کو ہمارا بات ماننا پڑیگا۔

مہیندر کمار۔ ابھی پران ناتھ مسخرا ہے۔ آپ سے دل لگی کر رہا ہوگا۔

بھرت سنگھ۔ نہیں۔ اُس نے تو مجھ سے کبھی دل لگی نہیں کی۔

رانی۔ سرکار نے اتنی اخلاقی جُرأت سے شاید پہلی ہی بار کام لیا ہے۔

ڈاکٹر گنگولی۔ اب وہ زمانا (زمانہ) نہیں ہے جب گورنمنٹ پبلک اوپینین (رائے عامہ) کا انسلٹ (توہین) کر سکتا تھا۔ اب کونسل کا بات اُس کو ماننا پڑے گا۔

بھرت سنگھ۔ زمانہ تو وہی ہے اور گورنمنٹ کے طرز عمل میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ اِس میں ضرور کوئی نہ کوئی سیاسی راز ہے۔

جان سیوک۔ ایوانِ تجارت نے میری تجویز کو منظور کر کے گورنمنٹ کے چھکے چھڑا دیئے۔

مہیندر کمار۔ میرا ڈیپوٹیشن بڑے موقع سے پہنچا تھا۔

ڈاکٹر گنگولی۔ میں نے کونسل کو ایسا بالکل ہی ایک کر دیا تھا کہ ہم کو اتنا بڑا میجارٹی کبھی نہ ملا۔

اندو رانی کے پیچھے کھڑی تھی۔ بولی "عرضداشت پر میری ہی کوشش سے اتنے آدمیوں کے نام درج ہوئے تھے۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ اُسی کی کرامات ہے"۔

نایک رام اب تک چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ٹیلی فون کی بات اُن کی سمجھ میں آئی اب انہیں معلوم ہُوا کہ لوگ کامیابی کا سہرا اپنے اپنے سر باندھنے کی فکر میں ہیں۔ ایسے موقع پر بھلا وہ کب چوکنے والے تھے۔ بولے ــ سرکار یہاں بھی گا پھل بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ سول سارجنٹ کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ راجہ صاحب کی طرف سے پورا ایک ہجار (ہزار) لٹھیت جوان تیار بیٹھا ہُوا ہے۔ اُن کا حکم بحال نہ ہوا تو کھون کھرابا (خون خرابہ) ہو جائے گا۔ سہر میں طلو پھان آ جائے گا۔ اُنہوں نے لاٹ صاحب سے یہ بات جرور ہی کہی ہوگی "۔

جھینٹ پر کمار۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ یہ تمہاری دھمکیوں ہی برکت ہے۔

نایک رام۔ دھرما اوتار دھمکیاں کیسی۔ کھون کی ندی بہہ جاتی۔ آپ کا ایسا اکبال ہے کہ چاہوں تو ایک بار سہر لٹوا دوں۔ یہ لال صاحب رکھے رہ جائیں۔

پربھو سیوک نے تمسخر سے کہا "سچ پوچھئے تو یہ اُس نظم کا نتیجہ ہے۔ جو میں نے ہندوستان ریویو میں چھپائی تھی "۔

رانی۔ پربھو۔ تم نے یہ چپت اچھی لگائی۔ ڈاکٹر گنگولی اپنا سر سہلا رہے ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر پڑی یا نہیں؟ ایک ایسی حقیر کامیابی پر آپ لوگ جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ اسے فتح نہ سمجھئے۔ یہ دراصل شکست ہے جو آپ کو منزلِ مقصود سے کوسوں دور ہٹا دیتی ہے۔ آپ کے گلے میں پھندے کو اور بھی مضبوط کر دیتی ہے۔ باجے والے سردی میں باجے کو آگ پر سینکتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ اُس میں سے اچھی آواز نکلے۔ آپ

لوگ بھی سینکے جا رہے ہیں۔ اب ضرورتوں کے لئے بیٹھ مضبوط کر لیجئے ؛
یہ کہتی ہوئی رانی جانہوی اندر چلی گئیں۔ مگر اُن کے جاتے ہی اُن کی تنبیہ کا اثر بھی جاتا رہا۔ لوگ پھر وہی راگ الاپنے لگے ؛
مہیندر کمار۔ کلارک صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی سے پالا پڑا تھا ؛
ڈاکٹر گنگولی۔ اب اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ لوگ کتنا انصاف کرتا ہے ؛
جان سیوک۔ اب ذرا اُس اندھے کی بھی خبر لینی چاہئے ؛
نایک رام۔ صاحب۔ اُسے ہار جیت کا کوئی کھیال نہیں ہے۔ اُس جمین کی دس گنی بھی مل جائے تو بھی وہ اسی طرح رہے گا ؛
جان سیوک۔ میں کل ہی سے مل میں کام لگا دوں گا۔ ذرا مسٹر کلارک کو بھی دیکھ لوں ؛
مہیندر کمار۔ میں تو ایڈریس نہ دوں گا۔ اُن کی طرف سے کوشش تو ہو گی مگر بورڈ کی میجارٹی میرا ساتھ دے گی ؛
ڈاکٹر گنگولی۔ ایسا حاکم لوگ کو ایڈریس دینے کا کام نہیں ہے ؛
مہیندر کمار کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے کہ اندو کو بھی یہ خوش خبری سناؤں۔ یوں تو وہ نہایت متین آدمی تھے مگر اس فتح نے ایک طفلانہ جوشِ مسرت پیدا کر دیا تھا۔ نشہ کا سا عالم تھا۔ رانی کے چلے جانے کے ذرا دیر بعد وہ خوش خوش ہنستے ہوئے نادانستہ طور پر اکڑتے ہوئے غرور سے سر اُٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اندو رانی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑی ہو کر بولی "آخر صاحب بہادر کو بوریا بندھنا سنبھالنا پڑا نہ؟"

مہیندر کمار سنگھ رانی صاحبہ کے سامنے اپنی کم ظرفانہ مسرت کا اظہار نہ کر سکے۔ بولے "ہاں۔ اب تو ملنا ہی پڑے گا"؛

اندو۔ اب کل ہی ان لیڈی صاحبہ کی ذرا مزاج پرسی کروں گی جو زمین پر قدم نہ رکھتی تھیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتی نہ تھیں۔ بلا کر دعوت کروں؟

مہیندر کمار۔ کبھی نہ آئے گی۔ اور ضرورت ہی کیا ہے؟

اندو۔ ضرورت کیوں نہیں ہے جھینپے گی تو بہر تو نیچا ہو جائے گا۔ نہ آئے گی نہ سہی۔ اماں آپ نے تو دیکھا ہے۔ صوفیہ پہلے کتنی غریب اور ملنسار تھی لیکن کلارک سے شادی کی بات چیت ہوتے ہی دماغ عرشِ معلے پر چڑھ گیا۔

رانی نے متانت سے کہا "بیٹی یہ تمہارا وہم ہے۔ صوفیہ مسٹر کلارک سے کبھی شادی نہ کرے گی۔ اگر میں انسان کو کچھ پہچان سکتی ہوں تو دیکھ لینا۔ میری بات صحیح ہوتی ہے یا نہیں"۔

اندو۔ اماں۔ کلارک سے اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ ممکن ہے در پردہ شادی بھی ہو گئی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو۔ دونوں کیسے گھلے ملے رہتے ہیں؟

رانی۔ کتنے ہی گھلے ملے رہیں۔ مگر اُن کی شادی نہ ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ میں اپنی تنگ نظری کے سبب صوفیہ کو کتنی ہی سبک سمجھوں۔ مگر واقعی وہ ایک وفا شعار عورت ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں اُسے خفیف کر کے تم پچھتاؤ گی۔

اندو۔ اگر وہ اتنی نیک ہے تو وہ آپ کے بلانے پر ضرور ہی آئے گی۔

رانی۔ ہاں مجھے یقین کامل ہے۔

اندو۔ تو بلا لیجئے۔ مجھے دعوت کا انتظام کیوں کرنا پڑے ۔
رانی۔ تم یہاں بلا کر اسے خفیف کرنا چاہتی ہو۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں کہ اگر وہ عیسائن نہ ہوتی تو آج کے پانچویں برس میں اس ونے کی شادی کر لی اور اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی ۔
اندو کو یہ باتیں پسند نہ آئیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ ذرا دیر میں جھبنا رکمار بھی وہاں پہنچ گئے اور دونوں بڑھ بڑھ کر باتیں کہنے لگے۔ کوئی لڑکا کھیل میں جیت کر بھی اتنا بدمست نہ ہوتا ہوگا ۔
ادھر دیوان خانہ میں بھی مجلس برخاست ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ جب تخلیہ ہوگیا تو کنور صاحب نے نایک رام کو بلا کر کہا۔ "پنڈا جی۔ میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ کروگے"؟
نایک رام۔ سرکار حکم ہو تو سر دینے کو حاضر ہیں۔ ایسی کوئی بات ہے بھلا!
کنور۔ دیکھو۔ دنیاداری نہ کرو۔ میں جو کام لینا چاہتا ہوں وہ سہل نہیں ہے۔ زیادہ وقت۔ زیادہ عقل زیادہ طاقت خرچ کرنی پڑے گی۔ جان کا بھی خطرہ ہے۔ اگر دل اتنا مضبوط ہو تو ہاں کرو ورنہ صاف صاف جواب دے دو۔ میں کوئی چاتری نہیں ہوں جس پر تمہیں اپنی دھاک بٹھانا ضروری ہو۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم مجھے جانتے ہو۔ اس لئے صاف گفتگو ہونی چاہئے ۔
نایک رام۔ سرکار۔ آپ سے دنیاداری کرکے بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ آپ کا نمک تو روئیں روئیں میں پیوست ہو رہا ہے۔ اگر میرے بس کی بات ہوگی تو پوری کروں گا چاہے جان ہی کیوں نہ جائے۔ آپ کے

حکم کی دیر ہے ۔

کنور۔ ونے کو چھڑا کر لا سکتے ہو؟

نایک رام۔ سرکار اگر جان دے کر بھی لا سکوں گا تو کوتاہی نہ کروں گا ۔

کنور۔ تم جانتے ہو۔ میں نے تم سے یہ سوال کیوں کیا ہے؟ میرے یہاں سینکڑوں آدمی ہیں۔ خود ڈاکٹر گنگولی جانے کو تیار ہیں۔ مہیند۔ کو بھیجوں تو وہ بھی چلے جائیں گے۔ لیکن ان لوگوں کے سامنے میں اپنی بات نہیں بگاڑنا چاہتا۔ سر پر یہ الزام نہیں لینا چاہتا کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ دھرم سنکٹ میں پڑا ہوا ہوں پر بیٹے کی محبت نہیں مانتی۔ ہوں تو انسان ہی۔ کاٹھ کا کلیجہ تو نہیں ہے۔ کیسے صبر کروں؟ اسے بڑے بڑے ارمانوں سے پالا ہے وہی ایک زندگی کا سہارا ہے۔ تم اُسے کسی طرح اپنے ساتھ لاؤ۔ اودے پور کے عملے دیوتا نہیں ہیں۔ انہیں لالچ دے کر جیل میں جا سکتے ہو۔ ونے سے مل سکتے ہو اور عملوں کی مدد سے انہیں باہر بھی لا سکتے ہو۔ اتنا کرنا تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے ونے کو آنے پر راضی کرنا۔ اُسے تمہاری عقل و ہوشیاری پر چھوڑتا ہوں۔ اگر تم میری دردناک حالت سے انہیں بخوبی واقف کر سکو گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ چلے آئیں گے۔ بولو۔ کر سکتے ہو یہ کام؟ اس کا مختانہ ایک بڈھے باپ کی دعا کے علاوہ اور جو کچھ تم چاہو گے وہ پیش کیا جائے گا ۔

نایک رام۔ مہاراج کل چلا جاؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو اُن کو ساتھ لاؤں گا نہیں تو منہ نہ دکھاؤں گا ۔

کنور۔ نہیں۔ پنڈا جی۔ جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کتنا پریشان ہوں تو وہ چلے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کی جان کو اپنے اصول پر قربان نہ

کرینگے۔ اُن کیلئے میں نے اپنی زندگی کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ یہ فقیروں کا بھیس لیا
ہے۔ کیا وہ میرے لئے اتنا بھی نہ کرینگے۔ پنڈاجی سوچو! جس آدمی نے ہمیشہ مخملی
بستروں پر آرام کیا ہو اُسے اس کاٹھ کے تخت پر آرام مل سکتا ہے؟ ونے کی
محبت ہی وہ جادو ہے جسکے بس میں ہوکر میں یہ کٹھن تپسیا کر رہا ہوں۔ جب
ونے نے تیاگ (ترک) کا برت لے لیا (عہد کر لیا) تو پھر میں کس منہ سے اس
بڑھاپے کی عمر میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا۔ یہ سب کانٹے رانی
جانھوی کے بوئے ہوئے ہیں۔ اُس کے آگے میری کچھ نہیں چلتی۔ میرا سُرگ
(بہشت) اُسی کے کارن نرک (دوزخ) بن رہا ہے۔ اُسی کے کارن میرا پیارا
ونے میرے ہی ہاتھوں سے نکالا جاتا ہے۔ ایسا ہونہار بیٹا کھو کر یہ دُنیا میرے
لئے نرگ ہو جائیگی۔ تم کل جاؤگے؟ منیم سے جتنے روپے چاہو لے لو۔
نایک رام۔ آپکے اکبال سے کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ آپکی دیا چاہئے آپ
نے اتنے پرتاپی (اقبالمند) ہوکر جو تیاگ کیا ہے وہ کوئی دوسرا کرتا تو آنکھیں
نکل پڑتیں۔ سب کچھ چھوڑ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہاں تو گھر میں
بھونی بھانگ نہیں۔ جاتریوں کی سیوا ٹہل نہ کریں تو بھوجن کا ٹھکانا بھی نہ ہو
پر بُوٹی (بھنگ) کی ایسی چاٹ پڑگئی ہے کہ ایک دن نہ ملے تو دیوانہ ہو جاتا
ہوں۔ کوئی آپ کی طرح کیا کھا کے تیاگ کرے گا۔
کنور۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ تم گئے تو ونے کو لے کر ہی لوٹو گے۔ اب
یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیا دچھنا (رخصتانہ) دوں؟ تمہاری سب سے بڑی
خواہش کیا ہے؟
نایک رام۔ سرکار کی دیا بنی رہے۔ میرے لئے یہ کچھ کم نہیں ہے۔
کنور۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرا کام نہیں کرنا چاہتے۔

نایک رام۔ سرکار ایسی بات نہ کہیں آپ مجھے پالتے ہیں۔ آپکا حکم نہ مانوں گا تو بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور پھر آپکا کام کیسا۔ یہ تو اپنا ہی کام ہے ٭

کنور۔ نہیں بھئی۔ میں تمہیں مفت میں اتنی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یہ سب سے بڑا سلوک ہے جو تم میرے ساتھ کر رہے ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا ہوں جسے تم سب سے بڑا سمجھتے ہو۔ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟

نایک رام نے سر جھکا کر کہا۔ "دھرماتا ادتار۔ ابھی تو بیاہ ہی نہیں ہوا" ٭

کنور۔ ارے یہ کیا بات ہے؟ آدھی عمر گزر گئی اور ابھی چھڑے بیٹھے ہو!

نایک رام۔ سرکار تقدیر! تقدیر کے سوا اور کیا کہوں ٭

ان الفاظ میں اتنی رقت انگیز مایوسی بھری ہوئی تھی کہ کنور صاحب پر نایک رام کی دیرینہ اور دلی خواہش روشن ہو گئی۔ بولے "تو تم گھر میں اکیلے ہی رہتے ہو؟"

نایک رام۔ ہاں دھرماادتار۔ بھوت کی طرح اکیلا ہی پڑا رہتا ہوں آپکے اقبال سے دوسرے درجے کا گھر ہے ہاگ بغیچے ہیں۔ گائیں بھینسیں ہیں پر رہنے والا کوئی نہیں۔ بھوگنے والا کوئی نہیں۔ ہماری برادری میں اُنہیں کا بیاہ ہوتا ہے جو بڑے بھاگوان ہوتے ہیں ٭

کنور۔ (مسکرا کر) تو تمہارا بیاہ کہیں ٹھہرا دوں؟

نایک رام۔ سرکار۔ ایسی تقدیر کہاں؟

کنور۔ تقدیر میں بنا دوں گا مگر یہ قید تو نہیں ہے کہ کنیا بہت اونچے کُل (خاندان) کی ہو؟

نایک رام۔ سرکار۔ کنیاؤں کے لئے اونچا نیچا کُل نہیں دیکھا جاتا۔ کنیا اور گنگو تو پاک ہیں۔ براہمن کے گھر میں آکر اور بھی پاک ہو جاتے ہیں۔ پھر جس نے دان لیا اُس نے دنیا بھر کا پاپ ہضم کیا تو پھر عورت کی کیا

بات ہے جس کا بیاہ نہیں ہوا۔ سرکار۔ اُس کی جنم گانی دو کوڑی کی ہے ÷

کنور۔ اچھی بات ہے۔ ایشور نے چاہا تو لوٹتے ہی دولھا بنو گے۔ تم نے پہلے کبھی اُس کی چرچا ہی نہیں کی ÷

نایک رام۔ سرکار۔ یہ بات آپ سے کیا کہتا۔ اپنے میل جول والوں کے سوا اور کسی سے نہیں کہی۔ کہتے لاج آتی ہے۔ جو سُنے گا وہ سمجھے گا کہ اس میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہے۔ کئی بار لباریوں کی باتوں میں آکر سینکڑوں روپے گنوائے۔ اب کسی سے نہیں کہتا۔ بھگوان کے آسرے بیٹھا ہوں ÷

کنور۔ تو کس گاڑی سے جاؤ گے؟

نایک رام۔ ہجور۔ ڈاک گاڑی سے چلا جاؤں گا ÷

کنور۔ ایشور کرے جلد لوٹو۔ میری آنکھیں تمھاری طرف لگی رہیں گی۔ یہ لو خرچ کے لئے لیتے جاؤ ÷

یہ کہتے ہوئے کنور صاحب نے اپنے محاسب کو بلا کر اُس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے نایک رام کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اپنی گدی پر بیٹھ کر بولا۔ بولو۔ کتنا ہمارا اور کتنا تمھارا؟

نایک رام۔ کیا یہ بھی کوئی پوچھنا ہے؟

محاسب۔ رقم تو تمھارے ہاتھ آتی ہے ÷

نایک رام۔ میرے ہاتھ نہیں آرہی ہے۔ ونے سنگھ کے پاس بھیجی جارہی ہے۔ کبھی مصیبت میں بھی مالک سے نمک حرامی کرتے ہو۔ اُن پر تو مصیبت پڑی ہے اور تمھیں اپنا گھر بھرنے کی دُھن ہے۔ تم جیسے لالچیوں کو تو ایسی جگہ مارے جہاں پانی نہ ملے ÷

محاسب نے شرمندہ ہو کر نوٹوں کا ایک پلندہ نایک رام کو دیدیا۔ نایک رام نے نوٹوں کو گن کر کمر میں باندھا اور محاسب سے کہا۔ میری کچھ دچھنا دلاتے ہو؟

محاسب۔ کیسی پوچھنا؟
نایک رام۔ نکد روپیوں کی۔ نوکری پیاری ہے کہ نہیں؟ جانتے ہو ناکہ یہاں سے نکال دیئے جاؤ گے تو کہیں بھیک بھی نہ ملے گی۔ اگر بھلا چاہتے ہو تو پچاس روپیوں کی گڈی بائیں ہاتھ سے ادھر بڑھا دو۔ نہیں تو جا کر کنور صاحب سے سب جڑے دیتا ہوں۔ کھڑے کھڑے نکال دیئے جاؤ گے۔ جانتے ہو کہ نہیں۔ رانی جی کو؟ نکالے بھی جاؤ گے اور گردن بھی ناپی جائیگی۔ ایسی بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ چندیا گنجی ہو جائے گی ☙
محاسب۔ گرو۔ اب یاروں ہی سے یہ کید۔ کبھی اتنے روپے مل گئے۔ کون کنور دنے سنگھ رسید لکھے دیتے ہیں ☙
نایک رام۔ روپے لاتے ہو کہ نہیں۔ بولو جھٹ پٹ؟
محاسب۔ گرو۔ تم تو.......
نایک رام۔ روپے لاتے ہو کہ نہیں؟ یہاں باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جھٹ پٹ سوچو۔ میں چلا۔ یاد رکھو۔ کہیں بھیک بھی نہ ملے گی ☙
محاسب۔ تو یہاں میرے پاس روپے کہاں ہیں؟ یہ تو سرکاری رقم ہے ☙
نایک رام۔ اچھا تو عندالطلب (رقعہ) لکھ دو ☙
محاسب۔ گرو۔ ذرا ادھر دیکھو۔ غریب آدمی ہوں ☙
نایک رام۔ تم گریب ہو بچا۔ حرام کی کوڑی کھا کر موٹے پڑ گئے ہو۔ اس پر گریب بنتے ہو۔ لکھو جھٹ پٹ۔ کنور صاحب ذرا بھی مروت نہ کریں گے۔ یونہی مجھے اتنے روپے دلا دیتے ہیں۔ بس میرے کہنے بھر کی دیر ہے۔ گبن کا مکدما چل جائے گا۔ بیٹا سمجھے؟ لاؤ باپ کی پوجا کرو۔ تم جیسے گھاگ روج تھوڑے ہی پھنستے ہیں ☙

مہاسبھا نے نایک رام کے تیوریوں سے بھانپ لیا کہ اب یہ دچھنا لئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ پچیکے سے پچیس روپے نکال کر اُن کے ہاتھ دے دیئے اور بولے "پنڈت۔ اب دیا کرو۔ زیادہ نہ ستاؤ"۔

نایک رام نے روپے مٹھی میں کئے اور بولے "لو بچہ۔ اب کسی کو نہ ستانا۔ میں تمہاری ٹوہ میں رہوں گا"۔

نایک رام چلے گئے تو مہاسبھا نے دل میں کہا "لے جاؤ۔ سمجھ لیں گے کہ خیرات کیا"۔

کنور بھرت سنگھ اُس وقت دیوان خانہ کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ آج ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں میں لطف نہ تھا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے طنز یہ نگاہوں کی طرح دل میں کھٹکتے تھے۔ سامنے درختوں کے کنج میں سے ونے سنگھ کی خیالی صورت۔ تاریک و دردناک آواز کی طرح لرزاں اور دھوئیں کی طرح پریشان۔ یوں نکلتی ہوئی معلوم ہوئی جیسے کسی دُکھ بھرے دل سے آہ کی صدا نکلتی ہے۔ کنور صاحب کئی منٹ تک کھڑے روتے رہے۔ ونے کے لئے اِن کے دل سے اس طرح دعائیں نکل رہی تھیں۔ جیسے علی الصباح گوشہ افق سے طلوع ہوتے ہوتے آفتاب کی ہلکی ٹھنڈی اور خوشگوار کرنیں نکلتی ہیں۔